اُردو زبان۔ نئے اُفق

(اُردو زبان۔ مسائل اور امکانات: روئیداد عالمی اُردو کانفرنس، جدہ سعودی عرب)

زیر اہتمام

مرکز برائے اُردو زبان، ادب و ثقافت

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

گچی باؤلی، حیدرآباد

مدیر

ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد

ڈپٹی ڈائرکٹر وانچارج، مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت

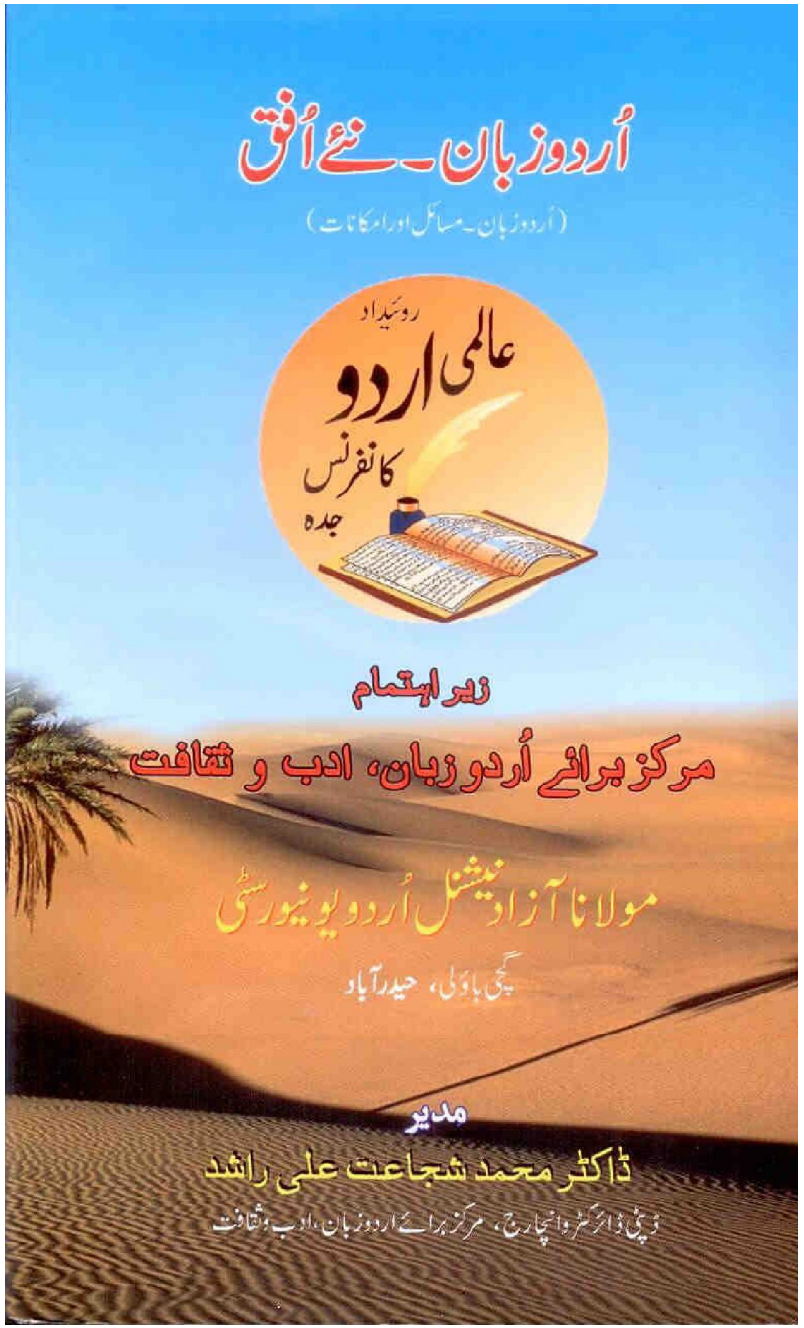

ⓒ *Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad*

Publication Series - 5

Book: URDU ZUBAN - NAYE UFAQ

(Urdu Language - Problem and Prospective: Based on proceedings of World Urdu Conference, Jeddah)

Publication Date: Janauary 2009

Quantity: 500 (Five Hundred)

Publisher: Registrar, Maulana Azad National Urdu Universtity, Gachibowli, Hyderabad-500032

Editor : Dr. Mohd. Shujath Ali Rashed

Dy. Director & I/c

Centre For Urdu Language, Literature & Culture

Assisted by: Md.Wasim Raja & Mohd.Habeebuddin

Printing: Silverline Printers, Hyderabad

Address: Centre for Urdu Language , Literature & Culture

Maulana Azad National Urdu University

Gachi Bowli, Hyderabad - 500 032 A.P, India

Phone Nos. : 040-23008359, 23008360

Fax No.: 040-23008383

Ⓒ جملہ حقوق بحق مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد محفوظ

سلسلہ اشاعت۔ ۵

کتاب : اُردو زبان۔ نئے اُفق

(اُردو زبان۔ مسائل اور امکانات: روئیداد عالمی اُردو کانفرنس، جدہ)

اشاعت : جنوری 2009

تعداد : پانچ سو (500)

ناشر : رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد

500 032

مدیر : ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، ڈپٹی ڈائرکٹر وانچارج

مرکز برائے اُردو زبان، ادب و ثقافت

معاونین : محمد وسیم راجہ و محمد حبیب الدین

طباعت : سلور لائن پرنٹرس، حیدرآباد

پتہ : مرکز برائے اُردو زبان، ادب و ثقافت

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد 032 500

فون نمبرس۔ 040-23008359, 23008360

فیکس نمبر۔ 040-23008383

ترتیب

پیامات

اے۔ایم۔پٹھان II

اوصاف سعید III

گوپی چند نارنگ IV

چندر بھان خیال V

کے۔آر۔اقبال احمد VI

نقطۂ نظر

محمد بیگ احساس VIII

اشرف رفیع X

حرف آغاز۔

محمد شجاعت علی راشد XII

مضامین

۱۔زبان شناخت اور سماجی طاقت کا وسیلہ — علی رضا موسوی 2

۲۔اُردو زبان کی موثر تدریس اسکولی سطح پر مسائل اور عملی تجاویز — نجم السحر 28

۳۔اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم کا منظر نامہ — ایس۔اے۔وہاب قیصر 46

۴۔دینی جامعات، تعلیم نسواں اور فروغ اردو — ریحانہ سلطانہ 62

۵۔اردو رسم الخط ''دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی'' — سید تقی عابدی 73

۶۔اُردو کے فروغ واشاعت میں میڈیا کا رول — معصوم مرادآبادی 90

۷۔مشینی ترجمہ، ذخیرہ اردو میں بیش بہا اور سریع اضافے کا ضامن — محمد ظفر الدین 96

۸۔اردو زبان: مسائل اور حل — امام اعظم 133

۹۔اردو زبان کا فروغ اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی — نکہت جہاں 144

۱۰۔عہد حاضر کا ترقیاتی منظر نامہ اور اردو زبان (مسائل وتجاویز) — محمد احسن 155

۱۱۔ تکنیک کے جدید دور میں اردو کا مستقبل — حسام الاسلام صدیقی 170

۱۲۔معاشرے میں اردو زبان کے رول کا جائزہ اور تجاویز — سید جمال اللہ قادری 177

۱۳۔مشرق وسطی میں اسکولوں میں اردو تعلیم — حسن عبدالکریم چوگلے 185

۱۴۔اردو زبان: موجودہ صورت حال، مسائل اور ان کا حل — ظفر علی نقوی 192

۱۵۔اردو زبان کے عصری تقاضے، مسائل اور حل — ایس۔ایم۔رحمت اللہ 201

۱۶۔اردو طریقہ تعلیم کو بہتر اور جدید بنانے کے لیے تجاویز — سمیرہ عزیز 214

۱۷۔ہندوستان اور بیرون ہند میں اردو کے فروغ میں میڈیا کا کردار — مہتاب قدر 221

۱۸۔اردو کے مسائل اور امکانات — نعیم جاوید 228

۱۹۔ریاض کے ہندوستانی اسکولوں میں اردو کی تعلیم — عذرا نقوی 234

۲۰۔میڈل ایسٹ کے اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے امکانات — قمر سلطانہ 241

۲۱۔اردو زبان کی عصری صورت حال — وسیم احمد صدیقی 248

۲۲۔اردو کی ترقی میں صحافت کا حصہ — سراج وہاب 256

۲۳۔اردو ذریعہ تعلیم چند تجاویز۔ — علیم خاں فلکی 259

۲۴۔اردو شاعری میں عصری حسیت — قاضی ضیاء اللہ 263

۲۵۔اردو۔اکیسویں صدی کی آواز — محمد شجاعت علی راشد 288

رپورتاژ

عالمی اردو کانفرنس جدہ ۲۰۰۸ء — سید تقی عابدی 303

جدہ میں منعقدہ مشرق وسطی کی پہلی ۲ روزہ عالمی کانفرنس — سید جمال اللہ قادری 320

پروفیسر اے۔ ایم۔ پٹھان

شیخ الجامعہ، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

ڈاکٹر اوصاف سعید

قونصل جنرل ہند، جدہ سعودی عرب

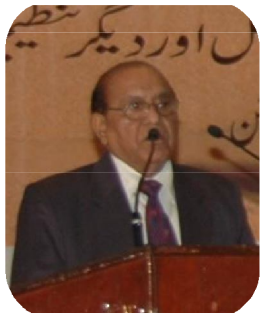

پروفیسر گوپی چند نارنگ

سابق صدر نشین مرکزی ساہتیہ اکیڈیمی، نئی دہلی

جناب چندر بھان خیال

نائب صدر نشین قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی

پروفیسر کے۔ آر۔ اقبال احمد

نائب شیخ الجامعہ، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

پیام

پروفیسر اے۔ایم۔پٹھان

شیخ الجامعہ، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ دنیا کی کسی بھی زبان کا اُس ملک وقوم اور تہذیب وتمدن سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اردو بھی ایک ایسی ہی مقبول عام زبان ہے جس نے ملک کی یکجہتی اور فرقہ ورانہ ہم آہنگی کو قائم رکھنے میں انتہائی مثبت کردار ادا کیا ہے۔ چوں کہ اس کا خمیر محبت و یگانگت کے جذبے سے اُٹھا ہے اسی لیے کبیر کے دوہوں اور امیر خسرو کی شاعری بھی اس کی روشنی سے جگمگاتی ہے یہ خیال اور جذبے کی زبان ہے جس نے قوموں اور تہذیبوں کے درمیان پُل کا کام کیا ہے۔ آزادی سے قبل ہندوستان میں اردو ہی سب سے زیادہ جاندار زبان تھی اور دوسری زبانوں کے مقابلے میں انتہائی مقبول بھی، اکیسویں صدی میں اردو کو انفارمیشن ٹکنالوجی سے مربوط کیا گیا تو یہ عصری تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہوگئی۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی زبان کے وجود و بقاء کا انحصار اس کے بولنے والوں کے ارادے، عمل۔ان کے نفسیاتی اور جذباتی رویہ پر بھی منحصر ہوتا ہے اگر کسی زبان کے بولنے والے اپنی زبان کے ساتھ مسلسل بے اعتنائی برتتے جائیں تو رفتہ رفتہ اُن کی زبان سے علمی جوہر اُٹھتے جاتے ہیں اور وہ علم وادب کی زبان کہ بجائے ایک تفریحی زبان اور بولی بن کر رہ جاتی ہے۔

عالمی سطح پر اردو زبان کے موقف کا جائزہ لینے اور اس کی ترقی وترویج میں حائل رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے اسے ایک نئی جہت عطا کرنے کے مقصد سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے ہندوستانی قونصل خانہ (جدہ سعودی عرب) کے تعاون و اشتراک کے ساتھ سرزمین حجاز پر پہلی اردو یونیورسٹی کے زیر اہتمام دوسری عالمی اردو کانفرنس کا ۶ اور ۷ جون ۲۰۰۸ء کو انٹرنیشنل اسکول جدہ میں انعقاد عمل میں لایا گیا تھا۔ اردو زبان مسائل اور امکانات کے موضوع پر منعقدہ اس دوروزہ عالمی اردو کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں پیش کردہ مقالات اردو کی نئی بستیوں بالخصوص ہندوستان میں اردو کے عصری مسائل اور اُن کے حل کے سلسلے میں انتہائی مثبت تجاویز پر مشتمل تھے لہذا یونیورسٹی نے انھیں ایک دستاویزی شکل دینے کے لیے اس کتاب کی اشاعت کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ سرزمین حجاز پر منعقدہ اس مقصدی کانفرنس کی روئیداد پروگرام کے مطابق آپ تک پہنچائی جارہی ہے تاکہ اردو زبان وادب کی ترقی کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کے امید افزاء نتائج برآمد ہوسکیں۔ میں اس کتاب کی اشاعت کے لیے یونیورسٹی کے مرکز برائے اردو زبان، ادب وثقافت اور اس کے مدیر ڈاکٹر شجاعت علی راشد کے علاوہ ان تمام اراکین کو مبارکباد دیتا ہوں جنہوں نے اس کی ترتیب وتزئین میں حصہ لیا۔

اے ایم پٹھان

(پروفیسر اے۔ایم۔پٹھان)

پیام

ڈاکٹر اوصاف سعید

قونصل جنرل ہند

جدہ، سعودی عرب

خلیج کے مختلف ممالک میں تقریباً ۱۳ سال تک سفارت کار کی حیثیت سے خدمات کی انجام دہی کے دوران میں اپنی مادری زبان اُردو کو جو ورثہ میں اپنی ماں کے علاوہ اُردو کے عظیم ادیب عوض سعید کی آغوش میں پرورش پاتے ہوئے ملی کیسے بھول سکتا تھا۔ ایک عرصے سے میری خواہش تھی کہ خلیجی ممالک میں اُردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر یہاں اُردو کی عظیم الشان کانفرنس کا انعقاد عمل میں آئے چناں چہ میری اس خواہش کو عملی جامعہ پہنانے میں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے جو رول ادا کیا اس کے لیے میں صمیم قلب سے متشکر ہوں۔

روئے زمین پر وسیع النظر، امن پسند اور باہمی رواداری کی علمبردار اگر کوئی زبان ہے تو یہ بلا شک وشبہ اُردو ہے جو زندگی کے ہر موڑ اور راستے پر پیار و محبت اور ہمدردی و درگزر کی تعلیم دیتی ہے۔ اُردو کا دامن جذباتی ہم آہنگی اور سیکولر روایات سے بھرا پڑا ہے اور قومی وملّی اور وطنی جذبات تہذیب وتربیت میں اس کا بڑا حصہ ہے جس کو نظر انداز کرنا حقائق سے چشم پوشی ہوگی۔ اس پس منظر میں اُردو کے مسائل۔ ان کے حل اور امکانات کا جائزہ لینے کے لیے جدہ میں منعقدہ عالمی اُردو کانفرنس، مجھے یقین ہے کہ اُردو کی تاریخ میں ایک سنگ میل ثابت ہوگی۔ دنیا کی ترقی یافتہ اور مہذب قوموں کی زبانوں میں اُردو کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ ہمارے اپنے ملک کے کئی علاقوں کے علاوہ اُردو اب بیرون ملک خلیجی و یورپی ممالک، امریکہ، روس، چین، جاپان اور آسٹریلیا میں بھی اپنے قدم جما رہی ہے۔ القصّہ مختصر داغ دہلوی کے برسوں قبل لکھے گئے اس شعر کی تعبیر واضح نظر آرہی ہے کہ

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

مشرق وسطیٰ کی اس پہلی عظیم الشان عالمی اُردو کانفرنس کے ذریعہ جہاں اُردو کے مسائل اور ان کے حل پر روشنی ڈالی گئی وہیں ایسے اصول وضوابط بھی منضبط کرنے کی تجویز رکھی گئی جس سے اُردو زبان کی ترویج اور اس کی تعلیم کا مسئلہ آسان سے آسان اور دلچسپ سے دلچسپ تر ہو جائے۔ اس سلسلہ میں ماہر لسانیات محترم گوپی چند نارنگ کی رہنمائی یقیناً سودمند ثابت ہوگی۔

عالمی اُردو کانفرنس کے اہم امور ونکات پر مشتمل کتاب کی اشاعت پر میں دل کی گہرائیوں سے مبارکباد بھی پیش کرتا ہوں اور اس کی توصیف کرتے ہوئے اس کی اہمیت کی طرف اردو داں حضرات کی توجہ بھی مبذول کرانا چاہتا ہوں تاکہ ہر محبِّ اُردو اسے پڑھ کر زبانِ اُردو کی ترقی وترویج میں اپنا رول ادا کرے۔

اخیر میں پروفیسر اے ایم پٹھان صاحب اور مولانا آزاد اُردو یونیورسٹی کے سارے عملے کو اس کتاب کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے انتہائی کم وقت میں اس عظیم کام کو بحسن وخوبی انجام دیا اور اردو والوں کے دلوں کو بطور خاص خلیج میں رہنے والے محبانِ اُردو کے دلوں کو باغ باغ کر دیا۔

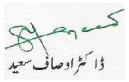

ڈاکٹر اوصاف سعید

پیام

پروفیسر گوپی چند نارنگ

سابق صدر نشین مرکزی ساہتیہا کیڈیمی، نئی دہلی

اپنی زبان کس کو پیاری نہیں لگتی۔ اس بارے میں طرف داری برحق، لیکن، سخن فہمی، بھی ضروری ہے۔ اُردو کی زلف گرہ گیر کے ہم سب اسیر ہیں۔ اُردو کے حسن وخوبی کا تذکرہ کون نہیں کرتا۔ اس لے لطف واثر اور شیرینی اور دل نشینی کی کشش کون محسوس نہیں کرتا۔ کون نہیں جانتا کہ اُردو ہندوستان کی بلکہ اس برصغیر کی یا جنوبی ایشیا کی ایسی زبان ہے جس میں اخذ وقبول کا حیرت انگیز ملکہ ہے، اور جس کا دامن طرح طرح کے پھولوں سے بھرا ہے، اور جس کی جادو اثری میں، شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطق اعرابی، تینوں کا ہاتھ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اُردو نے ہند آریائی کا دودھ پیا ہے اور اسی دھرتی پر پلی بڑھی ہے۔ کون نہیں جانتا جب نئی تاریخی حقیقتیں ابھرتی ہیں تو نئے سماجی تقاضے پیدا ہوتے ہیں اور نئی سچائیاں وجود میں آتی ہیں۔ اُردو ایسی ہی ایک سچائی ہے، لسانی، سماجی اور تہذیبی سچائی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے سابقے اور اختلاط وارتباط سے وجود میں آئی۔ اُس وقت اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ کوئی بھی سچائی جب جنم لیتی ہے، اُس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ سچائیوں کو نام تو اس وقت ملتا ہے جب وہ خانہ زاد ہو جاتی ہیں۔ پراکرتوں کی دھرتی سے جب نیا اکھوا پھوٹا اور اس میں عربی، فارسی، ترکی اثرات کا پیوند لگا تو اس کا کوئی بھی نام نہیں تھا، ہند یعنی ہندوستان کی ہر چیز، ہندی تھی، فارسی یائے نسبتی کے ساتھ، اس طرح ہر زبان ہندی تھی۔ امیر خسرو نے اسے ہندی بھی کہا اور دہلوی بھی۔ اسی زمانے میں جب راگ رنگ کی محفلوں میں اس کے نغمے سماں باندھنے لگے، تو اسے ریختہ بھی کہا گیا۔ دکن اور گجرات پہنچی تو دکنی اور گجری کہلائی، پھر کسی نے اُردو کہا، کسی نے ہندی، کسی نے کھڑی، بنیادو ہی ایک، راہیں الگ الگ ہو گئیں۔

اس امر کے تسلیم کرنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو کہ اُردو زبان ہماری پچھلی کئی صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے۔ ایسی کمائی جس سے کوئی انصاف پسند نظریں نہیں چرا سکتا۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اُردو جینے کا ایک سلیقہ، سوچنے کا ایک طریقہ بھی ہے۔ اُردو محض زبان نہیں، ایک طرزِ زندگی، ایک اسلوبِ زیست بھی ہے اور مشترکہ تہذیب کا وہ ہاتھ بھی جس نے ہمیں گھڑا، بنایا اور سنوارا ہے اور وہ شکل دی ہے جسے ہم آج اپنی پہچان کی ایک منزل سمجھتے ہیں۔

عالمی سطح پر اُردو زبان کی تعمیر وترقی کے پیش نظر مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی (حیدرآباد) اور ہندوستانی قونصل خانہ (جدّہ) کے باہمی اشتراک سے سعودی عرب کے شہر جدّہ میں 7-6 جون 2008 کو مشرقِ وسطیٰ کی پہلی دوروزہ عالمی اُردو کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جو پوری اُردو دنیا کے لیے ایک مژدہ ہے۔ دراصل یہ کانفرنس اُردو کی نئی بستیوں میں زبان وادب کی تعلیم، درس وتدریس اور اس کے فروغ کی سمت ایک پیش قدمی ہے۔ اس کانفرنس سے یقیناً غیر یورپی زبانوں میں اُردو کو ایک پہچان ملے گی، اس کی ترویج واشاعت میں اضافہ ہوگا اور اُردو کے روابط کو استحکام ملے گا۔ یہ تاریخی کام مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے انجام دیا ہے۔ میں کانفرنس کی کامیابی پر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان اور متعلقہ اسٹاف کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

پیام

چندر بھان خیال

نائب صدر نشین

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مکرمی!

شہر جدہ میں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدرآباد کے زیرِ اہتمام ''اُردو زبان کے مسائل اور امکانات'' کے موضوع پر منعقد دوروزہ عالمی اردو کانفرنس کی شاندار کامیابی پر میں وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جن کی نگرانی اور پیشوائی میں یونیورسٹی کی ٹیم نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور ہر اجلاس کو نہایت خوبصورتی اور سلیقے سے اختتام تک پہنچایا۔ اس دوران اردو زبان سے متعلق کئی مسائل زیرِ بحث آئے اور ان کے حل کے لیے دانشوروں نے تجاویز پیش کیں۔ اس کانفرنس میں منظور ہونے والی تجاویز بلاشبہ اردو زبان و ثقافت کی بقا اور حقوق کے تحفظ اور زبان و ادب کی تعمیر و ترقی اور توسیع و فروغ میں بے حد معاون و مددگار ثابت ہوں گی۔ یہ کانفرنس ایک تاریخی واقعہ ثابت ہوئی ہے جس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اردو اب ایک طاقتور عالمی زبان ہے۔

جدّہ میں مقیم قونصل جنرل ہند عزت مآب ڈاکٹر اوصاف سعید کو بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں جن کے بھرپور اور پرخلوص تعاون اور حسنِ سلوک نے اس عالمی اردو کانفرنس میں چار چاند لگا دیئے۔ ساہتیہ اکادمی کے سابق صدر اور ممتاز دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی موجودگی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اُردو اکادمی جدّہ انڈیا فورم، جدّہ خاکِ طیبہ ٹرسٹ جدّہ، اردو گلبن جدّہ وغیرہ مقامی اردو اداروں کا تعاون بھی قابلِ تحسین ہے۔

خوشی ہے کہ اس کانفرنس کے سلسلے میں آپ ایک خصوصی یادگار نمبر شائع کر رہے ہیں۔ میری تمام تر نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

خیر اندیش

چندر بھان خیال

(چندر بھان خیال)

پیام

پروفیسر کے۔آر۔اقبال احمد

نائب شیخ الجامعہ

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کی جانب سے قونصل خانہ ہند (جدہ سعودی عرب) کے تعاون سے ۶/ اور ۷/جون ۲۰۰۸ء کو جدہ سعودی عرب میں ''اُردو زبان۔مسائل اور امکانات'' کے موضوع پر منعقدہ دوروزہ عالمی اُردو کانفرنس کو ہندوستان کے علاوہ برطانیہ، کنیڈا، قطر اور سعودی عرب کے شہروں جدہ اور ریاض سے ادبا، شعرا، دانشوروں، صحافیوں، ماہرین تعلیم اور محبان اُردو کی کثیر تعداد نے اپنی شرکت کے ذریعہ غیر معمولی طور پر کامیاب بنایا تھا۔ یونیورسٹی کے عزت مآب شیخ الجامعہ پروفیسر اے۔ایم۔پٹھان نے اُسی مقام سے مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد کی جانے والی اس دوسری عالمی اُردو کانفرنس میں پڑھے جانے والے تمام مقالوں کی اشاعت کا اعلان کیا تھا تاکہ ان مقالوں میں پیش کئے گئے اُردو زبان کے مسائل کی یکسوئی کے لیے رہنمایانہ اصول وضوابط کا تعین کرتے ہوئے اُردو کی ترقی و ترویج میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے ایک مبسوط لائحہ عمل تیار کیا جاسکے۔ مجھے یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب اس مقصد کے حصول میں نہ صرف یہ کہ ایک سنگ میل ثابت ہوگی بلکہ اس کتاب میں پیش کی جانے والی تجاویز اُردو زبان کو ایک نئی جہت سے روشناس کروانے میں بھی معاون و مددگار رہوں گی۔ میں اپنی اور یونیورسٹی کی جانب سے اس کتاب کے ایڈیٹر مرکز برائے اُردو زبان، ادب و ثقافت مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے ڈائرکٹر انچارج ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد اور اس کی اشاعت کے سلسلے میں تعاون دینے والے تمام اراکین کو فرداً فرداً دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

کے۔آر۔اقبال احمد

(پروفیسر کے۔آر۔اقبال احمد)

پروفیسر بیگ احساس

مبصر

پروفیسر اشرف رفیع

مبصر

ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد

ایڈیٹر

پروفیسر ایس۔اے۔وہاب قیصر

کوآرڈینیٹر یونیورسٹی

ڈاکٹر سہیل اعجاز خان

کوآرڈینیٹر قونصل خانہ

نقطۂ نظر

پروفیسر بیگ احساس
صدر شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے قونصل خانہ (جدّہ، سعودی عرب) کے تعاون واشتراک سے ۶/اور ۷/جون ۲۰۰۸ء کو جدّہ، سعودی عرب میں جو دوسری عالمی کانفرنس منعقد کی وہ اس وجہ سے منفرد تھی کہ ایک طرف تو اس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر بشیر احمد خاں، ڈاکٹر ضیاالدین احمد شکیب، ڈاکٹر سید تقی عابدی، جناب زاہد علی خاں، جناب ظفر علی نقوی اور جناب چندر بھان خیال جیسے تجربے کار دانشوروں نے اس میں شرکت کی۔ دوسری طرف مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد اور انڈین انٹرنیشنل اسکول، جدہ و ریاض کے اساتذہ جنھیں تدریس کا عملی تجربہ ہے، ان کے علاوہ اردو یونیورسٹی کے ریجنل سنٹرس کے ڈائرکٹرز، محترمہ سمیرہ عزیز اور معصوم مرادآبادی جیسے صحافیوں، جدّہ، ریاض اور قطر کی اردو انجمنوں سے وابستہ عہدہ داروں نے بھی اس کانفرنس میں حصّہ لیا۔

کانفرنس میں پڑھے گئے مقالے اس اعتبار سے اہم ہیں کہ ان میں اردو ذریعہ تعلیم کے مسائل کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے۔ بعض مقالے بے حد معیاری اور اہم ہیں۔

جن میں پروفیسر محمد ظفر الدین کا ''مشینی ترجمہ'' پروفیسر وہاب قیصر کا ''اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم کا منظر نامہ'' ڈاکٹر شجاعت علی راشد کا ''اکیسویں صدی کی آواز'' قابل ذکر ہیں۔ محترمہ عذرا نقوی نے اپنے مقالے میں چند فکر انگیز سوالات قائم کیے ہیں۔ جس طرح جامعہ عثمانیہ نے ''دارالترجمہ'' قائم کر کے ملک کے ماہرین زبان وادب کو جمع کیا تھا اسی طرح مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اگر کمپیوٹر اور اردو زبان کے ماہرین کو اکٹھا کر کے مشینی ٹرانسلیشن پر اپنی مکمل توجہ صرف کرے اور اس میں کامیاب ہو جائے تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ یہ کام پروفیسر اے۔ ایم پٹھان کی رہنمائی میں ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ پروفیسر اے۔ایم۔پٹھان نے اردو یونیورسٹی کی سرگرمیوں کو مشرقِ وسطیٰ تک وسعت دے کر ایک اہم اقدام کیا ہے۔ ڈاکٹر سید تقی علی عابدی اور جناب سید جمال اللہ قادری نے کانفرنس کی تفصیلات خوب صورت انداز میں پیش کی ہیں۔ میں ان مقالوں کی کتابی صورت میں اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆

نقطۂ نظر

پروفیسر اشرف رفیع

سابق صدر شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے زیر اہتمام جدہ (سعودی عربیہ) میں اردو زبان۔ مسائل اور امکانات کے موضوع پر منعقدہ دو روزہ عالمی اردو کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں پیش کردہ مضامین/مقالات/رپورتاژ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عالمی کانفرنس یقیناً شاندار اور کامیاب رہی ہوگی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور تقی عابدی جیسے جید دانشوروں کی شرکت اور مخاطبت کانفرنس کی کامیابی کا ثبوت ہے۔

یہ تمام مضامین برصغیر اور اردو کی نئی بستیوں میں اردو زبان اور ادب کی ترقی و ترویج میں عصری مسائل اور موجودہ صورت حال، مستقبل میں اس کے فروغ کے روشن امکانات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کچھ مضامین اردو تعلیم کا طریقہ کار اور مسائل سے متعلق ہیں۔ بعض مقالے اردو کے عصری مسائل کا احاطہ کرتے ہیں صرف ایک مقالہ اردو شاعری میں عصری حسیت کے موضوع پر ہے۔ پیغامات کے علاوہ دو رپورتاژ ہیں۔ آج ضرورت بھی اس بات کی ہے کہ ہم ادب سے زیادہ زبان کی بقاء اور ترویج و ترقی کے

بارے میں سوچیں سو اس کانفرنس میں زیادہ تر اسی پر گفتگو کی گئی ہے جس سے امید افزاء نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ اس عالمی کانفرنس میں نئی نسل کو بھی اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ دراصل اردو کا فروغ، مستقبل میں اس کی درخشانی کا دارومدار نوجوان نسل ہی کے ہاتھوں میں ہے جب تک ہم نئی نسل کی مجبوریاں، ان کے مسائل پر توجہ نہ کریں اور ان کے خیالات ونظریات کا احترام نہ کریں ہم عصری چیلنجس کا مقابلہ منظّم طریقہ سے نہیں کر سکتے۔ نوجوانوں کے یہ مضامین کیفیت کے اعتبار سے کچھ بھی سہی انہیں اس کتاب میں ضرور شامل کرنا چاہیے (نئے لکھنے والوں کے یہ مضامین زبان اور تعلیمی مسائل کے دونوں زمروں میں شامل ہیں)۔

اس کتاب کی اشاعت پر میں پروفیسر اے۔ ایم پٹھان شیخ الجامعہ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتی ہوں اور آپ کو بھی کہ اس کی طباعت کی گراں بار ذمہ داری قبول کی۔

☆☆☆

سید جمال اللہ قادری

پروفیسر بشیر احمد

پروفیسر شمیم حنفی

ڈاکٹر تقی عابدی

ظفر علی نقوی

حرف آغاز

ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد
ڈپٹی ڈائرکٹر وانچارج مرکز برائے اُردو زبان، ادب وثقافت
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے حرکیاتی شیخ الجامعہ پروفیسر اے۔ایم۔پٹھان نے ڈاکٹر اوصاف سعید قونصل جنرل ہند (جدہ سعودی عرب) کے تعاون سے ۶/اور ۷/جون ۲۰۰۸ء کو جدہ میں یونیورسٹی کے زیر اہتمام دوسری عالمی اردو کانفرنس کے فقید المثال کامیاب انعقاد کے ذریعہ عالمی سطح پر اردو کی نئی بستیوں میں اس زبان کی ترقی وترویج کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔

اردو یونیورسٹی کی جانب سے مارچ ۲۰۰۷ء میں حیدرآباد میں منعقد کی گئی پہلی سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس کے موقع پر پروفیسر اے۔ایم۔پٹھان نے یہ انکشاف کیا تھا کہ ۱۹/مارچ ۲۰۰۳ء کو جب انہوں نے بحیثیت شیخ الجامعہ اس یونیورسٹی کا جائزہ حاصل کیا تھا تو اُسی دن سے اس جامعہ کے قیام کے بنیادی مقصد یعنی اردو کی ترقی وترویج کے لیے ایک ٹھوس منصوبہ بندی اور حکمت عملی کو قطعیت دی تھی، اور ترجیحی بنیادوں پر یونیورسٹی کی جانب سے ایک عالمی کانفرنس کے انعقاد کے ذریعہ اردو زبان کے مسائل

کی یکسوئی کے لیے اس حکمت عملی کو ابتداء میں قومی اور پھر عالمی سطح پر ایک مبسوط سمت ورفتار عطا کرنا چاہتے تھے، لیکن اپنے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے انھیں چار سال کا طویل انتظار کرنا پڑا۔ تاہم یونیورسٹی کی دوسری عالمی اردو کانفرنس کا صرف ایک سال بعد ہی جدہ میں کامیاب انعقاد عمل میں لاتے ہوئے انہوں نے اس بات کا بین ثبوت بھی فراہم کر دیا کہ وہ اردو ذریعہ تعلیم کے فروغ اور اردو کو روزگار سے مربوط کرنے کے لیے ہی شبانہ روز کوششوں میں منہمک نہیں ہیں بلکہ اس زبان کی ترقی وترویج میں حائل رکاوٹوں کو بھی بہ عجلت ممکنہ دور کرنے کی سعی مسلسل میں جٹے ہوئے ہیں تاکہ آزادی کی جدوجہد میں کلیدی رول ادا کرنے والی اردو جو اپنے ہی وطن میں اپنی کھوئی ہوئی عزت و وقار کی بحالی کی جدوجہد کر رہی ہے اُس کی بحالی کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو بطور وسیلہ استعمال کرتے ہوئے محبان اردو کے ان دیرینہ خوابوں کو شرمندہ تعبیر کر سکیں، جنہیں وہ نصف صدی سے زائد عرصہ سے بھی یعنی جامعہ عثمانیہ کے ذریعہ تعلیم کی تبدیلی کے بعد سے دیکھ رہے تھے، شاید اسی لیے پروفیسر پٹھان نے سرزمین حجاز پر منعقدہ اردو کی اس پہلی اور یونیورسٹی کی دوسری کانفرنس کی روئیداد کو ایک دستاویز کی صورت میں منظر عام پر لانے کا اُسی پلیٹ فارم سے اعلان بھی کر دیا تھا جو کچھ تاخیر کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

بہر حال شیخ الجامعہ نے یونیورسٹی کے مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت کو یہ ذمہ داری تفویض کی تو راقم نے اس کی ترتیب وتزئین کے لیے شیخ الجامعہ کی حسب ہدایت اساتذہ کرام سے گفت وشنید نیز پروفیسر اشرف رفیع سابق صدر شعبۂ اردو

جامعہ عثمانیہ اور پروفیسر بیگ احساس صدر شعبۂ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے نقاط نظر کے حصول کے بعد اس کی اشاعت کو یقینی بنایا۔ اس سے پہلے کہ اس ضخیم روئیداد پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کی آپ سے گذارش کروں اُن لوگوں کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھتا ہوں جنہوں نے اس کانفرنس کے کامیاب انعقاد وانصرام کے لیے اپنا قلمی اور عملی تعاون دیا۔ بالخصوص شیخ الجامعہ پروفیسر اے۔ ایم پٹھان قونصل جنرل ہند (جدہ سعودی عرب) ڈاکٹر اوصاف سعید، پروفیسر گوپی چند نارنگ سابق صدر نشین مرکزی ساہتیہ اکیڈیمی نئی دہلی، نائب شیخ الجامعہ پروفیسر کے۔ آر۔ اقبال احمد، جناب چندر بھان خیال نائب صدر نشین قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی پروفیسر بشیر احمد نائب شیخ الجامعہ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، پروفیسر شمیم حنفی سابق ڈین وصدر شعبہ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، جناب ظفر علی نقوی صدر نشین ین۔ یم۔ سی۔ ای، پروفیسر ضیاء الدین احمد شکیب ممتاز دانشور، مورخ و ماہر آثار قدیمہ، جناب عبدالکریم چوگلے دوحہ قطر، اور اُن تمام مقالہ نگاروں کا بھی جنہوں نے اس دوروزہ کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں اپنے پُر مغز مقالے پیش کرتے ہوئے ''اردو زبان مسائل اور امکانات'' کے موضوع پر منعقدہ اس دوروزہ کانفرنس کے دوران اپنا نقطۂ نظر پیش کیا اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس کانفرنس میں بنفس نفیس شرکت سے قاصر رہے تاہم اپنے قلمی تعاون کے ذریعہ اپنی سوچ وفکر اور موقف کو واضح کیا۔ اس روئیداد میں کچھ تشنگی کا احساس ہوتا اگر آخر میں شامل کیے گیے دونوں رپورتاژ سے صرف نظر کیا جاتا میں اس کتاب کی تزئین وترتیب کے دوران میرے ساتھ تعاون کرنے والے یونیورسٹی کے

تمام اراکین کا بھی فرداً فرداً شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ اس کانفرنس کے کامیاب انعقاد و انصرام کے لیے شیخ الجامعہ پروفیسر اے ۔ایم ۔پٹھان نے یونیورسٹی اور ڈاکٹر اوصاف سعید نے قونصل خانہ کی جانب سے علی الترتیب پروفیسر ایس ۔اے ۔وہاب قیصر پروفیسر نظامت فاصلاتی تعلیم مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور ڈاکٹر سہیل اعجاز خان قونصل جج پی اینڈ آئی ،سی جی ،قونصل خانہ ہند (جدہ سعودی عرب) کو، کوآرڈی نیٹر نامزد کیا تھا۔ میں ان دونوں کا بھی یونیورسٹی کی جانب سے شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ان کے ساتھ ساتھ جدہ کے وہ تمام ادارے محبان اردو اور اُن تمام تنظیموں کا بھی دلی شکریہ کہ جنہوں نے اس کانفرنس کی فقید المثال کامیابی میں حصہ لیا۔

اپنی بات ختم کرنے سے قبل آپ تمام قارئین سے گذارش ہے کہ اس کتاب میں ہونے والی کسی بھی نادانستہ غلطی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی قیمتی رائے سے مطلع فرمائیں۔

☆☆☆

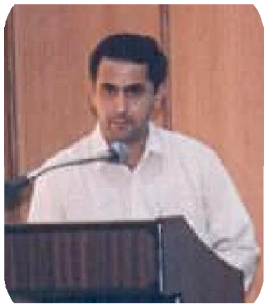

ڈاکٹر علی رضا موسوی

ڈاکٹر نجم اسحر

پروفیسر ایس اے وہاب قیصر

پروفیسر ریحانہ سلطانہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی

زبان شناخت اور سماجی طاقت کا وسیلہ

ڈاکٹر علی رضا موسوی
ریڈر جغرافیہ، نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

لوگوں کا زبان سے تعلق بہت پیچیدہ، الجھا ہوا اور ان کی ثقافت سے پیچ در پیچ لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ زبان تہذیبی اقدار کو ان میں تقسیم کرتی ہے، ان اقدار کے تعلق سے ذہن بناتی ہے، ان پر قابو پانے کے طریقے بتاتی ہے اور ان کی توضیح کرتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں وہ مفہوم کو مخاطب تک لے جانے کا وسیلہ ہوتے ہیں اور یہ مفہوم ان چیزوں کے تصور سے متعلق ہوتا ہے جنھیں ہم دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ ہماری فہم و فراست، ہماری تعلیم، سماجی ماحول، تہذیب اور مذہب کے تعلق سے ہمارے خیالات کو چمکاتی ہے۔ ہم جتنا زیادہ ان عوامل سے خود کو وابستہ کر لیتے ہیں اتنا ہی زیادہ ان کے بارے میں اظہار کی ضرورت ہمیں لاحق ہوتی ہے۔ پس انسانی ذہن اور زبان دونوں کی نشو ونما ایک ساتھ ہوتی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوتے ہیں یا یہ ایک دوسرے کو مکمل کرتے جاتے ہیں۔ اس مسحور کن طریقہ عمل سے انسان کی فہم، اظہار کی قوت اور عمل ارتقا ترقی کی جانب مائل ہوتے جاتے ہیں۔

زبان اور تاریخ کا طریق عمل

تاریخ نے جغرافیہ' تہذیب' معاشی طریق عمل اور زبان کے کئی جہان دیکھے ہیں۔ یہ سلسلہ دور قدیم کے مصر اور میسوپوٹامیہ (عراق وعرب) سے تا حال جاری وساری ہے۔ ان جہانوں کی تشکیل کے طریق کار وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور زبان طریق کار میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ روما اور یونان' مشرق ومغرب کا خاکہ کھینچتی ہے' مغرب کی نئی دنیا کی توضیح کرتی ہے اور آج کی دنیا کو ایک لسانی اکائی سے تعبیر کرتی ہے۔ ایک ایسی اکائی جو تجارت کرتی ہے' میل ملاپ رکھتی ہے' معاملہ کرتی ہے اور اسی واحد زبان میں اپنے موقف کو واضح کرتی ہے۔

نئی دنیا کی زبان

نئی دنیا کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی سے ہوا۔ ابتدا میں یہ یورپ پر محیط تھی مگر اب اس کی حیثیت عالم گیر ہوگئی ہے۔ یہ وہ دنیا تھی جو نوآبادیاتی طریق عمل سے شروع ہوئی اور جس پر سامراجی قوتیں قابض رہیں اور سائنس وٹکنالوجی کی مدد سے زمین کے قدرتی ذرائع کو بروئے کار لا کر زیادہ سے زیادہ خام مال اور سامان تیار کیا جاتا رہا۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں سرمایہ دارانہ نظام رائج ہے اور لامحدود تجارت اس کا سنگ بنیاد ہے۔ اس نئی دنیا کی زبان انگریزی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کے لطیف خیالات وتصورات کو کسی بھی زبان میں قلم بند کیا جاسکتا ہے مگر کسی بھی زبان کی تحریر کی بقا کا انحصار اس کے انگریزی ترجمے پر ہوتا ہے۔

انگریزی کی دنیا میں اردو یا کسی اور زبان کا کیا مقام ہے؟ یہی سوال دراصل اس مقالہ کا تصوراتی نکتہ ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جاچکا ہے کہ زبان دنیا بناتی ہے اور اسے آگے بڑھاتی ہے۔ پس یہ قدرتی بات ہے کہ اردو کے ارتقا کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے اس کے سماجی سیاق وسباق کا احاطہ اس مقالہ میں کرنا پڑے گا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے پس منظر میں انگریزی ہی کیوں؟ جب کہ اس ملک میں (1652) مادری زبانیں رائج ہیں اور چند سو زبانیں (تقریباً 400) یہ ساری زبانیں ہندوستان کے چار لسانی خاندانوں ہند آریائی' دراوڑی' آسٹرو ایشیاٹک' تبت وبرمن سے نکلی ہیں۔

اور آخری سوال نہایت ہی عملی اور استخراجی ہے اور اس کا دارومدار اس جواب پر ہے جو پہلے سوال کا ہوگا۔ یہ بات واقعی دلچسپ ہے کہ جدید تعلیم انگریزی کو چھوڑ کر کسی علاقائی زبان میں دی جائے خاص طور سے اردو میں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج کی دنیا میں علم کی افزائش صرف انگریزی ہی میں ہورہی ہے۔

اس مقالہ میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ان سوالوں کے جواب ایسے مسائل پیش کر کے دیئے جائیں جو نظریاتی ہوں اور دلیل وحجت پر مبنی ہوں۔ سب سے پہلی بات یہ ہوگی کہ زبان اور اس کے بولنے والے ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ کسی زبان کی اہمیت ورتبہ اور اس کے مستقبل سے تعلق رکھنے والی کوئی بھی بحث ہمیں زبان کے برتنے والوں کی سمت لے جائے گی۔

1 مسائل اور شناخت

زبان سماج کی شناخت ہوتی ہے اس لیے اردو کا جائزہ دراصل اس کے بولنے والوں کا جائزہ ہوگا۔ آج ہندوستان میں اردو کی شناخت کیا ہے؟ سیاسی طور پر اردو رجعت پسند سیاست کی وجہ سے دباؤ میں ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اس لیے اس میں اسلامی خیالات ہیں۔ چناں چہ اس کے بولنے والوں کے بارے میں یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ان میں ایک قسم کی بے چینی و بے بسی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ تصادم کا راستہ اپناتے ہیں۔ ثقافتی طور پر اردو کو آرٹ، شاعری اور اعلیٰ خیالات کے اظہار کی زبان سمجھا جاتا ہے اور اقتصادی طور پر اردو ہندوستان کے بازاروں میں رابطہ کی زبان ہے۔ ملک کے طول و عرض میں بین علاقائی تجارت کے معاملات طئے پاتے ہیں۔ یہ بات اور ہے کہ اس کے اثر کی شدت کہیں زیادہ تو کہیں کم ہے (یہاں اردو اور ہندی میں پائے جانے والے نازک فرق کی بحث بے محل ہوگی کیوں کہ ان دونوں زبانوں کے بولنے والے دونوں زبانوں میں خود کو آرام دہ محسوس کرتے ہیں۔) سماجی طور پر زبان میں عدم قناعت و بے اطمینانی ہے کیوں کہ اس کے برتنے والوں کا حلقہ کافی وسیع ہے اور ان کا سماجی، اقتصادی، ثقافتی اور جغرافیائی پس منظر مختلف ہے۔ اردو بولنے والے دنیا کے ہر شہر میں پائے جاتے ہیں۔

جب ہم اس بات پر بحث کرتے ہیں کہ زبان ایک شناخت ہے تو گویا اس کے بولنے والے ایک سماجی اکائی ہیں جو ایک ہی قسم کی ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ ان بولنے والوں کی ایک باضابطہ حیثیت بھی ہے جو مذہبی، قومی، معاشی اور سیاسی حالات کی تابع

ہے۔ یہ حیثیت پریشان کن اور پیچیدہ طاقت کا نمونہ ہے اور یہ طاقت ہر وقت بدلتی اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی ہے اور تنازعات کو لبیک کہتی ہے۔ ایسا لگتا ہے سماج سیاسی و معاشی اصولوں پر منظّم ہے جو یہ تعین کرتے ہیں کون طاقت کا استعمال کنندہ ہوگا اور طاقت کے مسائل کیا ہیں، ان وسائل پر قابو رکھنے کا فنی طریقہ کار کیا ہے اور ان تک رسائی کس طرح ممکن ہے۔

سماج کے وسائل کیا ہیں؟ یہ وسائل مادی اور غیر مادی ہیں۔ ان کا دائرہ کار تہذیب، تعلیم، ثقافت اور زبان تک پھیلا ہوا ہے۔ زبان سماج کا سب سے قوی وسیلہ ہے کیوں کہ اس کا تعلق بالراست ذہن سے ہے۔ زبان سماج کی قوت کی تشریح و توضیح کرتی ہے اور قوت تک رسائی کو ممکن بناتی ہے۔ مختصراً تمام تر دنیا میں زبان قوت کے حصول کا ایک ابتدائی بیرم (Lever) ہے۔ قوت کے عروج و زوال ہی سے زبان کا عروج و زوال وابستہ ہے جیسے لاطینی و یونانی سے عربی اور فارسی اور پھر انگریزی اور اردو۔

زبان اور سماجی اقدار

روزمرہ کے استعمال میں زبان ثقافتی شناخت کی اہمیت، محاوروں، کہاوتوں اور اخلاق و خوش کرداری کے پیش پا افتادہ اظہار کے ذریعہ واضح کرتی اور یہ بتاتی ہے کہ کونسی خبر سماج میں قابل قبول یا نا قابل قبول ہے۔ زبان سماجی اقدار کا ابتدائی اظہار ہے اور جب سماج بدلتے، ترقی کرتے یا زمانے سے آگے ہوتے ہیں تو زبان بھی بدلتی ہے اور پھر وہ اخلاق اور لوک ریت کی از سر نو نئی زبان میں توضیح و تشریح کرتی ہے۔

آج کل انگریزی میں ''Living together'' یا '' Live in

relation'' (ساتھ رہنا) بہت ہی قابل قبول اظہار بن گیا ہے۔اس اظہار کا اطلاق ان جوڑوں پر ہوتا ہے جو شادی کیے بغیر زن وشوہر جیسی زندگی گزارتے ہیں۔ پانچ چھ دہائی قبل اس طرح زندگی گزارنے کو غیر اخلاقی ومعیوب سمجھا جاتا تھا کیوں کہ شادی کے بغیر جنسی اختلاط کو گناہ تصور کیا جاتا تھا۔لیکن اب مغرب میں اس طرح کی زندگی کا عام چلن ہے اور سماج اس طرح کے جنسی رشتوں کو قبول کرنے لگا ہے اور یہ رشتہ اب ایک قابل قبول حقیقت کا درجہ حاصل کر چکا ہے کیوں کہ اس زبان کے بولنے والوں نے ''Living together'' کی ازسرنو تعریف وتوضیح کر لی ہے۔اور یہ اظہار ایک ایسے سماج کی شناخت بن گیا ہے جو فرد کے عمل کی آزادی کا قائل ہے اور یہ صورت حال دراصل شہری زندگی اور صنعت کاری کی دین ہے۔

ایک اور قوی اور موثر مثال انگریزی کے لفظ ''Terrorist'' (دہشت گرد) کی دی جاسکتی ہے۔ یہ لفظ عالمی اکھاڑے میں سیاسی ثقافت کا مظہر ہے۔ یہ لفظ بنیادی طور پر ایک دوسرے کو قطع کرنے والے خیالات اور اداروں کو غیر جائز قرار دینے کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسے سماج کی دین ہے جو جذب وتغیر کے دور سے گزر رہا ہے جہاں فاصلوں کا تصور میڈیا اور ٹکنالوجی کی وجہ سے پاش پاش ہو گیا ہے۔ ثقافتیں اور تہذیبیں ایک دوسرے پر ایک خاص رفتار، سطح اور شدت سے منکشف ہوتی ہیں جس کی مثال ماضی کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ چناں چہ اس بے ضابطگی کا نتیجہ انتشار کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور وہ جو قوت بردار ہیں ان میں خوف پیدا کرتا ہے اور ان میں امید جگاتا ہے جو قوت سے محروم ہیں۔اس طرح تصادم سر پر سوار ہو جاتا ہے اس تصادم کو

غلط طور پر تہذیبوں یا ثقافتوں سے جوڑ دیا جاتا ہے حالاں کہ تصادم کی دراصل وجہ مفاد حاصلہ ہے۔اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے زبان اس کے برتنے والوں کے لیے پرانے لفظوں اور ان کے نئے مفاہم کے ساتھ آگے آتی ہے۔

عوام جب دباؤ اور فشار کی کیفیت سے گزرتی ہے تو اس کا بالراست اثر زبان پر ہوتا ہے اور اگر عوام قوت سے محروم ہو جاتی ہے تو حزب مخالف کی قوت زبان کو ختم کر دینے کے لیے پہلا ہلہ بول دیتی ہے قوت سے محرومی کی وجہ عوام کی اس نااہلی کا نتیجہ ہوتی ہے جب وہ ٹکنالوجی یا سیاست میں ہونے والی تبدیلیوں کو اپنانے سے قاصر رہتی ہے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ لوگ خود کو ان تغیرات سے الگ تھلگ کر لیتے ہیں۔ زبان بھی خود کو اسی رنگ میں ڈھال لیتی ہے۔ اگر چہ کہ یہ بات متنازعہ ہے مگر یہ سمجھنے کی کوشش کرنا مستحسن ہے کہ پہلے کون مرتا ہے زبان یا زبان کے برتنے والے کا ذہن!

دوسرا مسئلہ جو اس چوکھٹے میں رکھا جاسکتا ہے وہ زبان اور اخلاقی اقدار کے مابین ممکنہ رشتہ کا ہے۔کوئی پس وپیش وہچکچاہٹ کے ساتھ ضرور یہ نتیجہ اخذ کرے گا کہ اردو زبان فطری طور پر عالمگیر سرمایہ دارانہ قوتوں سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتی کیوں کہ اس کا سماجی ڈھانچہ مختلف النوع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو بولنے والا بیگانگی کا شکار ہے اور دوسرے ازخود عائد کردہ غیر اہم باتیں زبان کے جمود کا سبب بن رہی ہیں اس لیے اردو جدید تعلیم سے قریبی تعلقات استوار نہیں کر سکتی۔

جب ہم زبان اور قوت کے مابین پائے جانے والے رشتے کو سمجھ لیتے ہیں تو پھر ہمارے لیے یہ تلاش کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ کس طرح زبان سماج کے اندر اپنے کام

انجام دیتی ہے، کون اس کا مالک ہوتا ہے اور کیوں اور کیسے قوت اپنا مقام زبان کے ساتھ منتقل کرتی رہتی ہے۔

2 جدیدیت اور زبان.....سماجی سیاق

شناخت کے بعد سب سے بڑا چیلنج جدیدیت کا ہے۔ جدیدیت یعنی تغیر و تبدیلی کو اپنے حسب منشاء بنانا اور اسے اپنا کر قوت کو اپنے قبضے میں رکھنا۔ وہ زبانیں جو قواعد کے اصولوں اور ترکیب نحوی میں لچکدار ہوتی ہیں وہی زندہ رہی ہیں، یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کی اپنی اصلی شکل وطرز تحریر وہی باقی رہے۔ یہ تبدیلی اسی صورت میں ممکن ہے جب لوگ نئی شناخت کو اپنائیں اور جب ان کی معیشت اور سماجی طریق عمل میں خود اعتمادی ہو کہ وہ تسلسل سے اس قلب ماہیت کے تعلق سے خود اسلوبی کے ساتھ عہدہ برا ہو سکتے ہیں۔

جرمن، فرانسیسی، ہسپانوی اور دیگر یوروپی زبانوں اور انگریزی کا طرز تحریر رومن ہے یعنی ایک جیسا ہے اور ان زبانوں کے بولنے والوں کے سماج بھی ایک جیسے ہیں یہ ایک ایسا مددگار عنصر ہے جو ان زبانوں کے برتنے والوں کے لیے ایک بڑی طاقت ہے، مگر یہ تبدیلی متلازم طریق عمل ہے یعنی لوگوں کا از خود دور حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا اور عوامی تعلیم کا ادنیٰ سطح تک گر جانا۔

یہ ظاہر ہے کہ جدیدیت ایک کلچر ہے اور سیاق عبارت ایک خاص خیال۔ جدیدیت بالراست سماجی رجحانات اور سماجی اخلاقیات سے وابستہ ہے اور یہ ایک عرصے پر محیط تبدیلیوں کا نتیجہ ہے، ایسی تبدیلیاں جو داخلی اور خارجی ہیں اور جو سماجی اور معاشی

ساخت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ خاص طور سے لوگوں کے ادراک اور تبدیلیوں سے خود کو ہم آہنگ کرنے کا ماحصل ہے۔ جب لوگ بدلتے ہیں تو ان کی زبان بھی بدلتی ہے۔ زبان کی تبدیلی نئے خیالات اور حالات کو حسب منشا بنانے کے لیے ہوتی ہے اس طرح زبان نئے خیالات کے اظہار کی کوشش کرتی ہے۔

اس نظریاتی سیاق میں ہندوستان میں اردو کے مقام کو آج سراہا جانا چاہیے۔ پس یہ ضروری ہے کہ پچھلی ڈیڑھ صدی پر محیط زبان کی سماجی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تاکہ آگے کے جائزے کے لیے پس منظر تیار ہو سکے۔

اس لیے ہم ہندوستان میں برطانوی سامراج کی تاریخ کی ابتداء اور اردو شاعر و ادیب و نقاد مولانا الطاف حسین حالؔی (1837-1914ء) کے دور کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ وہ اس دور میں رہے ہیں جب سماجی اور ثقافتی تبدیلیاں ہو رہی تھیں یہ وہ وقت تھا جب مختلف و متوازی جہان تشکیل پا رہے تھے.....'' ان جہانوں میں ایک کی تشکیل برطانوی حکمران اور ہندوستانی رعایا کے درمیان باہمی تعامل سے ہو رہی تھی۔ یہ دنیا تغیر کے وقت کی تھی جب خیالات کی لہروں میں تصادم برپا تھا اور قدیم رجحانات اور اداروں پر حملہ ہو رہا تھا۔ یہ ایک جانچی جانے والی دنیا تھی جہاں دو ثقافتیں مل رہی تھیں جس کے اسباب وعلل کا ایک سلسلہ چل پڑا تھا جو بنگالی نشاۃ الثانیہ سے 1857ء کے واقعات اور علی گڑھ تحریک کے دور تک محیط تھا۔ الطاف حسین حالؔی اس دور کے باشندے تھے انہوں نے اس دور کی تعریف وتشریح کی بلکہ اسے بنایا بھی۔ وہ اس دنیا کے علاوہ ایک اور حلقے سے بھی وابستہ تھے جس میں غالبؔ، بہادر شاہ ظفرؔ اور داغؔ تھے۔ ان کی یہ دنیا بھی

انگریزوں کے دور میں چلتی رہی جس نے انگریزوں کی موجودگی سے صرف نظر کیا یا پس وپیش کے ساتھ اس کا سامنا کیا مگر کسی وقت بھی باضابطہ ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ انیسویں صدی کے کئی جہانوں نے وقت اور زندگی کی قدر و قیمت پر زور دیا مثال کے طور پر سرسید انگلستان گئے اور پھر وہاں سے ملک لوٹ کر ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے مضامین سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے مضامین ایڈیسن اور اسٹیل (Steele) کے نمونہ تحریر پر رقم کیے۔ داغؔ اپنے کلام کو دولت مند دربار میں پیش کر رہے تھے اور ایسی زندگی گزار رہے تھے جس کا مقابلہ سترھویں صدی عیسوی کے شعرا و ادبا سے کیا جا سکتا ہے۔ حالیؔ ان تمام جہانوں میں زندہ بھی رہے اور کام بھی کیا۔''

روایتی اور جدید دنیاؤں کا ٹکراؤ 1857ء میں ہوا اور اس تصادم میں جدید دنیا کی جیت ہوئی۔ پرانی دنیا نے خود کو سماجی، ثقافتی اور معاشی محاذ پر حملہ کی زد میں پایا۔ اس کے ساتھ ہی اردو بھی جدید سازی کے فقدان اور بے اثر سماجی پیغام اور دق زدہ ثقافت کی وجہ سے متاثر ہوئی۔

اس بحث کو توانائی دینے کے لیے زبان کا سیاسی و معاشی مسئلہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ زبان ممتاز طبقے اور درباروں کی زبان تھی۔ اس کا استعمال مشاعروں اور غزلوں کے لیے کیا جاتا تھا۔ اس کی تحریر صرف شاعری ہی کے لیے مختص تھی۔ یوں تو اردو سے ہر کوئی واقف تھا مگر اسے صرف اعلیٰ طبقہ ہی پڑھتا اور لکھتا تھا پھر بعد میں وہ سماجی طور پر اس مذہبی تعلیم کے لیے استعمال کی جانے لگی جو مدرسوں میں پڑھا دی جاتی تھی۔

تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہندوستان میں اردو کو جدید تعلیم سے کوئی علاقہ ہی

نہیں تھا۔ یہاں تک کہ 1825ء میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ دہلی کے کالج اور جامعہ میں اردو ذریعہ تعلیم تھا اور سماجی علوم، فلسفہ اور ادب کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ 1835ء تک یہ میڈیکل، انجینئرنگ اور سائنس میں تعلیمی زبان بنی۔ چناں چہ کلکتہ اور آگرہ میڈیکل کالج اور تھامسن رورکی انجینئرنگ کالج میں ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ 1917ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے مستحسن اور جرات مندانہ قدم اٹھاتے ہوئے علم کی تمام شاخوں کی تعلیم کا سلسلہ اردو میں شروع کیا۔

اس کے باوجود زبان کی شناخت خاص طور سے شاعری اور مذہبی تعلیم کے طور پر کی جاتی رہی۔ اس حالت زار سے بازیاب کرنے کے لیے دو تحریکیں شروع ہوئیں۔ پہلی تحریک حالیؔ نے شروع کی انہوں نے غزل کی اصلاح کی اور اردو شاعری کو زیادہ سے زیادہ عملی اور افادیت پسند بنایا۔ دوسری تحریک سرسید احمد خاں نے چلائی اور بتایا کہ انگریزی تعلیم ہی کے ذریعہ ''قدیم دنیا'' مستقبل میں زندہ رہ سکتی ہے۔ ان تمام تر کوششوں کا نتیجہ فی الفور اور حوصلہ افزا رہا اور پھر انگریزی کی ایک مختلف معاشی اور ثقافتی ماحول میں نشوونما ہوئی۔ اس ردعمل کے اثرات کو حالیؔ کے ''مقدمہ'' اقبال کے ''شکوہ'' اور انگارے گروپ میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں ہم اردو کے بولنے والوں کے مسائل کو حل کرنے کی کوششوں کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ ان کوششوں میں یا تو ماضی کے تزک و احتشام کو نظر انداز کرنے کی بات کی گئی ہے یا پھر انہیں ادب کے ذریعہ ایک اجنبی کلچر اور سماجی روش سے روشناس کرایا گیا ہے۔ اس دوسری کوشش کا مناسب سبب سیاسی معیشت تھا۔ ایک گروپ ایسا تھا جس کا تعلق ممتاز طبقے سے تھا جو سرسید کی انگریزی جامعہ سے

وابستہ تھا تو دوسرا اقدامت پرستی کا دلدادہ۔

اس سلسلے میں اور بھی مثالیں دی جاسکتی ہیں جو اردو بولنے والوں کے لیے ربط سماجی ارتقاء اور اردو زبان میں پائی جانے والی بے آہنگی کی مزید وضاحت کرسکتی ہیں۔

3.1 میکالے اور ہندوستانی تعلیم کی مختصر روئیداد

مندرجہ بالا سطور میں اردو کے سماجی سیاق سے بحث کی گئی ہے اور اب اس مقالے میں پیش کردہ دوسرے سوال کی طرف توجہ کی جاسکتی ہے۔ ''انگریزی کیوں؟''

اس کا مناسب جواب اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب ٹی بی مکالے کونسل آف انڈیا کے مجلس قانون ساز کا نیا رکن بن کر ہندوستان آیا تھا اور پھر بعد میں اس کا تقرر بطور صدر تعلیمی کونسل ہوا اور سب سے پہلی حقیقت جس سے اس کا سامنا بذات خود ہوا وہ تعلیم نہیں تھی بلکہ ذریعۂ تعلیم تھا جس کا ذکر اس نے 1835ء میں تحریر کردہ تعلیم کی مختصر روئیداد میں کیا ہے۔

میکالے آخر اس مشکل کا سامنا کیوں کرتا ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں ماضی قریب میں جانا ہوگا اور یہ جاننے کی کوشش کرنی ہوگی کہ ہندوستان میں عوامی تعلیم کا منظرنامہ کیا تھا۔ تعلیم صرف چند ہی کے لیے خصوصی اعزاز واختیار تھی۔ ہندوؤں میں اعلا ذات کے ہندو اور مسلمانوں میں دربار سے وابستہ لوگ ہی اس سے فیض یاب ہوسکتے تھے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے لیے دینی مدارس بھی تھے جو سب کے لیے کھلے تھے اور خاص طور سے ان لوگوں کے لیے جو دینیات اور مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ ہندوؤں کے لیے ذریعہ تعلیم سنسکرت اور مسلمانوں کے لیے فارسی

اور عربی تھا۔ سماجی گفت وشنید اور تجارت کے لیے بولی جانے والی زبان ان میں کوئی بھی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ کئی مختلف مادری زبانیں اور بولیاں بھی تھیں۔ کروڑہا لوگوں کے ملک میں کچھ ہی ہزار خواندہ تھے۔ ہندوؤں کے علوم اور تعلیم کی زبان سنسکرت تھی اور مسلمانوں کی فارسی اور عربی اور کچھ عرصے بعد ہندوستانی یا اردو وسیع سیکولر اور جدید تعلیمی نظام کی زبان بنی۔

اگرچہ یہ مثالیں متن کے لحاظ سے عام ہیں مگر ہمارا یہ جائزہ ہمیں ہندوستان میں عوامی تعلیم کا احوال بتائے گا۔ اس کے علاوہ تعلیم کا مطلب صرف سائنس، سماجی علوم یا آرٹ نہیں ہے۔ بلکہ یہ مذہب پر زیادہ تکیہ کرتی ہے۔ راجہ رام موہن رائے کے الفاظ میں..... ''نوجوانوں کے اذہان قواعد کے اصولوں اور مابعد الطبیعاتی امتیازات سے بھر دیے جاتے ہیں جس کا بہت تھوڑا یا کوئی عملی فائدہ اس کے حاصل کنندہ یا سماج کو ہوتا ہے''۔ طالب علم وہی حاصل کرتے ہیں جو دو ہزار سال قبل معلوم تھا اور اگر اس میں قیاس آرائی کرنے والے کچھ اور اضافہ کرتے ہیں تو بے مصرف اور غیر اہم۔ ویدانتک حلقہ کے مطابق ایسے نوجوان سماج کے بہتر اراکین نہیں بن سکتے، کیوں کہ انہیں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ وہ ساری چیزیں جو دکھائی دیتی ہیں ان کا اپنا کوئی اصل وجود نہیں ہوتا جیسے باپ بھائی وغیرہ اور وہ اپنی کوئی حقیقی کامل صورت نہیں رکھتے نتیجتاً وہ کسی طور محبت کے حقدار نہیں ہوتے اس لیے یہ ہمارے لیے بہتر ہوتا ہے کہ ہم ان سے راہِ فرار اختیار کریں اور دنیا چھوڑ دیں۔

میمنگسا (Meemangsa) کے طالب علم کو یہ جان کر کوئی اہم فائدہ نہیں

ہوتا کہ وید کے چند اقتباسات کا ورد کر کے بکرے کا قاتل بے گناہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح نیایا شاستر Nyaya Shastra کا طالب علم یہ پڑھنے کے باوجود کشادہ ذہن نہیں ہوسکتا کہ کائنات میں موجود چیزوں کو کتنے معیاری درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور جسم کا روح سے، روح کا جسم سے اور کان کا آنکھ سے اندازے پر مبنی کیا رشتہ ہے۔ سنسکرت زبان کچھ اتنی زیادہ مشکل ہے کہ اسے مکمل طور پر سیکھنے کے لیے ساری عمر درکار ہے۔ یہ زبان کئی صدیوں سے علم کے پھیلاؤ کے لیے ایک افسوسناک رکاوٹ ہے اور اس کی تعلیم ایسا نقاب اوڑھی ہوئی ہے جس پر کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی اور کسی طور یہ تعلیم زبان کو حاصل کرنے میں لگائی جانے والی مشقت کا بدل نہیں ہوسکتی۔ اس خیالی تعلیم کی حوصلہ افزائی کرنے سے قبل سرکار عالی اس کی افادیت کے بارے میں غور کریں اور میں مودبانہ سرکار عالی سے خواہش کروں گا کہ وہ اس کا لارڈ بیکن سے قبل پائی جانے والی سائنس اور ادب کی حالت سے تقابل کریں اور تعلیم کی ترقی کے بارے میں غور کریں جب اس نے یہ لکھا ''سنسکرت کا تعلیمی نظام ہندوستان کو تاریکی میں رکھنے کے لیے سوچ سمجھ کر بنایا گیا ہے''۔ اس معاملے کو حضور کی خدمت میں پیش کر کے میں سمجھتا ہوں میں نے دیانت داری سے اپنا فرض نباہا ہے اور اس کی وضاحت کر کے میں نے سرکار عالی کو آگاہ کیا ہے جو اس دور افتادہ ملک کو یہ سوچ کر توجہ دے رہے ہیں کہ یہاں کے باشندوں کی حالت میں سدھار آئے اور میں یہ توقع کرتا ہوں کہ سرکار عالی میری اس جسارت بے جا کو معاف فرمائیں گے جو میں نے اپنے جذبات کو حضور کی خدمت میں پیش کر کے کی ہے۔''

3.2 انگریزی کی ناگزیریت

راجہ رام موہن رائے کے اس طویل اقتباس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہندوستانیوں کا ایک طبقہ مادری زبان میں تعلیم کا سخت مخالف تھا وہ اس میں مذہبی مشمولات کے اس حد تک مخالف تھے کہ انہوں نے اس بات کو سرکار عالی کی خدمت میں پہنچانا اہم اور ضروری سمجھا۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ زبان کے انتخاب کے بارے میں میکالے مشکل صورت حال سے دوچار تھا جب کہ انگریزی کی موافقت میں خود ہندوستانی آگے آرہے تھے۔ اپنی اس حالت کو اس نے اپنی روئیداد کی دفعہ 19.5 اور 6 میں بیان کیا ہے۔'' تمام فریقین اس امر پر متفق ہیں کہ وہ بولیاں جو ہندوستان کے اس حصے کے لوگوں میں عام ہیں ان میں نہ تو ادبی اور نہ ہی سائنسی معلومات و مواد ہے۔ یہ بولیاں اس قدر کمزور اور نفاست سے عاری ہیں کہ انہیں کسی اور طرح سے بہتر بنانا چاہیے۔ ان بولیوں میں کسی قابل قدر کام کا ترجمہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس بات کو تمام گوشوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ لوگوں کے وہ طبقے جو ذہنی صلاحیت کے ارتقاء کے لیے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع رکھتے ہیں انہیں فی الحال کسی بولی سے نہیں بلکہ کسی زبان سے قابل بنانا چاہیے۔ ایسی صورت میں اس کام کے لیے کون سی زبان مفید و کارآمد ہوگی.....؟ نصف کمیٹی یہ سمجھتی ہے کہ وہ زبان انگریزی ہے اور باقی نصف شدومد سے سنسکرت اور عربی کی سفارش کرتی ہے۔ یہ سوال مجھے یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کون سی زبان اس سلسلے میں بہتر ہوگی۔''

میکالے خود اعتمادی کے ساتھ اس عاجز کرنے والی صورت کا حل ڈھونڈ نکالتا

ہےاور ہندوستانی عوام کی تعلیم کے لیےانگریزی زبان تجویز کرتا ہے۔''انگریزی حکومت چلانے والی جماعت کی زبان ہے۔ اسے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے وہی مقامی باشندے استعمال میں لاتے ہیں جوحکومت سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ تمام مشرق کے سمندروں تک ایک مشترک زبان ہوگی۔ یہ زبان یوروپ کے دو بڑی بستیوں کی زبان ہے جوابھررہی ہیں ایک افریقہ کے جنوب میں اور دوسری آسٹریلیا میں اور وہ ہندوستان کی سلطنت سے قریب تر ہوتی جارہی ہے۔ہم اپنے ادب کی قدر و قیمت کو دیکھتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ سبب سوچنے کے لیے پیدا ہوجاتا ہے کہ تمام بیرونی زبانوں میں انگریزی ہی وہ واحد زبان ہے جو ہماری مقامی رعایا کے لیے کارآمد ہوسکتی ہے۔

یہ کہنا غیر ضروری ہوگا کہ انگریزوں نے ہندوستانی زبانوں میں پائے جانے والے فرقہ وارانہ مزاج کا اندازہ لگالیا تھا۔سنسکرت ہندوؤں کی زبان اور عربی/ فارسی مسلمانوں کی زبان تھی۔ان دونوں کو متحد کرنے کے لیے ایک اور زبان ناگزیر تھی اس لیےانگریزی زبان کا انتخاب کیا گیا جو غیر ملکی، سیکولر زبان کے ساتھ ساتھ یہ حکمرانوں کی زبان بھی تھی جو ثالثی کا کام بھی انجام دے سکتی تھی اور جدید تعلیم کے لیے ایک موثر ذریعہ بھی بن سکتی تھی۔

انگریزی کا انتخاب کامیابی کے حصول کی کوئی شاہی امنگ نہیں تھی اور نہ ہی یہ نوآبادیاتی بوجھ کی وجہ سے کیا گیا تھا۔ میکالے کئی مثالیں پیش کرتا ہےاور یہ بتاتا ہے کہ مقامی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنا بے سود و بے مقصد ہے وہ سال 1833ء کے بنگال مدرسے کا حساب پیش کرتا ہے۔حکومت نے اس مدرسے کے لیے پانچ سو روپے بطور

وظیفہ 77 عربی کے طلبا میں تقسیم کیے تاکہ عربی زبان کی حوصلہ افزائی ہوسکے۔اس کے برخلاف حکومت کو ایک کالج سے جہاں کا ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ 103 روپیوں کی آمدنی ہوئی۔ پھر وہ سنسکرت زبان کی طرف آتا ہے۔اور بنارس سنسکرت کالج کے سابقہ طلبا کی طرف سے تعلیمی کونسل کو لکھی گئی عرضی کے متن کے بارے میں لکھتا ہے۔ درخواست گزاروں نے یہ بتایا ہے کہ وہ اس کالج میں دس سے بارہ سال تک تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔انہوں نے اپنی پڑھائی ہندو ادب اور سائنس میں کی ہےاوران کے پاس قابلیت کے صداقت نامے بھی ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ اس کے باوجود اس محنت کا ثمر کیا ہے؟ ان دستاویز کو رکھتے ہوئے اور آپ کی باوقار کمیٹی کی مدد کے بغیر وہ کچھ بھی بہتر کرنہیں پاتے۔جس بے رخی سے ہمارے ہم وطن ہماری طرف دیکھتے ہیں اسے دیکھتے ہوئے ہمیں ان سے ہماری مدد یا حوصلہ افزائی کی کوئی صورت نظرنہیں آتی۔اس لیے وہ گورنر جنرل سے ملتجی ہیں کہ انہیں حکومت میں کوئی مناسب نوکری دی جائے۔وہ کسی جلیل القدر عہدے کے متمنی نہیں ہیں اور نہ کسی بہت بڑے معاوضے کی آس لگائے ہوئے ہیں۔انہیں صرف اس قدر دیا جائے جس سے وہ اپنا وجود برقرار رکھ سکیں۔وہ کہتے ہیں ہم ایک باعزت و معتبر زندگی گزارنے کا وسیلہ چاہتے ہیں اور تدریجی ترقی کے خواہاں ہیں۔ تاہم یہ ہمارے لیے اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ حکومت ہماری مدد نہ کرے جس نے ہمیں تعلیم دی اور ہماری پرورش کی۔ وہ اپنی درخواست کو قابل رحم انداز میں پیش کرتے ہیں اور وہ پرامید ہیں کہ حکومت انہیں یوں مفلس و کنگال نہیں چھوڑ دے گی کیوں کہ حکومت نے ان کی فیاضانہ مدد کی جب وہ تعلیم حاصل کررہے تھے۔''

اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے میکالے کہتا ہے ''..... یہ تمام درخواستیں اور ان میں سب سے زیادہ ناواجب و نامعقول بھی یہ فرض کر کے دی گئی ہیں کہ وہ جس نقصان سے دوچار ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کا ازالہ ہو جائے گا۔ بے شک یہ سب سے پہلے عرض گزار تھے جنہوں نے مفت تعلیم حاصل کر کے نقصان کی تلافی کا مطالبہ کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ (12) سال تک سرکار نے ان کی اعانت کی اور انہیں تعلیم دلوائی اور پھر اس دنیا میں چھوڑ دیا جو ادب اور سائنس سے مزین ہے۔ وہ اپنی تعلیم کو زخم سمجھتے ہیں اور حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس زخم کو ازالہ کے ذریعہ مندمل کرے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ مالی امداد جو انہیں طالب علمی کے دور میں دی گئی تھی وہ نہایت قلیل و ناکافی تھی۔ میں یہ نہیں سمجھتا کہ وہ صحیح ہیں۔ انہوں نے اپنی عمر عزیز کے بہترین سال اس تعلیم میں گنوا دیئے جو ان کے لیے روٹی فراہم کر سکتی ہے اور نہ عزت..... یقیناً ہم نے انہیں نا اہل اور ناکارہ بنانے کی قیمت بچالی ہے یقیناً یہ اب سرکار پر ایک بوجھ ہیں اور اپنے پڑوسیوں کے لیے ناپسندیدہ۔ یہ سب حکومت نے ایک قلیل خرچ پر کیا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے ہماری پالیسی یہی ہے۔ ہم سچائی اور جھوٹ کی جنگ میں ناوابستہ بن کر کھڑے نہیں رہ سکتے۔ ہم مقامی باشندوں کو ان کے توارثی تعصب و جانبداری کے حوالے نہیں کر سکتے۔ ہم نے ان قدرتی مشکلات میں جو سائنس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں کچھ اور مشکلوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ سچائی کو پھیلانے کے لیے ہمیں انعام واکرام نہیں دینا چاہیے۔ ہم جھوٹے شوق اور جھوٹے فلسفے میں بہت زیادہ فراخ دل ہیں۔''

بہت ہی محتاط انداز میں وہ سوال سے نپٹتے ہوئے بتاتا ہے کہ عوامی تعلیم کے

لیے ہندوستانی زبانیں بے اثر ہیں۔ میکالے قانونی اور انتظامی مسائل کی طرف بڑھتا ہے اور اپنی ''مختصر روئیداد'' میں یوں رقمطراز ہے۔ ''یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوؤں کے قانون کو سنسکرت کی کتابوں سے اور مسلمانوں کے قانون کو عربی کتابوں سے پڑھنا پڑتا ہے اور اس کے لیے یہ دونوں اصرار بھی کرتے ہیں۔ ہمیں پارلیمنٹ نے حکم دیا ہے کہ ہم ہندوستان کے قانون کا خلاصہ تیار کریں اور اس مقصد کے لیے ہمیں لاکمیشن کی مدد بھی دی گئی ہے۔ جیسے ہی قانون ضوابط مرتب ہو جائیں گے منصف یا صدر امین کے لیے شاستر اور ہدایہ بے کار ہو جائیں گے۔ میں یہ امید کرتا ہوں کہ وہ لڑکے جنہوں نے ابھی ابھی مدارس اور سنسکرت کالج میں داخلہ لیا ہے ان کے تعلیم کے فراغت پانے تک یہ بڑا کام سرانجام دے دیا جائے گا۔''

پھر وہ انگریزی تعلیم کے اثرات کو اپنے اس بیان میں پیش کرتا ہے۔ میکالے کے اس بیان کے غلط حوالے دیئے گئے اور جسے بہت کم سمجھا گیا ہے۔ اب ہمیں اپنی تمام کوششوں کو ایک ایسی جماعت کی تیاری میں لگانا ہوگا جو ہمارے اور ان لاکھوں لوگوں کے درمیان جن پر ہم حکومت کرنے میں، ترجمانی کا کام انجام دے سکے۔ ایک ایسی جماعت جو ہندوستانی رنگ و روغن اور خون رکھتی ہو مگر ذوق وشوق، اخلاق اور ذہانت میں انگریزوں جیسی ہو۔ اس جماعت کے تفویض ہم بولیوں کو سدھارنے کا کام کریں گے تاکہ وہ ان بولیوں میں سائنس شامل کریں جس کی اصطلاحات کو مغرب سے مستعار لیا گیا ہے اور انہیں ایسی کارگر سندیں دی جائیں گی جو تعلیم کو عوام تک پہنچانے میں سواری کا کام کریں گی۔

میکالے اپنی بات کو یہ کہہ کر ختم کرتا ہے کہ ''..... بورڈ آف پبلک انسٹرکشن (Board of Public Instruction) سرکاری پیسے کو ضائع کر رہا ہے اور ایسی کتابیں شائع کرنے میں لگا رہا ہے جن کی قدر و قیمت اس سادہ اور کورے کاغذ کے برابر بھی نہیں ہے جو ان کتابوں کی اشاعت میں لگایا جا رہا ہے بے معنی تاریخ، مہمل مابعد الطبیعات، ناقص طبیعات اور بے معنی دینیات کی بے وجہ حوصلہ افزائی کی جاری ہے اور ایسے عالموں کی نسل تیار کی جا رہی ہے جو اپنی علمی فضیلت کو بوجھ اور اخلاقی عیب سمجھتے ہیں۔ جب تک وہ تعلیم حاصل کرتے ہیں تب تک وہ سرکار پر زندہ ہیں اور جن کو دی جانے والی تعلیم اتنی ناکارہ اور بے سود ہے کہ اسے حاصل کرنے کے بعد انہیں فاقہ کشی کرنی پڑتی ہے یا باقی ماندہ زندگی سرکار کے رحم و کرم پر گزارنا پڑتی ہے۔ ان حالات میں اس بات کا خواہش مند ہوں کہ بورڈ آف پبلک انسٹرکشن کی ذمہ داریوں سے خود کو اس وقت تک کے لیے الگ کر لوں جب تک کہ یہ اپنے کام کرنے کے طریقوں میں تبدیلی نہیں لے آتے۔ مجھے محض ناکارہ نہ سمجھا جائے بلکہ مثبت طور پر مضرت رساں سمجھا جائے۔

4.1 اس ناگزیریت کے ممکنہ اسباب

یہاں سے ہم اس بحث کے دھاگے کا سرا پکڑ سکتے ہیں کہ کوئی بھی ہندوستانی زبان تعلیمی ضرورتوں اور ہندوستانی لوگوں کے مطالبات کی یکسوئی نہیں کر سکتی۔ اس سلسلے میں ہم تین بڑے اسباب کی شناخت کر سکتے ہیں۔

پہلا سبب اس اختصاص کا ہے جس میں معلومات اور علم صدیوں سے صرف

ایک ہی ذات یا فرقے کے نظام سے وابستہ ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جو منظّم طور پر سماج میں علم کی طرف سے محرومی پھیلاتا ہے۔ یہ اختصاص مختلف طریقوں سے قائم رکھا جاتا ہے اور اسے آگے بڑھانے میں ظالمانہ طریقے بھی استعمال کرنے سے نہیں چوکتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام الناس کا کوئی علاقائی سیکولر ادب نہیں ہے وہ صرف پراسرار فرضی حکایتیں، توہمات پر مبنی کہانیاں، رزمیہ داستانیں یا وہ کہانیاں سنتے ہیں جو انہیں مندروں کے ہالوں میں سنائی جاتی ہیں۔ ایسا تمام ادب توہمات، خوف، دیوی دیوتاؤں، عفریت اور چڑیلوں سے بھرا پڑا ہے۔ یا پھر تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، سائنس پچھلی صدی کے وسط یا اواخر سے پڑھائے جا رہے ہیں۔

دوسرا سبب تحریر کے متن سے متعلق ہے۔ تمام تحریروں کی بنیاد ہندوستانی مذہب ہے۔ موضوعات، مشمولات، اسلوب اور یہاں تک کہ زبان پر بھی مذہب کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ اگر چہ کہ تحریر کو ہزار طریقوں سے ترقی دی جاتی ہے مگر اس کی اساس وہی مذہب ہوتا ہے۔

تیسرا سبب ہندوستان میں اس زبانی ثقافتی روایت کا ہے جو برسوں سے قائم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کئی لوگ ناخواندہ ہیں اس لیے زبانی ترسیل کی اہمیت ہے۔ جو کسی طور لوگوں کو پڑھنے لکھنے کی طرف مائل نہیں کرتی پس زبان، اس کا استعارہ، لغت میں کئی رکاوٹیں زبان کے استعمال کرنے والوں کے مضبوط تصورات کی وجہ سے آتی ہیں جو چیزوں کو بندھے ٹکے واقعات اور ممکنات کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

4.2 جدید تعلیم کے لیے اردو کی ترقی سے وابستہ مسائل

اس مقالے کی ابتدا ہی میں ایک آخری سوال پوچھا گیا تھا اب وقت آ گیا ہے کہ اس سوال کے جواب کے بارے میں غور کریں۔ یہ پسندیدہ بات ہے کہ جدید تعلیم انگریزی کے علاوہ علاقائی زبانوں میں دی جائے خاص طور سے اردو میں۔ حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں آج کل علم کی پیداوار صرف انگریزی زبان میں ہو رہی ہے۔

اس سے قبل یہ کہہ دیا جا چکا ہے کہ اس سوال کا جواب استخراجی ہے اور اس کا انحصار ان پوچھے گئے سوالوں پر ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ ان سے کس طرح نپٹا گیا ہے۔ پچھلی بحث کے دوران جو نکات ابھر کر سامنے آئے ہیں وہ ہیں۔

i) اردو زبان جدید تعلیم سے جڑی ہوئی نہیں ہے کیوں کہ اس کی وجہ اردو بولنے والوں کے سماجی حالات ہیں۔

ii) اردو کے بولنے والے پھیلے ہوئے ہیں ان میں سے زیادہ کا تعلق کمزور سماجی طبقوں سے ہے اور یہ ناموزونیت جغرافیائی حالات اور سیاسی معیشت کی وجہ سے ہے۔ اس لیے اس کے پیچیدہ مسائل کو سمجھانے میں صرف عام نظریات ہی سے کام لیا جا سکتا ہے اور یہ نظریات بعض صورتوں میں زبان کی ملکیت کے تعلق سے بدبخت اور نہ ٹالی جانے والی رسہ کشی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

iii) اردو کے بولنے والے بڑے پیمانے پر جدید سازی کے کئی رخوں سے جڑے ہوتے ہیں اس لیے وہ دوسری ثقافتوں کے تصورات اور خیالات کو اپنانے سے قاصر رہتے ہیں۔

iv) اردو والے سب سے الگ تھلگ رہتے ہیں اور ان کا یوں الگ تھلگ رہنا انہیں سماجی فرسودگی کا شکار بنا رہا ہے۔ یہ فرسودگی درمیانی طبقے میں آزادانہ تعلیم کے فقدان اور نچلے طبقے میں از خود عائد کردہ بندشوں کا نتیجہ ہے۔

یہ سماجی طریق عمل پیچیدہ ہیں اور زیادہ سے زیادہ سنجیدہ اور تفصیلی جائزہ کے متقاضی ہیں۔ اس صورت حال کا بظاہر نتیجہ اردو بولنے والوں کا خصوصی خاکہ ہے جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اردو زبان کا تعلق مذہب سے ہے۔ یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ جب کوئی زبان اور اس کے بولنے والے کئی سماجی شناختیں رکھتے ہیں تو ایسی صورت میں وہ ایک ناقابل تخفیف شناخت یعنی مذہب سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں یہ الزام اردو کے سر تھوپنا غلط ہے کہ وہ اپنے بولنے والوں کو اختیارات دلانے کی اہل زبان نہیں ہے۔ اس سے قبل یہ کہا جا چکا ہے کہ زبان دراصل اس کے استعمال کرنے اور بولنے والے بناتے ہیں۔ آج اردو نشو ونما اور تبدیلی کے لیے فطری طور پر ناموافق حالات کا شکار ہے کیوں کہ یہی مسئلہ اس کے بولنے والوں کا بھی ہے۔ پس اردو میں تبدیلی کا آغاز اردو بولنے والوں کی تبدیلی ہی سے ہوگا۔

5 اختتام.....جدید اردو تعلیم سے توقعات.....اردو یونیورسٹی کا کردار

اگر ہم اوپر دیئے گئے نکات کو تبدیلی کا لائحہ عمل سمجھتے ہیں تو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا کردار نہایت اہم اور فیصلہ کن ہو جاتا ہے۔ اس کے کردار کو اتنی وسعت دی جانی چاہیے کہ وہ انگریزی کی روایتی تعلیم کی جامعات سے آگے نکل جائے جو صرف تعلیم اور ڈگریاں دیتی ہیں۔ اردو یونیورسٹی کو ایک خاص مقصد کے ادارے اور ایک خاص مقصد

کی جامعہ کے طور پر ابھرنا چاہیے اور اس کا بنیادی تفویض کردہ اختیار کچھ اس طریقے سے آگے بڑھے کہ اردو زبان کے بولنے والوں کو وسیع تعلیمی میدان کے مقابل بے روک ٹوک لا کھڑا کرے۔ انہیں پیشہ ورانہ تعلیم بہم پہنچائی جائے اور تعلیم کا سلسلہ اعلیٰ تعلیم پر ختم ہو۔ اردو ذریعہ تعلیم کے اسکول قائم کیے جائیں اور یہیں سے جامعہ کو طلبا فراہم کیے جائیں۔

جامعہ آخری دو کوششوں میں متحرک و سرگرم ہے (اور بے نظیر پہل کے طور پر اردو ذریعہ تعلیم سے اساتذہ کی ترتیب اور فاصلاتی طرز تعلیم کا اس میں اضافہ ہوا ہے) اور اپنی پہلی کوشش کے لیے اسے ایک ارتکازی منصوبہ مرتب کرنا چاہیے۔ اس قسم کے منصوبہ کے حسب ذیل اجزائے ترکیبی ہوں۔

a) اس جامعہ کی دیگر جامعات سے زبردست ہمہ کاری ہو عملے اور طلبا کی ادلا بدلی کے پروگرام ترتیب دیئے جائیں۔ اس قسم کے پروگراموں سے اردو بولنے والوں کو بین ثقافتی کھلا پن ملے گا۔ جس کی کمی ایک بڑی کم زوری ہے۔

b) اردو زبان اور اردو کے بولنے والوں کا مستقبل بالراست جدید معلوماتی ٹکنالوجی سے وابستہ ہے۔ اس کا مطلب ہرگز جائزہ کاری (Scanning) عددی نگارش (Digitilization) یا ایک ہی جسامت کے حروف یا اردو ویب پیجیس (Web Pages) کو ترقی دینا نہیں ہے بلکہ ترجمے کے لیے ایک عمدہ سافٹ ویر کی تیاری بھی ہے جو دیگر زبانوں کا اردو میں اور اردو کا دیگر زبانوں میں بعجلت ممکنہ ترجمہ کر سکے۔ یقیناً یہ اقدام اردو ذہن کے لیے ایک

زبردست کھلی فضا فراہم کرے گا جس سے زبان تازہ تصورات اور خیالات سے آراستہ ہو جائے گی۔

c) اردو طرز تحریر کو انٹرنیٹ سے جوڑ دیا جائے تاکہ اعلیٰ قدر و قیمت کا حامل مواد لکھا جاس کے اور نیٹ پر ذخیرے کے نظام میں منتقل کیا جاس کے جو مستقبل کے طالبان علم کے لیے براوزنگ (Browsing) کے کام آسکے۔

d) مستقبل میں زبان کی نشوونما ادب کے سرمایہ پر ہے اس لیے ادب میں نئی اصناف داخل کی جائیں اور ادب کی نئی قسمیں تلاش کی جائیں۔

e) ایک اور نازک مسئلہ اردو طرز تحریر کے تحفظ کا ہے اردو کا طرز تحریر فارسی سے لیا گیا ہے۔ اس میں بظاہر کوئی نقصان نہیں ہے کہ اسے رومن طرز تحریر میں لکھا جائے اس مقصد سے نہیں کہ اردو کو فارسی رسم الخط سے بے دخل کر دیا جائے بلکہ یہ ایک صحت مند اور متوازی ذریعہ کے طور پر عمل میں لایا جانا چاہیے تاکہ اردو بولنے والوں کی آنے والی نسلیں اس خوبصورت ادب کے سرمایہ گراں مایہ سے لطف اندوز ہو سکیں۔ جامعہ اردو نثر اور نظم کے نمونوں کو رومن رسم الخط میں شائع کرنے کا ایک آزمائشی منصوبہ بنائے۔

f) جامعہ میں سرانجام دیا جانے والا تحقیقی کام ہمہ رخی ہو۔ روایتی مضامین پڑھائے جائیں اور اردو اور اس کے بولنے والوں پر کی جانے والی حقیقی تحقیق کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ مختلف شعبوں میں زبردست تال میل ہو خاص طور سے اردو اور سماجی علوم میں۔

g) آخری اور بہت اہم بات یہ ہے کہ جامعہ خاص فیلوشپ اور اس کا لرشپ قائم کرے تا کہ اس سے آزاد تحقیق، عملی تحقیق اور رفاقتی تحقیق انجام دی جاس کے اور یہ تحقیق اردو کو پڑھانے کے طریقوں، علم اصولیات، سماجی علوم اور معلومہ مواد کو ذخیرہ کرنے کے تعلق سے ہو۔ ان مضامین میں تحقیق سے اردو میں تازہ ترین معلومات کا اضافہ ہوگا۔

اگر چہ کہ یہ مشورے بلحاظ متن عام سے لگتے ہیں مگر یہ مستقبل میں بڑی دور تک زبان کو نئی توانائی بخشنے میں کارآمد ثابت ہوں گے۔ انہیں اس بنیادی تمہید کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ زبان کے بولنے والوں کو طاقت ور بنانے کا مطلب زبان کو طاقت ور بنانا ہے۔

چنوتی / چیلنج زبردست ہے اور کام محنت طلب اور کوشش وقعت و منزلت والی ہو کیوں کہ یہ ایک خوبصورت اور بامعنی زبان کی بقا کا معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ سینکڑوں ہزاروں ہندوستانی شہریوں کو ریاست اور ملک کے لیے تیار کرنے کا بھی ہے۔ جیسا کہ بجا کہا گیا ہے۔ ''زبان کی حدیں دراصل اس کے خیالات کی حدیں ہیں''۔

☆☆☆

اردو زبان کی موثر تدریس اسکولی سطح پر مسائل اور عملی تجاویز

ڈاکٹر نجم السحر
ریڈر شعبہ تعلیم و تربیت
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

تمام مخلوقات میں انسان حیوان ناطق کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسے اس بات کی فضیلت حاصل ہے کہ وہ زبان کا استعمال کرتا ہے۔ زبان قدرت کا ایک ایسا انمول تحفہ ہے جس سے انسان اپنی فکر اور سوچ کو دوسروں تک بہ آسانی ظاہر کرسکتا ہے۔ ابتداء میں انسان نے اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے آوازوں اور اشاروں سے کام لیا اور بعد میں یہی آوازیں اور اشارے زبان کو وجود میں لے آئے۔ انسان کی صلاحیت نطق ہی زبان کہلاتی ہے۔ پروفیسر انعام اللہ خاں شروانی لکھتے ہیں ''زبان صرف انسان کے خیالات کے اظہار کا اہم اور مرکزی ذریعہ ہی نہیں بلکہ ایک نسل سے دوسری نسل تک کی تہذیب کی ترسیل کے لیے بھی لازمی اور ضروری ہے۔''

انسانی جذبات، احساسات اور خیالات کی ترجمانی زبان ہی کہ ذریعہ ممکن ہے۔ شخصیت کی ترقی بھی زبان کے بغیر ممکن نہیں۔ انسان کے باہمی روابط زبان ہی سے بندھے ہیں۔ ابتداء میں اپنے خیالات کے اظہار کے لیے انسان جانوروں کی طرح

آوازیں نکالتا رہا ہوگا۔ اپنے تاثرات کو آنکھوں اور ہاتھوں کے اشارے سمجھتا رہا ہوگا اور جب اپنے احساسات کو دوسروں کے آگے بیان کرنے کی خواہش شدید تر ہوئی تو اس نے اپنے مخصوص خیال کو لفظ کی شکل دی اور اس طرح زبان خیال کا ایک حصہّ بن گئی۔ لسانیات کی اصطلاح میں زبان کی تعریف کچھ اس طرح کی گئی ہے۔ ''اپنے مافی الضمیر کو دوسروں پر ظاہر کرنے کے لیے ملفوظ آوازوں کا استعمال زبان کہلاتی ہے۔''

ہماری روزمرّہ زندگی میں زبان کے استعمال کی ضرورت کے پیش نظر کسی بھی تعلیمی نظام میں تدریسی زبان کو مرکزی اہمیت دی گئی ہے۔ تدریسی زبان کے ذریعہ طلباء کو زبان کی مختلف الجہات استعمالات سے واقف کرایا جاسکتا ہے اور انھیں سننے، گفتگو کرنے، پڑھنے اور لکھنے میں مدد دی جاسکتی ہے۔ چوں کہ زبان خیالات و تجربات کے اظہار و ترسیل کا وسیلہ ہوتی ہے لہذا زبان کے مطالعہ سے طلباء دوسروں کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں اور سماجی اقدار کا اندازہ لگا سکتے ہیں مختلف موضوعات کے مطالعہ سے جن میں ادب کا مطالعہ بھی شامل ہے، طلباء اپنے خیالات و احساسات میں بصیرت حاصل کر سکتے ہیں۔ تمام علوم تک رسائی زبان ہی کے ذریعہ ممکن ہے اسی لیے زبان کی تدریس جس قدر موثر و مستحکم ہوگی طلباء اُسی قدر دوسرے علوم کو آسانی کے ساتھ سمجھ پائیں گے۔

ہندوستان کے تعلیمی نظام میں سہ لسانی فارمولہ رائج ہے جس کے تحت دس سالہ اسکولی دور میں ہر طالب علم کو تین زبانیں سیکھنی لازم کردی گئی ہیں زبان اوّل کی حیثیت سے مادری زبان یا علاقائی زبان، زبان دوم کی حیثیت سے علاقائی زبان یا کوئی ایک ہندوستانی زبان اور زبان سوّم کی حیثیت سے انگریزی یا کوئی ایک بین الاقوامی زبان۔

اس فارمولہ کے تحت ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اُردو کو زبان اوّل اور زبان دوّم کی حیثیت سے پڑھائے جانے کی گنجائش موجود ہے۔

زیر نظر مقالہ میں اُردو زبان کی تدریس کے دوران پیش آنے والے مختلف مسائل کا جائزہ لیا جارہا ہے اور زبان اُردو کی موثر تدریس کے لیے جدید طریقے، سرگرمیاں، تکنیکیں اور حکمت عملیاں پیش کی جارہی ہیں تاکہ اُردو اساتذہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں ان مسائل کا مقابلہ کرسکیں اور اپنی تدریس کو موثر و مستحکم بنا سکیں۔

کسی بھی زبان کے اکتساب سے عام طور پر چار مہارتوں کا سیکھنا مراد ہوتا ہے جو اس طرح ہیں، سننا اور سمجھنا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا، عرف عام میں اسے LSRW کہتے ہیں۔

لسانی نشوونما کا پہلا عمل سننا اور سمجھنا ہوتا ہے۔ یعنی ایک نوزائیدہ بچہ جیسے ہی دنیا میں قدم رکھتا ہے عمل سماعت کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ اپنے اطراف ہونے والی بات چیت اور آوازوں کو بغور سنتا اور انھیں شناخت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اسی طرح وہ اِن آوازوں کے مفہوم کو سمجھنے لگتا ہے سات آٹھ ماہ کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ مختلف آوازوں کو نکالنے لگتا ہے جو دراصل اس کی بات چیت یا گفتگو کی ابتداء ہوتی ہے۔

جب بچے اپنے ابتدائی دنوں میں اسکول کے ماحول میں قدم رکھتے ہیں تو وہ زبان کے مختلف طریقوں پر استعمال کے تجربات سے گذر چکے ہوتے ہیں۔ وہ اس بات کا شعور رکھتے ہیں کہ ان کی ضروریات سے اوروں کو واقف کرانے کے لیے بھی انھیں زبان کی ضرورت ہے۔ وہ نہ صرف سنی ہوئی باتوں کو نقل کرتے ہیں بلکہ ان باتوں سے

معنوں کو اخذ کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔

تین سال کی عمر میں بچے ایک ہزار الفاظ تک کا استعمال کر سکتے ہیں اور پانچ سال میں یہ تعداد دو ہزار تک ہوسکتی ہے اور جہاں تک الفاظ کے سمجھنے کا سوال ہے یہ تعداد مزید زیادہ ہوسکتی ہے۔ تین سال کا بچہ تین تا چار الفاظ پر مشتمل جملے آسانی کے ساتھ کہہ سکتا ہے اور پانچ سال کی عمر کا بچہ اپنی مادری زبان کی تقریباً تمام قواعدی ساختوں کو استعمال کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ بچوں میں زبان کی یہ نشوونما بغیر کسی تعلیمی ماحول کے پیدا ہوتی ہے۔ اکتساب زبان کا یہ فطری طریقہ ہے۔ بچہ گھر کے ماحول میں زبان کے تئیں جس طرح کے تجربات سے گذرے گا اس کی لسانی نشوونما پر اُسی طرح کے اثرات مرتب ہوں گے۔ مطلب یہ کہ بچہ اپنے ماحول میں جس قسم کی زبان کو سنے گا اُسی کی نقل کرتے ہوئے بولنے کی کوشش کرے گا۔ اور بچہ سے افراد خاندان کا تعامل جس طرح کا ہوگا اتنی ہی تیزی سے بچہ لسانی مہارتوں کو اختیار کرے گا۔

اسی لیے پرائمری سطح کے اُردو زبان کے اساتذہ کے لیے لازم ہے کہ وہ بچہ کی فطری لسانی نشوونما کے مدارج اور اُصولوں سے واقف ہوں اور اسی فطری طرز عمل کو کلاس روم میں اختیار کریں۔

زبان کے اکتساب میں سماعت اور گفتگو، یہ مراحل بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ پڑھنے اور لکھنے کے مراحل بعد میں آتے ہیں۔ لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ کلاس روم میں زبان کی تعلیم کی ابتداء ہی پڑھانے اور لکھانے سے ہوتی ہے۔ بچہ کو پہلی جماعت سے ہی حروف تہجی کے بعد لفظوں اور جملوں اور پڑھنے لکھنے کا کام کروایا جاتا ہے۔ دوسری

جماعت سے اُردو کی درسی کتاب میں باقاعدہ اسباق ہوتے ہیں جن کی معلم کی جانب سے تفہیم وتشریح کی جاتی ہے، سوالات کے جوابات اور مشکل الفاظ کے معنی لکھوائے جاتے ہیں نہ طلباء کو سننے / سماعت کی مناسب تربیت دی جاتی ہے اور نہ ہی ان میں گفتگو کو فروغ دینے کی کوشش کی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو بچہ ہر دم گھر میں چہکتا اور پٹر پٹر باتیں کرتا رہتا ہے وہ اسکول آکر گم سم ہوجاتا ہے اسے اسکول کا ماحول اجنبی، نامانوس اور سکھانے کا طریقہ خشک اور غیر دلچسپ لگتا ہے۔ اس غیر فطری ماحول سے بچہ اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے میں دقت محسوس کرتا ہے۔ اس طرح کا ماحول زبان کی نشوونما کے لیے انتہائی ناموزوں ہوتا ہے۔

کلاس روم میں طلباء کو ڈسپلن کے نام پر آپس میں ایک دوسرے سے بات چیت کرنے سے روکا جاتا ہے۔ استاد کے لیے ضروری ہے کہ اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کی بچہ کی فطری کوششوں کی حوصلہ شکنی نہ کرے بلکہ کمرہ جماعت میں اس طرح کا ماحول فراہم کرے جس سے بچوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے زبان کے موثر استعمال کے مواقع حاصل ہوسکیں۔

بچوں کی موثر سننے اور بولنے کی مہارت پر درج ذیل عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔

موضوع: ایسے موضوعات جو بچوں کے لیے دلچسپ ہوں اور جن کی معلومات بچوں کی عمر اور لیاقت کی مناسبت سے ہو بچے ان موضوعات پر بات چیت کرنا پسند کرتے ہیں۔

سامع: سامع مانوس ہو تو بچوں کو گفتگو کرنے میں جھجک نہیں ہوتی۔

ردّعمل: اگر سامع بچوں کی باتوں کو دلچسپی اور توجہ سے نہ سنیں تو بچوں کی گفتگو پر اس ردعمل کا منفی اثر پڑتا ہے۔

مختلف گھریلو پس منظر سے تعلق رکھنے والے بچے جب اپنے اسکول کے ابتدائی ایام میں کلاس روم میں آتے ہیں تو انھیں نامانوس چہرے اور گھر سے مختلف ماحول نظر آتا ہے۔ اس تبدیل شدہ صورت حال میں بچوں کو ایک دوسرے سے بات چیت کرنے یا دوسروں کی گفتگو سننے میں جھجک ہوسکتی ہے۔

پرائمری جماعتوں میں طلباء کو سننے اور گفتگو کے مواقع فراہم کرنے کے لیے بھی درج ذیل سرگرمیاں کارآمد ثابت ہوسکتی ہیں۔

* پہلی جماعت کے طلباء کو اس جانب راغب کیا جائے کہ وہ اپنے دوستوں کے سامنے گھر میں پیش آنے والے تجربات سنائیں اور بتائیں کہ انھوں نے گھر میں کیا کیا کام کیے۔ اسی طرح وہ گھر سے لائے گئے کھلونوں اور دوسری اشیاء کے بارے میں بھی غیر رسمی گفتگو کر سکتے ہیں۔

* تیسری جماعت کے طلباء کو دائرہ کی شکل میں بٹھایا جائے اور انھیں آپس میں خیالات واحساسات ظاہر کرنے کے لیے کہا جائے۔ ان کے درمیان ایک جادو کی چھڑی رکھی جائے۔ جس کے ہاتھ میں جادو کی چھڑی تھمائی جائے اُسے بات کرنے کا موقع ہوگا۔ گفتگو کی ابتداء اس طرح کے جملوں سے کی جاسکتی ہے۔

میرا پسندیدہ رنگ ۔۔۔۔۔ ہے کیوں کہ ۔۔۔۔۔ ۔

یا پھر۔ ''مجھے سب سے زیادہ آنکھ مچولی کا کھیل پسند ہے'' یا ''مجھے اسکول آنے میں اس

لیے پریشانی ہوتی ہے کیوں کہ۔۔۔۔''

* پانچویں جماعت کے طلباء کو باقاعدگی کے ساتھ کلاس کونسل منعقد کرنے کے لیے کہا جائے اس کونسل میں ان مسائل پر بحث کی جائے جو بچوں کے لیے اہم ہوتی ہیں۔ ہر مباحثہ کے دوران مختلف بچہ کو صدارت سونپی جائے تاکہ ہر بچہ میں قائدانہ صلاحیت کو فروغ دیا جاس کے۔ جنھیں بات کرنا ہو ان کے ہاتھوں میں کھلونے کا مائیکروفون تھما دیا جائے۔ اس طرح کے مباحثے طلباء میں خود اعتمادی پیدا کرنے اور اپنے خیالات واحساسات کو بلا جھجک دوسروں تک پہنچانے میں کارآمد ثابت ہوسکتے ہیں۔

لسانی ہمہ رنگی: عام طور پر ہر جماعت میں طلباء مختلف لب ولہجہ اور بولیوں میں گفتگو کرتے ہیں اور یہ گفتگو معیاری زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ ہم طلباء سے ہرگز یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ معیاری زبان میں گفتگو کرسکیں گے کیوں کہ جس زبان میں طلباء روزمرّہ گفتگو کرتے ہیں وہ ان کی شناخت سے مربوط ہوتی ہے۔ اگر اسکول میں اس زبان کی قدر نہ کی گئی جس کو طلباء اپنے گھروں سے لائے ہیں تو اس بات کا خطرہ رہتا ہے کہ ہم طالب علم کی ناقدری اور اس کے احساسات کو مجروح کردیں گے۔ لہذا ابتدائی سالوں میں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ

* طلباء میں پائی جانے والی زبان کی مہارتوں کو قبول کیا جائے ان کی زبان کی ہمت افزائی کی جائے اور انھیں استعمال کیا جائے۔

* لسانی بنیاد پر پائے جانے والے کسی بھی قسم کے امکانی امتیاز کا مقابلہ کیا جائے۔

*لسانی ہمہ رنگی کی پوری طرح قدر کی جائے۔

* طلباء کو مناسب حالات میں معیاری زبان استعمال کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

وہ کلاس روم جہاں لسانی ہمہ رنگی کی قدر کی جاتی ہے اکتسابی زبان کے تعلق سے بہت اہم ہوتی ہے۔ لسانی ہمہ رنگی کی شناخت اور کھوج کے لیے درج ذیل سرگرمیاں اختیار کی جاسکتی ہیں۔

*پرائمری جماعتوں کے طلباء سے یہ کہا جائے کہ وہ گھر سے کوئی روایتی گیت یا نظم سیکھ کر آئیں اور اس نظم یا گیت کو کلاس روم میں اپنے ساتھیوں کے سامنے سنائیں۔ ان کی سنائی ہوئی نظموں اور گیتوں کو ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ کرلیا جائے۔

*بچوں سے کہا جائے کہ وہ اپنے گھر میں، افراد خاندان، دوستوں، رشتہ داروں وغیرہ سے سنی ہوئی کہانیوں کو کلاس روم میں سنائیں۔

* ساتویں یا آٹھویں جماعت کے طلباء کو منتخب الفاظ کی ایک فہرست دی جائے اور ان سے کہا جائے کہ وہ اپنے بزرگوں اور والدین سے اپنی اپنی بولیوں میں دیئے گئے الفاظ کے مترادفات پوچھ کر لکھ کر لائیں اور کلاس روم میں اپنے ساتھیوں کے سامنے سنائیں۔ اس طرح سے بولیوں کی ایک فرہنگ یا ڈکشنری مرتب کی جاسکتی ہے۔

گفتگو یا بیان کرنے کی مہارت کو فروغ دینے کے لیے نمونے کے طور پر چند سرگرمیاں درج کی جاتی ہیں۔

* کمرہ جماعت میں طلباء کے آگے میز پر مختلف اشیاء رکھی جائیں۔ ایک

طالب علم سے کہا جائے کہ وہ ان اشیاء میں سے کسی ایک شئے کے بارے میں معلومات دے اور دوسرے طلباء اس بیان کی روشنی میں اُس شئے کی شناخت کریں۔

* طلباء کو کمرہ جماعت میں کارٹون دکھایا جائے۔ اس کے بعد طلباء سے استاد کارٹون کے تعلق سے اس طرح سوالات کرے جیسے کہ وہ اس کارٹون سے ناواقف ہے۔ طلباء استاد کو کارٹون کے تعلق سے سمجھائیں گے۔

* کمرہ جماعت میں طلباء کو حالیہ منعقدہ کرکٹ میچ یا کسی بھی کھیل کی ویڈیو دکھائی جائے طلباء کے گروپ سے کہا جائے کہ وہ اس ویڈیو پر کمنٹری تیار کریں اور پھر اسے اسمبلی یا کمرہ جماعت میں پیش کریں۔

کہانی گوئی / قصہ گوئی: سننے اور گفتگو میں مہارت حاصل کرنے میں کہانی یا قصہ گوئی کا بہت نمایاں رول ہوتا ہے۔ فاکس نے (1993) اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کیا ہے کہ کم عمر بچے کہانی گوئی کے ذریعہ اپنی زبان کی ساختوں کو خود اعتمادی کے ساتھ منظّم کر سکتے ہیں۔ کہانی گوئی کے ذریعہ طلباء با ترتیب اور مقفّیٰ زبان کو جذب کرتے ہیں جس سے آگے چل کر ان کی زبان کے استعمال میں وسعت ہوتی ہے۔ طلباء کو کہانیاں سنانے سے وہ ایک فعال اور اچھے سامع بن سکتے ہیں۔ کہانی سنانے کے دوران انھیں کہانی کے کرداروں اور واقعات کے تعلق سے اپنے خیالات پیش کرنے کی طرف راغب کیا جائے۔ کہانیوں کے ذریعہ ان میں تخلیقی صلاحتیں پروان چڑھتی ہیں۔ افراد اور کمیونٹیوں کے درمیان کہانیوں کی منتقلی کی زبانی روایت کو سمجھنے میں بھی طلباء کو آسانی ہوتی ہے۔

ذیل میں دیئے گئے کہانی گوئی کے نمونے اُردو کے استاد کے لیے مفید ہوسکتے

ہیں۔

* کمرہ جماعت میں استاد طلباء کو کہانی سناتا ہے یا پھر ریکارڈ شدہ کہانی طلباء اپنے اپنے ہیڈفون کے ذریعہ سنتے ہیں۔طلباء کو اسی کہانی کو اپنے طرز پر اور اپنی زبان میں دہرانے کے لیے کہا جاتا ہے۔

* طلباء کو چند واضح تصویریں ایک مخصوص ترتیب میں دکھائی جاتی ہیں ۔طلباء سے انفرادی طور پر تصویروں کو دیکھ کر کہانی کہنے کے لیے کہا جاتا ہے۔

*استاد کمرہ جماعت میں کوئی لوک کہانی سناتا ہے۔طلباء بغور کہانی سنتے ہیں پھر طلباء کو گول دائرے کی شکل میں بٹھا کر ایک طالب علم سے کہا جاتا ہے کہ وہ کہانی کو ابتداء سے دہرائیں۔کہانی کا کچھ حصّہ مکمل ہونے کے بعد ایک دوسرے طالب علم کو اسی کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے کہا جاتا ہے۔اسی طرح یکے بعد دیگرے تمام طلباء اسی کہانی کو اپنے الفاظ میں دہرانے کے عمل میں حصّہ لیتے ہیں۔

* طلباء کی تخلیقی صلاحیت کو فروغ دینے کے لیے نامکمل کہانی کا طریقہ کار بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔مثلاً کسی جنگل میں سوکھا پڑ گیا۔ بارش نہ ہونے کے باعث تمام ندیاں اور تالاب سوکھ گئے ۔اب جانوروں کو یہ فکر ہوئی کہ وہ اپنی پیاس کس طرح بجھائیں۔بہت غور کرنے کے بعد جانوروں نے طئے کیا کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (یہاں طلباء سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی تجویز پیش کرتے ہوئے کہانی کو مکمل کریں)

ڈرامہ:۔ڈرامہ طلباء کو ایسے خیالی تجربات فراہم کرتا ہے جو حقیقت سے قریب ہوتے ہیں اور جس کے ذریعہ وہ خود اپنی اور دوسروں کی زندگی کو سمجھ سکتے ہیں۔ڈرامہ طلباء کو مختلف

سامعین اور مختلف مقاصد کے لیے بات چیت کرنے کے مختلف اور بہترین مواقع فراہم کرتا ہے خاص طور پر طلباء کو اس کے ذریعہ معیار زبان اور لب ولہجہ میں گفتگو کرنے کی مہارت حاصل ہوتی ہے۔ایسے طلباء جو کھل کر دوسروں سے بات چیت کرنے جھجکتے ہیں ان کے لیے ڈرامہ نہایت قیمتی اثاثہ ثابت ہوتا ہے۔ڈرامہ کے ذریعہ طلباء میں باہمی تعاون سے کام کرنے کے جذبہ کو بھی تقویت ملتی ہے۔

عام طور پر بچے اپنے ابتدائی برسوں میں سماجی ڈرامائی کھیلوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔وہ ڈاکٹر،نرس،دکان دار، والدین، ٹیچر جیسے کردار اختیار کرتے ہوئے اسی مناسبت سے برتاؤ اختیار کرتے ہیں۔ان کرداروں کو ادا کرتے ہوئے فطری طور پر اپنے اطراف کی دنیا میں پیش آنے والے مسائل اور تجربات سے خود کو ہم آہنگ کرتے ہیں۔ لہذا کمرہ جماعت میں اداکاری یا رول پلے کے مواقع فراہم کرتے ہوئے زندگی کے تئیں ان کے شعور اور فکر کی نشو ونما کی جاسکتی ہے۔

اوپر بیان کی گئی سرگرمیاں سماعت وگفتگو کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہوئی ہیں زبان کے اکتسابی عمل کا اگلا مرحلہ، پڑھنے اور مطالعہ کرنے کا ہوتا ہے۔کوئی تحریری عبارت کو دیکھنا، پہچاننا اور پڑھنا مطالعہ کہلاتا ہے۔مطالعہ علم حاصل کرنے کا اہم ذریعہ ہے مطالعہ دراصل علم کے خزانہ کی کنجی ہے۔اگر یہ کنجی ہاتھ آجائے تو گویا خزانہ تک رسائی ہوگئی۔مطالعہ سے طلباء کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے۔وہ نہ صرف نئے نئے الفاظ سے واقف ہوتے ہیں بلکہ الفاظ کے نئے نئے استعمالات سے بھی واقف ہوتے ہیں۔

مطالعہ کی اسی اہمیت کے پیش نظر زبان کے استاد کے لیے ضروری ہے کہ

ابتدائی جماعتوں سے ہی طلباء میں پڑھنے کی مہارت کوفروغ دیتے ہوئے مطالعہ کی عادت پیدا کرے طلباء کومختلف متون جیسے فکشن، سائنسی وعلمی مضامین،طنز ومزاح ، روئیدادیں،تبصرے،تنقیدی وتحقیقی مضامین وغیرہ فراہم کیے جانے چاہئیں۔

ابتدائی جماعتوں میں درسی کتب کے علاوہ مختلف موضوعات پر لکھی گئی چھوٹی چھوٹی کہانیاں، حکایات، قصّے ،نظمیں، گیت، پہلیاں، وغیرہ پڑھنے کے لیے دی جائیں تا کہ مطالعہ کے تئیں دلچسپی ہو۔

درج ذیل طریقوں سے طلباء میں ادبی ذوق ، مطالعہ کے تئیں دلچسپی اور بحیثیت قاری ان میں خوداعتمادی اورآزادی کوفروغ دیا جاسکتا ہے۔

* کمرہ جماعت میں چھوٹے بچوں کے گروپ کو میز کے اطراف بٹھایا دیا جائے۔میز پر بچوں کے لیے دلچسپ ودلکش کتابیں رکھ دی جائیں۔طلباءکوان کتابوں سے اپنی پسند کی کوئی کتاب منتخب کرکے اپنے گروپ کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر پڑھنے کے لیے کہا جائے۔

*ثانوی جماعت کے طلباءکوان کی دلچسپی کے لحاظ سے کتاب دی جائے تا کہ وہ اپنے گھر پر فاضل اوقات میں اس کا مطالعہ کریں۔کتاب پڑھ کر ہر طالب علم کواس پر آزادانہ تبصرہ پیش کرنے کے لیے کہا جائے۔

زمانہ کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ ساتھ انسان نے محسوس کیا کہ اپنے خیالات و احساسات کوصرف زبان کے ذریعہ ہی ظاہر نہیں کیا جاسکتا بلکہ کچھ اورشکل بھی ہونی چاہیے۔چناں چہ پہلے تصویر کی صورت میں پھر آواز اورلفظوں کی شکل میں اس نے تحریر کی

ابتداء کی۔ابتدائی زمانے میں ایک استاد کولکھنا سکھانے میں بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔دراصل یہ ایک صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔

لکھنے کے عمل کودرج ذیل مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

خیالات پیدا کرنا۔منصوبہ بنانا۔مسودہ تیار کرنا۔نظرثانی کرنا۔ایڈٹ کرنا۔

اس پورے عمل میں طلباءکواستاد کامکمل تعاون حاصل ہونا چاہیے تا کہ وہ لکھنے کی مہارت پرعبور حاصل کریں۔

خصوصی ضروریات کے حامل بچوں کی اکتسابی سہولیات

اس مقالہ میں اب تک جوبھی مسائل وتجاویز پیش کی گئیں وہ عام بچوں کومدنظر رکھ کرکی گئی ہیں۔ ہر جماعت میں لازمی طور پر ایسے بچے ہوتے ہیں جومختلف دلچسپیوں، صلاحتیوں، ذاتی خصوصیات،خوبیوں اورضروریات کے حامل ہوتے ہیں۔ایک معلم کے لیے اس حقیقت کوقبول کرنا ضروری ہے۔اس کے علاوہ ایک معلم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ تمام بچوں کو ایک ایسا مثبت ماحول فراہم کرے جہاں ان کی انفرادیت کی قدر کی جاتی ہے اور بچوں کوتفرقات کا احترام کرنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔مختلف ضروریات کے حامل بچوں میں سماجی، جذباتی،حسّاسی ،جسمانی اورذہنی عوامل سے متعلق کم تر اورشدید دونوں نوعیت کے بچوں کے علاوہ ذہین وفطین بچے بھی شامل ہوتے ہیں ایسے تمام بچوں کومعلومات،مہم اور دیگر لسانی مہارتوں کوفروغ دینے کی ممکنہ حدتک حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔کیوں کہ لسانی مہارتوں کے ذریعہ ہی وہ دوسرے مضامین اورعلوم تک رسائی کے قابل ہوسکیں گے۔

بچوں میں پائے جانے والے امتیازات وتفرقات کوملحوظ رکھتے ہوئے تمام کو یکساں طور پر تعلیمی عمل میں مشغول رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مدارس میں عام طور پر بچوں کوان کی صلاحیتوں کی بنیاد پر گروپوں میں تقسیم کرنے کا رواج پایا جاتا ہے۔انھیں اسی مناسبت سے سرگرمیاں بھی دی جاتی ہیں۔صلاحیتوں پر مبنی گروپ بندی میں یہ خطرہ رہتا ہے کہ جو بچے کم تر صلاحیت والے گروپ میں ہوتے ہیں ان کی خود اعتمادی اور محرکہ کو ٹھیس پہنچتی ہے۔اسی لیے بہتر ہے کہ ہر گروپ میں مختلف صلاحیتوں والے طلباء رکھے جائیں تا کہ ان کے باہمی تعاون اور اشتراک سے ایک ہی مقصد کے لیے کام کرنے کے جذبہ سے وہ مطمئن ہوں۔

جو بچے سننے اور گفتگو میں مسائل سے دوچار ہوتے ہیں انھیں اکتسابی سہولیات فراہم کرنے کے لیے ذیل میں تجاویز پیش کی جارہی ہیں۔

وہ بچے جن کی سماعت متاثر ہوتی ہے وہ سبق کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے پاتے ،مواد مضمون کی بازآفرینی کے قابل نہیں ہوتے اور سبق کے دوران مسلسل دخل اندازی کرتے ہیں۔اس قسم کے مسائل سے نمٹنے کے لیے معلم کو چاہیے کہ وہ واضح ،سہل اور سادہ الفاظ میں سبق کی توضیح وتشریح کرے ،ان بچوں کی توجہ کو سبق کی جانب مرکوز کرنے کے لیے سمعی وبصری وسائل کا استعمال کرے اور بچوں سے اہم نکات کو دہرائے اوراس طرح سوالات پوچھنے کی طرف راغب کرے۔

جو بچے گفتگو کرنے میں جھجکتے یا انکار کرتے ہیں ان کے ساتھ نرم اور مشفقانہ رویہ اپنانا چاہیے۔ان سے توقعات کو محدود رکھیں۔ابتداء میں ان سے ایسے سوالات کیے

جائیں جن کا جواب ،ہاں'' یا ''نا'' ہو، پھر بتدریج طویل جوابات دینے کی طرف رہنمائی اور حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔

کئی طلباء ایسے ہوتے ہیں جو وضاحت سے گفتگو نہیں کر پاتے یعنی ان کے مخارج اور الفاظ صحیح ادا نہیں ہوتے۔ایسے بچوں میں نظموں اور مقفّیٰ لفظوں کے کھیلوں کے ذریعہ صوتی شعور کو فروغ دیا جائے اور مخصوص آوازوں کے نکالنے کے لیے منہ اور زبان کی حرکات بتائی جائیں۔اس عمل کو ماڈلنگ (Modelling) کہتے ہیں۔

مطالعہ سے متعلق بچوں میں عام طور پر کچھ اس طرح کے مسائل ہوتے ہیں مطالعہ کے تئیں عدم دلچسپی ورغبت ،خود اعتمادی کی کمی ،مفہوم اخذ کرنے کے قابل نہ ہونا،حروف کی شناخت نہ کر پانا اور صوتی مہارتوں کی عدم قابلیت۔ان مسائل سے دوچار بچوں میں مطالعہ کی عادت کو درج ذیل طریقوں سے فروغ دیا جاسکتا ہے۔

آسان اور عام فہم انداز میں دلچسپ کہانیاں اور موضوعاتی کتب خاص طور پر ان بچوں کے لیے لکھی جائیں اور مطالعہ کے لیے انھیں فراہم کی جائیں۔

مختلف کتابوں کے متن کو معلم کی جانب سے بہ آواز بلند کمرہ جماعت میں پابندی سے پڑھا جائے تا کہ ان میں دلچسپی پیدا ہو۔

ابتدائی سالوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ بچے لکھنے کے تعلق سے بے رغبتی رکھتے ہیں اس قسم کی صورت حال جسمانی پہلوؤں جیسے قلم پر کنٹرول ،حروف تہجی لکھنے ، ہینڈ رائٹینگ املا وغیرہ کی مشکلات یا خیالات کو صفحہ پر لانے کی مشکل کی وجہ سے پیدا ہوسکتی ہے۔جن بچوں میں لکھنے کے تئیں عدم دلچسپی اور خود اعتمادی کا فقدان پایا جائے انھیں

ماڈلنگ، بے ہنگم تحریریں، جوڑی بنا کر گروپ بنا کر لکھنے کے کام تفویض کر کے اور ان کی کوششوں کی حوصلہ افزائی کر کے سہولیات فراہم کی جاسکتی ہیں۔

بعض بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی ہینڈ رائٹینگ بہت ہی ناقص اور کمزور ہوتی ہے۔ ایسے بچوں کو الفاظ لکھنے کی خصوصی مشق کرائی جائے، انھیں رواں چلنے والے رولر بال پن استعمال کے لیے دیئے جائیں لکھنے کے دوران صحیح پوسچر، صحیح حرکات اور قلم کو صحیح پکڑنے کی بار بار ترغیب دی جائے۔

بعض بچوں کو کسی موضوع پر مضمون لکھنے کے دوران خیالات مجتمع کرنے اور انھیں مناسب ترتیب دینے میں دقت پیش آتی ہے وہ اپنے خیالات کو قائم کرنے اور انھیں پیش کرنے میں مسلسل کوشش کرتے ہیں اس کے باوجود ان کی تحریر بے معنی اور کوششیں لاحاصل ہوتی ہیں۔ ان بچوں کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے ذیل کی تجاویز فائدہ مند ثابت ہوسکتی ہیں۔

* لکھنے سے قبل کمرہ جماعت میں دیئے گئے عنوان یا موضوع پر مباحثہ کرایا جائے۔

* گروپ بنا کر یا جوڑی بنا کر لکھنے کا کام تفویض کیا جائے۔

* گفتگو، خاکوں، اشکال اور تصاویر کے ذریعہ پلاننگ کی جائے۔

* مواد مضمون کی مناسب تفہیم وتشریح کی جائے۔

جن بچوں کو صحیح املا لکھنے میں دشواریاں پائی جاتی ہیں انھیں مخصوص مشکل الفاظ کی مشق کروائی جائے، عام طور پر بچوں کے لیے مشکل الفاظ کی نشاندہی کی

جا کر ایک فہرست یا کتاب ترتیب دی جائے تا کہ لکھتے وقت بچے اس سے مدد لے سکیں۔

یہ بات خاص طور پر ذہن نشین رکھنی چاہئیے کہ املا پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے بچوں میں لکھنے کے تئیں پست ہمتی آجاتی ہے لہذا اس سے معلمین کو اجتناب کرنا چاہیے۔

پڑھنے اور لکھنے کے ان مسائل میں ایک خاص مسئلہ ڈیلکزیا (Dyslexia) کا ہوتا ہے اس مسئلہ سے متاثرہ بچوں میں مختلف علامتیں پائی جاتی ہیں مثلاً الفاظ سمجھنے اور لکھنے میں مشکلات، حافظہ کے مسائل، حرکی مہارتوں میں دشواری وغیرہ۔ ڈیلکزیا سے متاثرہ بچے بہت ہی قابل، تخلیقی صلاحیت اور تخیلی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں اور زبانی کام میں بھی بہتر ہوتے ہیں لیکن انھیں تحریری زبان کے استعمال چاہے وہ لکھنے کی ہو یا پڑھنے کی، مشکلات پیش آتی ہیں۔ وہ تحریری عبارتوں کو پڑھنے اور لکھنے میں کمزور ہوتے ہیں، با آواز بلند پڑھنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں، الفاظ کی املا یاد نہیں رکھ پاتے، لکھنے کے دوران یا تو الفاظ کو حذف کر دیتے ہیں یا اضافہ کر دیتے ہیں، الفاظ یا حروف کو الٹی شکل میں دیکھتے ہیں ایک ہی لفظ کو مختلف املا میں لکھتے ہیں الفاظ اور حروف کی غیر موزوں ترتیب کرتے ہیں۔ اس مسئلہ کے حل کے لیے معلمین کے لیے درج ذیل تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔

* تختہ سیاہ سے متن کو نقل کرنے کے بجائے ایسے بچوں کو ان کی ساتھیوں کی مدد لینے کہا جائے۔

* زبانی ہدایات کے بجائے ہدایات کو ٹیپ ریکارڈ میں ریکارڈ کریں۔

*بصری وسائل اور دیگر حکمت عملیوں کا استعمال کریں۔

* تحریری عبارتوں پر زیادہ انحصار کرنے کے بجائے تصاویر، خاکوں، چارٹ، پوسٹرز وغیرہ پر زیادہ زور دیں۔

*اہم نکات، اہم الفاظ کے سیکھانے پر زیادہ توجہ دیں۔

* ڈیلکزیا سے متاثر بچوں کے لیے خاص طور پر تیار کیے گئے سافٹ ویر اور سمعی وبصری وسائل دستیاب ہیں۔ استعمال کو فروغ دیا جائے۔

غرض اس پورے مقالہ میں زبان کی تدریس سے متعلق اِن پہلوؤں اور مسائل پر توجہ دی گئی ہے جو کہ عام طور پر نظر انداز کر دیے جاتے ہیں لیکن ان کی وجہ سے اُردو زبان کی موثر تدریس متاثر ہوتی ہے۔ جو تجاویز پیش کی گئی ہیں وہ تمام ترسیلی نوعیت کی ہیں اور انھیں اُردو معلمین کمرہ جماعت میں استعمال کرتے ہوئے تدریس کے دوران پیش آنے والے مسائل اور چیلنجس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم کا منظر نامہ

پروفیسر ایس۔اے۔وہاب قیصر
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

اردو زبان اور اردو ذریعہ تعلیم پر ملک کی آزادی کے خاطر خواہ اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ ملک کی تقسیم اور اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دینا اس پر بجلی گرانے کا موجب بنا۔ چناں چہ سرکاری زبان کے معاملہ میں اردو کو نظر انداز کر دیا گیا۔ دوسرے اردو ذریعہ تعلیم رکھنے والی ملک کی واحد یونیورسٹی، جامعہ عثمانیہ کا ذریعہ تعلیم انگریزی قرار دیا گیا۔ لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تنظیم جدید نے تو اس زبان پر کاری ضرب لگائی۔ سوائے جموں اور کشمیر کے ملک کی کسی بھی ریاست میں اردو کے لیے گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ ریاستی تنظیم نو کے بعد ہر ریاست نے اپنی اپنی سرکاری زبان کے فروغ کے لیے جہاں کئی ایک اقدامات کیے وہیں ذریعہ تعلیم کے لیے اپنی ہی سرکاری زبان کو ترجیح دی۔ ریاستی حکومتیں اپنے دفاتر میں ملازمت کے لیے انہی نوجوانوں کا انتخاب کرنے لگیں جو وہاں کی سرکاری زبان میں مہارت رکھتے ہوں یا سرکاری زبان میں تعلیم حاصل کیے ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ریاست میں وہاں کی سرکاری زبان میں تعلیم دینے والے

اسکولوں اور کالجوں کی بھرمار ہوگئی۔جن میں داخلہ لینا اردو مادری زبان رکھنے والے طلبہ کی مجبوری بن گئی۔ پہلے سے قائم شدہ اردو میڈیم اسکولوں میں طلبہ کی گھٹتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ان اسکولوں کی تعداد میں بھی تخفیف ہوتی گئی۔ البتہ کہیں کہیں اردو والوں کی کامیاب نمائندگی کی بدولت ابتدائی سطح پر اردو میڈیم کی متوازی جماعتوں کا انتظام کیا گیا۔ ریاست جموں وکشمیر جس کی سرکاری زبان اردو قرار دی گئی وہاں پر اردو میڈیم کی صرف ابتدائی جماعتوں سے آٹھویں جماعت تک کی تعلیم کا انتظام رہا۔ ماضی میں اردو کے گہوارے کے طور پر شہرت رکھنے والی ریاست اتر پردیش میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی واحد درس گاہ ہے جس میں ہائی اسکول تک اردو ذریعہ تعلیم رائج ہے' جب کہ پوری ریاست میں چند مڈل اسکول ہیں جہاں اردو میڈیم کی جماعتوں کا انتظام ہے۔کئی ایک ریاستیں ایسی ہیں جہاں پر سرکاری اور خانگی سطح پر بارہویں جماعت تک اردو میں تعلیم کا انتظام ہے۔ان میں آندھراپردیش' مدھیہ پردیش' مہاراشٹرا' دہلی اور مغربی بنگال کی ریاستیں شامل ہیں۔ ریاست بہار اور کرناٹک میں صرف دسویں جماعت تک اردو میں تعلیم دی جاتی ہے۔ راجستھان اور ہریانہ میں چند پرائمری اسکول ہیں جہاں پر اردو میڈیم جماعتوں کا انتظام ہے۔ جب کہ گجرات میں بھی صرف احمد آباد میں اردو میڈیم کے دو سکنڈری اسکولس قائم ہیں۔

ہندوستان میں آندھراپردیش ملک کی واحد ریاست ہے جہاں مولانا آزاد

نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام سے پہلے ہی چند یونیورسٹیوں کے ملحقہ کالجوں میں اردو میڈیم میں گریجویشن کی تعلیم دی جاتی رہی ہے۔حیدرآباد میں خاصی تعداد میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ملحقہ کالجس ہیں جہاں پر اردو میڈیم میں تعلیم کا انتظام ہے۔ چناں چہ 1971ء سے ممتاز کالج میں بی ایس سی اور انوارالعلوم کالج میں بی۔اے اور بی۔کام میں اردو میڈیم کی متوازی جماعتوں کا انتظام کیا گیا جس سے اردو میڈیم کے طلبہ استفادہ کررہے ہیں۔اردو آرٹس ایوننگ کالج میں 1962ء سے بی اے میں اور 1971ء سے بی۔کام کی تعلیم اردو میں دی جارہی ہے۔حسینی علم گورنمنٹ ڈگری کالج فارویمن 1984ء سے لڑکیوں کو اردو میں بی۔اے اور بی۔کام کی تعلیم دے رہا ہے۔ اندرا پریہ درشنی گورنمنٹ ڈگری کالج فارویمن میں 1980ء سے اور اسلامیہ ڈگری کالج فارویمن میں 1998ء سے بی۔اے اور بی۔کام کی اردو جماعتوں کا انتظام ہے جن میں خاصی تعداد میں لڑکیاں تعلیم حاصل کررہی ہیں۔حیدرآباد ہی میں قائم اندرا پریہ درشنی گورنمنٹ پی جی کالج فارویمن ملک کا واحد کالج ہے جہاں پر 2001ء سے لڑکیوں کے لیے اردو میڈیم میں ایم۔اے (اکنامکس) کی تعلیم دی جارہی ہے۔آندھراپردیش میں ورنگل کے مقام پر کاکتیہ یونیورسٹی سے ملحقہ اسلامیہ آرٹس اینڈ سائنس کالج 1972ء میں قائم ہوا تھا جس میں اردو میڈیم میں بی۔اے' بی۔ایس اور بی کام کی تعلیم کا انتظام ہے۔رائل سیما سے تعلق رکھنے والے مقام کڑپہ میں گورنمنٹ ڈگری کالج فار مین 1973ء میں قائم کیا گیا

جس میں اردو میں بی ۔ اے کی جماعتوں کا انتظام ہے ۔ اس کالج میں 2003ء میں کمپیوٹر اپیلیکشن کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے شامل کیا گیا ۔ یہ کالج تروپتی یونیورسٹی سے الحاق رکھتا ہے ۔ اسی یونیورسٹی سے ملحقہ گورنمنٹ ڈگری کالج رائے چوٹی 2002ء سے بی ۔ اے کی اردو میڈیم جماعتوں کا انتظام کررہا ہے ۔ جہاں پر کمپیوٹر اپیلی کیشن کو 2005ء میں اختیاری مضمون کے طور پر داخل نصاب کیا گیا ۔ آندھراپردیش کے ضلع کرنول میں نندیال کے مقام پر نیشنل ڈگری کالج قائم ہے ۔ جہاں 1982ء سے اردو میڈیم میں بی اے کی تعلیم دی جارہی ہے جس میں تاریخ ' سیاسیات اور نظم ونسق عامہ جیسے مضامین پڑھائے جاتے ہیں ۔ حیدرآباد میں قائم کی گئی ملک کی پہلی اوپن یونیورسٹی جو بی ۔ آر ۔ امبیڈکر اوپن یونیورسٹی کے نام سے شہرت رکھتی ہے اس کے تحت فاصلاتی تعلیم میں 1994ء سے اردو میں بی ۔ اے اور بی ۔ ایس سی کی متوازی جماعتوں کا انتظام ہے ۔ اس یونیورسٹی کا دائرہ کار پوری ریاست آندھراپردیش ہے جس کے چھوٹے بڑے شہروں میں قائم اسٹڈی سنٹروں پر طلباوطالبات جماعتوں میں شرکت کرتے ہیں ۔

1998ء میں پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت جب مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام حیدرآباد میں عمل میں آیا تو گویا کہ اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم کے لیے سارے ملک میں دروازے کھل گئے ۔ چناں چہ یونیورسٹی کے قیام سے اب تک دس سال کے عرصے میں فاصلاتی تعلیم کے تحت اردو میں بی ۔ اے ' بی ۔ کام اور بی ۔ ایس سی کورسس ترتیب وار

1999,1998 اور 2000ء میں شروع کیے گئے ۔ جب کہ پوسٹ گریجویشن میں ایم ۔ اے (اردو) 2004ء میں ' ایم ۔ اے (تاریخ) 2005ء میں اور ایم ۔ اے (انگریزی) 2006ء میں شروع کیا گیا ۔ اردو یونیورسٹی کا قیام گویا اردوداں طبقے کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر تھا ۔ اس کے مختلف کورسوں میں تیزی سے داخلے ہونے لگے ۔ ابتدا میں اس کے صرف 18 اسٹڈی سنٹرس تھے اور پچھلے دس سال میں ملک کی 17 ریاستوں میں اسٹڈی سنٹرس کی تعداد بڑھتے بڑھتے 140 تک پہنچ گئی جہاں بی ۔ اے ' بی ۔ ایس سی ' بی ۔ کام اور ایم ۔ اے میں ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ طلبا اور طالبات تعلیم حاصل کررہے ہیں ۔

یہاں تک کہ شہر جدہ میں گزشتہ سال 2007ء میں ایک امتحانی مرکز قائم ہوچکا ہے اور یہاں کے طلبہ پہلے سال کا امتحان دے چکے ہیں ۔ قوی امید ہے کہ آنے والے برسوں میں یو اے ای ' برطانیہ اور امریکہ کے مختلف شہروں میں اپنے اپنے امتحانی مراکز پر طلبا وطالبات مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے امتحانات لکھ رہے ہوں گے ۔ ملک کی ریاستوں میں فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن میں پچھلے دس سال کے عرصے میں داخلہ لینے والوں کی تعداد کا جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ گریجویشن میں سب سے زیادہ طلبہ ریاست مہاراشٹر میں اور پوسٹ گریجویشن میں آندھراپردیش میں زیرتعلیم ہیں ۔ گریجویشن میں دوسرے نمبر پر آندھراپردیش اور پوسٹ گریجویشن میں

جموں وکشمیر کا مقام آتا ہے۔ تیسرے مقام پر گریجویشن میں جموں وکشمیر اور پوسٹ گریجویشن میں مہاراشٹر ہے۔ اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے والی ریاست بہار کا مقام گریجویشن میں پانچواں اور پوسٹ گریجویشن میں چوتھا ہے۔

فاصلاتی نظام تعلیم کے بارے میں اکثر یہ خیال عام ہے کہ اس نظام سے وہی لوگ استفادہ کرتے ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے طالب علمی کے زمانے میں تعلیم منقطع کر چکے ہوں اور اپنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے فاصلاتی تعلیم کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں گریجویشن کی تکمیل کے لیے داخلہ لینے والوں میں ڈراپ آؤٹس کے علاوہ کثیر تعداد میں وہ نوجوان طلبہ بھی استفادہ کرتے ہیں جو بارہویں جماعت یا اس کے مماثل کوئی امتحان کامیاب کرنے کے بعد اپنے تعلیمی سلسلہ کو قائم رکھنے سے اس لیے قاصر رہتے ہیں کہ انھیں اپنی ریاست میں اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے مواقع نہیں رہتے۔ دینی مدارس کے وہ فارغ التحصیل بھی ان میں شامل ہو جاتے ہیں جن کے صداقت نامے بارہویں کے مماثل قرار دیے جاتے ہیں۔ چناں چہ اردو یونیورسٹی میں ڈراپ آؤٹس کو اہلیتی امتحان کی کامیابی پر اور بارہویں کامیاب یا اس کے مماثل سرٹی فیکیٹ رکھنے والوں کو راست داخلہ ملتا ہے۔ یونیورسٹی کے قیام سے اب تک دس سال میں اہلیتی امتحان کے ذریعہ اور راست داخلہ لینے والوں کا سال واری فیصد کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے سال 1998ء

میں سب سے زیادہ تعداد میں ڈراپ آؤٹس نے داخلہ لیا تھا جو جملہ داخلہ لینے والوں کی تعداد کا 70 فیصد تھا۔ رفتہ رفتہ داخلہ لینے والوں میں ڈراپ آؤٹس کا فیصد گھٹتا گیا اور بارہویں یا اس کے مماثل سرٹی فیکیٹ رکھنے والوں کا فیصد بڑھتا گیا۔ چناں چہ 2007ء میں ڈراپ آؤٹس کے داخلہ لینے والوں کی تعداد کا فیصد گھٹ کر 23 فیصد رہ گیا جب کہ بارہویں جماعت یا اس کے مماثل کورس کامیاب کرنے والوں کی تعداد کا فیصد 77 ہو گیا۔

پورے ملک کے اسٹڈی سنٹروں سے حاصل کردہ اطلاعات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے فارغ گریجویٹس کی ایک بڑی تعداد مختلف مضامین میں ایم۔اے، بی۔ایڈ، ایم۔بی اے اور ایل۔ایل بی جیسے کورسس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ وہ گریجویٹس جو پہلے سے ملازمت کر رہے تھے ان میں سے کئی لوگوں نے ڈگری کی بدولت ترقی پائی۔ اچھی خاصی تعداد ایسے گریجویٹس کی بھی ہے جن کی ڈگریاں ملازمت کے حصول میں کام آئیں۔ گھریلو خواتین اور بڑی عمر کے حضرات یا تو یونیورسٹی کے ایم۔اے فاصلاتی تعلیم میں داخلہ لیے یا گریجویشن کی ڈگریوں کے حصول کے بعد مطمئن ہو کر گھر بیٹھ گئے کہ انھوں نے گریجویشن کی تکمیل کر لی۔

پروفیسر اے۔ایم پٹھان نے جب 2004ء میں وائس چانسلر کا جائزہ حاصل کیا تو اس کے ساتھ ہی اردو یونیورسٹی میں کیمپس ایجوکیشن کا آغاز ہوا۔ ورنہ 2001ء

سے یہاں کیمپس میں صرف ایک سالہ ڈپلوما ان ایجوکیشن کورس میں 75 سیٹوں پر داخلہ دیا جاتا تھا۔ انٹرمیڈیٹ کامیاب لڑکے اور لڑکیاں اس کورس میں داخلہ لیتے اور اس کی تکمیل کے بعد سرکاری اور خانگی ایلمنٹری اسکولوں میں ملازمتیں حاصل کرتے۔ یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔

کیمپس میں روایتی انداز سے اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے مختصر مدت میں کئی سنگ میل طے کیے ہیں۔ یہاں پوسٹ گریجویشن کے جو بھی کورسس شروع کیے گئے اس میں انگریزی کے ایک پرچے کے علاوہ کمپیوٹر اپلی کیشن کا پرچہ داخل نصاب رہا تاکہ اردو میڈیم میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ دوسرے میڈیم میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ سے ہر میدان میں مسابقت کرسکیں۔ 2004ء میں یہاں ایم۔بی۔اے کورس شروع کیا گیا جس میں 40 سیٹوں کے لیے انٹرنس امتحان میں کامیابی پر داخلہ دیا جاتا ہے۔ اس کورس میں کمپیوٹر اپلی کیشن کے علاوہ انفارمیشن ٹکنالوجی کا ایک پرچہ بھی شامل کیا گیا۔ ابتدا میں طلبہ کو اردو کے اس کورس کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا اس لیے دو سال میں صرف 37 طلبہ ہی نے داخلہ لیا۔ جب اس کورس میں کامیابی حاصل کرنے والے 31 پوسٹ گریجویٹس مختلف کمپنیوں میں روزگار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو اس کورس کی مانگ کافی بڑھ گئی اور بعد کے دو سال 2006ء اور 2007ء میں پوری 40,40 سیٹیں پُر ہوگئیں اور کئی طلبہ کو داخلے سے

محروم ہونا پڑا۔ یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ ایم۔بی۔اے کے ان تمام داخلوں میں اردو یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے والے 15 طلبہ شامل رہے ہیں۔ اطلاعات کے مطابق ایم۔بی۔اے کے تین طلبہ کو کمپنیوں سے ملازمت کا پیش کش اس وقت کیا گیا جب کہ وہ ابھی چوتھے سمسٹر کی تعلیم حاصل کررہے تھے۔ مزید اطلاعات کے مطابق ایم۔بی۔اے تیسرے بیچ کے طلبہ نے فائنل امتحان مئی 2008ء میں دیا ہے اور امتحان ختم ہونے کے دوسرے ہی دن مختلف کمپنیوں نے ان کا انٹرویو لیا جن میں سے HDFC نے 14 طلبہ کو Sales Executive کے طور پر ICICI بینک نے 7 طلبہ کو اور مناٹی وی چینل نے دو لڑکوں کو ملازمت کے لیے انتخاب کرلیا ہے۔

یونیورسٹی میں ایم۔اے' ماس کمیونی کیشن اینڈ جرنلزم (MCJ) کا کورس بھی 2004ء میں شروع ہوا۔ داخلہ کے لیے 20 سیٹیں مختص کی گئیں۔ پچھلے چار سال میں 55 طلبہ نے اس کورس میں داخلہ لیا۔ ابتدائی دو بیچس کے جملہ 23 لڑکے لڑکیوں نے امتحان کامیاب کیا اور ان میں کئی طلبہ اس وقت اردو اخبارات اور ٹی وی چینلس میں روزگار سے جڑے ہوئے ہیں۔ حالیہ اطلاع کے مطابق تیسرے بیچ کے طلبہ جو مئی 2008ء میں اپنا امتحان لکھے ہیں ان میں 6 طلبہ کو نتیجے کے اعلان سے قبل ہی ای ٹی وی اردو چینل میں ملازمت کے لیے منتخب کرلیا گیا ہے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ایکٹ میں خواتین کی تعلیم کو خاص اہمیت

دی گئی ہے۔اس کی تکمیل کے لیے یہاں 2005ء میں تعلیم نسواں (ویمن ایجوکیشن) کا شعبہ قائم کیا گیا جس کے تحت نہ صرف ایم۔اے کی تعلیم دی جاتی ہے بلکہ ویمن ایجوکیشن میں ایم۔فل اور پی ایچ ڈی تک کا انتظام کیا گیا ہے۔پچھلے تین سال میں ایم۔اے میں 49 اور ایم۔فل میں 21 طلبہ نے داخلہ لیا جبکہ گیارہ اس کالرس اس مضمون میں پی ایچ ڈی کررہے ہیں۔ تعلیم نسواں کے بارے میں عام تصور یہ پایا جاتا ہے کہ اس میں صرف خواتین ہی دلچسپی رکھتی ہیں لیکن یہاں پر تعلیم حاصل کرنے والوں میں مرد بھی شامل ہیں۔چناں چہ تعلیم نسواں میں اب تک ایم۔اے میں 9 'ایم فل میں 4 اور پی ایچ ڈی میں تین لڑکوں نے داخلہ لیا ہے۔

انگریزی سے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں ترجمے کے لیے تعلیم یافتہ مترجمین کی ہمیشہ ہی کمی محسوس کی جاتی رہی ہے۔اس کمی کو دور کرنے کے لیے اردو یونیورسٹی نے 2006ء میں ایم۔اے (ٹرانسلیشن) کا کورس شروع کیا۔جس کے لیے 15 سیٹیں متعین کی گئی ہیں۔پچھلے دو سال میں اس کورس میں 27 طلبہ داخلہ لے چکے ہیں اور تعلیم حاصل کررہے ہیں۔اسی طرح پبلک ایڈمنسٹریشن میں ایم۔اے کی تعلیم کا 2006ء سے انتظام کیا گیا اور دو سال میں 38 گریجویٹس نے اس کورس میں داخلہ لیا اور زیر تعلیم ہیں۔اسی سال 2008ء سے پبلک ایڈمنسٹریشن میں ایم۔فل اور پی ایچ ڈی میں داخلے دیے جائیں گے۔

انفارمیشن ٹکنالوجی کی فی زمانہ اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اردو یونیورسٹی نے 15 سیٹوں پر داخلوں کے ساتھ ایک سالہ پی جی ڈپلوما ان انفارمیشن ٹکنالوجی کورس 2005ء میں شروع کیا اور اب تک 30 گریجویٹس نے اس میں داخلہ لیا ہے۔جن میں سے 14 طلبہ اس کورس میں کامیاب ہوئے ہیں۔ان میں سے چند ملازمت اختیار کرچکے ہیں اور چند اس میدان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ 2006ء میں داخلہ لینے والے 15 طلبہ نے ابھی ابھی امتحان لکھا ہے۔آنے والے سال اس شعبہ کے تحت ایم۔ایس سی (انفارمیشن ٹکنالوجی) کا کورس بھی شروع ہونے والا ہے۔اس کے علاوہ اردو یونیورسٹی مستقبل قریب میں پالی ٹکنیک کالج اور فارمیسی کالج کے قیام کا ارادہ رکھتی ہے۔امید ہے کہ یہ دونوں کالجس بہت جلد اردو میڈیم میں تعلیم کا انتظام کریں گے۔

حالیؔ ہ عرصے میں سارے ملک کے اردو مدارس میں تربیت یافتہ اساتذہ کی بڑی شدت کے ساتھ کمی محسوس کی گئی۔ان کی اس زبردست مانگ کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے نہ صرف یونیورسٹی کیمپس میں بی۔ایڈ کالج قائم کیا بلکہ سری نگر' بھوپال اور دربھنگہ میں کالجس قائم کیے گئے جہاں ایک سالہ بی۔ایڈ کورس میں داخلوں کے لیے 100,100 سیٹوں پر داخلے دیے گئے۔کیمپس اور سری نگر کے کالجوں میں 2005ء سے اور بھوپال اور دربھنگہ کے کالجوں میں 2007ء سے درس و تدریس کا انتظام کیا گیا۔انٹرنس امتحان کی بنیاد پر ان کالجوں میں اردو یونیورسٹی کے قابل

قدر تعداد میں گریجویٹس کو بھی ٹریننگ کے لیے داخلہ مل سکا۔ دوسال کے عرصے میں کیمپس کالج میں 181 اور سری نگر کالج میں 145 ٹرینز نے کورس کی تکمیل کی جن میں سے بیشتر تربیت یافتہ گریجویٹس مختلف ریاستوں میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

اردو یونیورسٹی کیمپس میں سال 2007ء میں ایم۔ایڈ کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا۔اس کورس میں بی۔ایڈ کامیاب 25 امیدواروں کو انٹرنس امتحان کی بنیاد پر داخلہ دیا گیا جس میں 21 طلبا ایسے ہیں جنھوں نے اردو یونیورسٹی ہی سے بی۔ایڈ کی تکمیل کی تھی۔اسی سال 2008ء میں یہاں ایجوکیشن میں پی ایچ ڈی کے لیے بھی داخلے دیے جارہے ہیں۔

اردو یونیورسٹی نے 2006ء میں اردو میڈیم ہائی اسکولوں کو تربیت یافتہ اساتذہ کی فراہمی کے لیے اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (اگنو) کے ساتھ مل کر فاصلاتی طرز پر دوسالہ بی۔ایڈ کورس کا ایک مشترکہ ڈگری پروگرام شروع کیا۔ یہ کورس ملک میں یونیورسٹی کیمپس، حیدرآباد، سکندرآباد، کرنول، بنگلور، اورنگ آباد، بھوپال، لکھنؤ، دہلی اور پٹنہ میں دس بی۔ایڈ کالجوں میں شروع کیا گیا۔ ہر کالج میں 100 سیٹوں کے لحاظ سے ہزار ایسے غیر تربیت یافتہ زیر ملازمت ٹیچروں کو داخلہ دیا گیا جو کسی بھی ریاستی حکومت کے منظور شدہ اسکول میں دوسال کا تدریسی تجربہ رکھتے تھے۔ان داخلوں کے لیے منتخب

کردہ امیدواروں میں 98 ٹیچر ایسے تھے جنھوں نے اردو یونیورسٹی سے گریجویشن کی تکمیل کی تھی۔کامیابی حاصل کرنے والے ٹرینڈ گریجویٹ کی ایک قابل قدر تعداد نے یا تو ملازمت میں ترقی پائی یا انہیں ہائی اسکولوں میں ملازمت ملی۔2008ء میں یونیورسٹی نے اگنو کے ساتھ جوائنٹ ڈگری پروگرام کو ختم کرتے ہوئے فاصلاتی طرز پر اپنا ہی بی۔ایڈ کورس سات شہروں حیدرآباد، سکندرآباد، بنگلور، پونے، دربھنگہ، جموں، سری نگر اور دربھنگہ کے کالجوں میں شروع کیا۔داخلوں کا مرحلہ ختم ہو چکا ہے اور بہت جلد یہاں تعلیم و تربیت شروع ہو جائے گی۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے علاوہ ملک میں بی۔ایڈ اردو میڈیم کی جو صورت حال ہے وہ بڑی سنگین ہے۔آندھرا پردیش میں عثمانیہ کالج آف ایجوکیشن کرنول جس کو نومبر 1993ء میں قائم کیا گیا تھا اور جو کرشنا دیورائے یونیورسٹی سے الحاق رکھتا ہے اس میں 50 سیٹوں کی حد تک داخلے دیے جاتے ہیں جہاں مکمل تعلیم اردو میڈیم میں ہوتی ہے۔اسی ریاست میں گنٹور سے قریب ایک مقام پر بسوا تارک راما کالج آف ایجوکیشن کا قیام 1994ء میں عمل میں آیا جس میں 100 سیٹوں کے لیے داخلہ دیا جاتا ہے اور بی۔ایڈ کی تعلیم اردو میڈیم میں دی جاتی ہے۔گنٹور ہی سے قریب ایک بی۔ایڈ کالج جس کا نام HMKS & MGSM کالج آف ایجوکیشن ہے 2001ء سے انگریزی میڈیم میں تعلیم دے رہا ہے۔اس کالج میں 2007ء سے 50 طلبہ کے لیے

اردو میڈیم کی متوازی جماعتوں کا انتظام کیا گیا ہے۔عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے متعلقہ اورملحقہ بی۔ایڈ اورایم۔ایڈ کالجس میں تعلیم تو انگریزی میڈیم میں دی جاتی ہے لیکن انہیں اس بات کی آزادی رہتی ہے کہ وہ چاہیں تو اپنا امتحان اردو میں لکھیں۔مہاراشٹر میں مولانا آزاد ایجوکیشنل سوسائٹیز کے زیرنگرانی چلائے جانے والے مرہٹواڑہ کالج آف ایجوکیشن' اورنگ آباد میں 2005ء سے 150 طلبہ کو بی۔ایڈ کی تعلیم اردو اور انگریزی دونوں ہی زبانوں میں دی جارہی ہے۔طلبہ کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنا امتحان اردو میں لکھیں۔اس طرح پچھلے تین سال میں یہاں سے 450 طلبہ بی۔ایڈ کی ٹریننگ حاصل کیے اور سرکاری وغیرسرکاری اسکولوں میں ملازمت حاصل کی۔اورنگ آباد میں B.Ed کی تعلیم کے لیے دو اور کالج DSR کالج آف ایجوکیشن اور تنزل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن قائم ہیں جن میں تعلیم تو انگریزی میں دی جاتی ہے لیکن طلبہ اردو میں امتحان لکھ سکتے ہیں۔یوں تو مہاراشٹرا کے کسی بھی بی۔ایڈ کالج میں زیرتعلیم انگریزی میڈیم کے طلبہ کو اردو میں امتحان لکھنے کی اجازت ہے۔ خلد آباد (مہاراشٹرا) میں حضرت پیر محمد کالج آف ایجوکیشن 2004ء سے تعلیم وتربیت میں مصروف ہے جس میں بی۔ایڈ اردو میڈیم کے لیے 50 سیٹیں مختص ہیں۔ٹیچرس ٹریننگ کالج جامعہ ملیہ اسلامیہ' نئی دہلی میں بی۔ایڈ کے لیے 200 سیٹوں پر داخلہ دیا جاتا ہے جس میں 100 سیٹیں اردو میڈیم کے لیے مختص ہیں۔اسی طرح یہاں ڈپلوما ان ایجوکیشن میں بھی جملہ

100 سیٹوں میں سے 50 سیٹیں اردو میڈیم کے لیے محفوظ رہتی ہیں۔اس طرح بی۔ایڈ اور ڈپلوما ایجوکیشن میں اردو ذریعہ تعلیم کا انتظام ہے۔ یہاں کے طلبہ کو یہ سہولت حاصل ہے کہ انہیں امتحان میں پرچے انگریزی' ہندی اور اردو تینوں زبانوں میں دستیاب رہتے ہیں۔

اردو میڈیم سے اعلیٰ تعلیم کے مسائل پر نظر ڈالتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ سب سے پہلے مسئلہ درسی کتابوں کا ہے جن کی فراہمی کسی بھی یونیورسٹی کے لیے ایک دشوار امر ہے۔مضامین چاہے وہ قدیم ہوں کہ جدید' ملک میں اردو میں لکھنے والوں کا فقدان پایا جاتا ہے۔مضامین کے ماہرین جو یہ کام کرسکتے ہیں وہ یا تو اتنے مصروف رہتے ہیں کہ اردو میں لکھنے کے لیے یا انگریزی سے ترجمہ کرنے کے لیے بالکل وقت نہیں دے پاتے یا پھر اپنی بڑی عمر یا بیماری کی وجہ سے یہ کام کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ترجمے کے لیے اکثر ایسے لوگ آگے آتے ہیں جو نہ ہی اپنے مضمون میں مہارت رکھتے ہیں اور نہ دونوں زبانوں پر قدرت پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ معیاری تراجم کروائے جاسکیں۔جدید علوم میں ترجمے کے ساتھ اصطلاحوں کا بھی ایک مسئلہ رہتا ہے۔ پہلے تو اصطلاحیں دستیاب نہیں ہوتیں اور اگر دستیاب بھی رہتی ہیں تو شمال میں کچھ اصطلاحیں مروجہ ہیں تو جنوب میں کچھ اور۔ان میں یکسانیت برقرار رکھنا کبھی کبھی مشکل ہوجاتا ہے۔ایسے میں ترجمہ شدہ اچھی کتابوں کی طلبہ کو فراہمی دشوار ہوجاتی ہے۔اکثر مضامین کے لیے اردو میڈیم

میں پڑھانے والے تعلیم یافتہ اساتذہ کی بھی قلت کا سامنا رہتا ہے۔اس طرح مختلف مضامین کے لیے اردو میڈیم میں موثر تعلیم کا انتظام بے حد مشکل ہوجاتا ہے۔یہ مسائل تب ہی حل ہوں گے جب اردو میڈیم میں پڑھنے والے نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے خود ہی اس قابل ہوجائیں کہ وہ مضامین میں مہارت حاصل کرسکیں۔پڑھاسکیں۔ترجمہ کرسکیں اور کتابیں لکھ سکیں۔

اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم کے موجودہ منظرنامے کے پیش نظر مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارے نوجوان اپنی محنت اور صلاحیت کے بل بوتے پر یہ سب کچھ کر دکھائیں گے اور اردو زبان ملک میں اپنا کھویا ہوا مقام پھر سے حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوگی۔

☆☆☆

ڈاکٹر اوصاف سعید کانفرنس کے **افتتاحی** اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے تصویر میں پروفیسر اے۔ایم۔پٹھان پروفیسر گوپی چند نارنگ اور دوسرے دیکھے جاسکتے ہیں

افتتاحی اجلاس کے شرکاء کا ایک منظر

دینی جامعات، تعلیم نسواں اور فروغ اردو

پروفیسر ریحانہ سلطانہ
ناظم مرکز برائے مطالعات نسواں
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

جدید ہندوستانی زبانوں کے لسانی مزاج اور ہندوستانی ثقافت کی شکل میں اردو کا فیصلہ کن رول رہا ہے۔ تاریخی اعتبار سے اردو اور ہندی دو بہنیں ہیں اور تہذیبی وثقافتی حیثیت سے ترقی وفروغ پاتی ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے ہم قدم رہی ہیں۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے یہ ایک خطے یا فرقہ کی زبان نہیں، یہ ہندوستان کی مشترکہ وراثت کا لازمی حصہ ہے۔ اردو جس کا ہیولیٰ دہلی اور اس کے نواحی علاقے ہیں اس خطے میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی یہ انسانیت کے پرامن تصور اور باہمی یکجہتی کی نمائندہ زبان ہے اس میں تمام مذاہب کی روح شامل ہے۔

آئین ہند کے آٹھویں شیڈول میں اردو 18 زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ سوائے اردو کے تمام علاقائی زبانیں ہیں لیکن اردو کا کوئی علاقہ مختص نہیں۔ عصر حاضر میں زندگی کے تمام اہم عناصر مثلاً مذہب، تہذیب زبان، ادب، سیاست اس سے فیصلہ کن انداز میں متاثر ہورہے ہیں۔ اکثر صورتوں میں فرد کی شناخت کا تعین یا تو سیاست خود کرتی ہے یا پھر سیاسی نظریات کی بناء پر طئے ہورہا ہے۔ اردو کو آزادی کے بعد

مسلمانوں نے تہذیبی ورثے کے طور پر اپنی شناخت اور حیثیت کا اہم عنصر بنالیا۔ اسی لیے مذہبی تعلیم کا ذریعہ بھی بنی۔ کیونکہ عربی کے بعد سب سے زیادہ مذہبی ادب اردو ہی میں موجود ہے اور اردو میں سینکڑوں الفاظ عربی کے مستعمل ہیں جو روزمرہ کا حصہ بن چکے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے اردو سے رغبت اور اس زبان کو اپنانے کی اہم وجہ یا وسیلہ قرآن ہے ہر مسلم گھرانے کے بچے کی ابتداء اسی زبان سے ہوتی ہے۔

ماہرین لسانیات جہاں اس بات پر متفق ہیں کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا وہیں وہ اس حقیقت کے بھی معترف ہیں کہ جن علاقوں میں زبان پروان چڑھتی ہے وہاں کی تاثیر بھی ان زبانوں کے خمیر کا حصہ بن جاتی ہے۔ اردو زبان کے طویل تاریخی سفر میں جہاں دربار، دبستان، خانقاہ اور بازار سبھی نظر آتے ہیں وہیں اردو کو تقویت وتوانائی پہنچانے میں مدارس دینیہ کا بھی اہم رول نظر آتا ہے۔ اردو زبان کو عوامی زبان سے علمی زبان اور علمی شناخت عطا کرنے میں مدارس اسلامیہ نے جو کردار ادا کیا ہے اس سے کوئی بھی صاحبِ نظر انکار نہیں کرسکتا۔

اسلام علم ومعرفت کا دین ہے جس نے روز اول سے تعلیم وتعلم پر توجہ دی۔ ان دینی مدارس کی حیثیت اول دور رسالت میں ہی رکھ دی گئی تھی جسے ''صفہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ صحابہ کرام نے اس اولین درسگاہ سے خوب استفادہ کیا اور اس شمع علم کو لے کر ساری دنیا میں پھیل گئے۔ اس کے اثرات ہم اسلامی تاریخ کے ہر دور میں دیکھ سکتیہیں۔ ہندوستان میں آزادی سے پہلے اس کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے مولانا مناظر حسن گیلانی نے اپنی ایک تحقیق میں لکھا ہے کہ اس وقت صرف پایہ تخت دہلی میں

ایک ہزار مدارس تھے جن میں ایک شافعی مسلک کا اور بقیہ حنفی مسلک کے ادارے تھے۔ ان مدارس کے علماء وفارغین نے ہندوستان کی آزادی میں جس طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ اظہر من الشمس ہے۔

لیکن انگریزوں کی آمد کے بعد مسلمانوں پر جو کچھ بیتی اس سے دینی مدارس بھی محفوظ نہیں رہے۔ آزادی سے پہلے حکومتی سطح پر جو سرپرستی مدارسِ اسلامیہ کو حاصل تھی وہ اب نہیں رہی اس صورت حال نے اس وقت کے دردمند مخلص علماء ومشائخ کو بے چین کردیا۔ چناں چہ ان علماء ومشائخ کی کوششوں سے شمالی ہند میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی اور جنوبی ہند میں مولانا انوار اللہ فاروقیؒ نے جامعہ نظامیہ قائم کیا۔ جنوبی ہند اور خاص کر آندھرا پردیش میں جامعہ نظامیہ کے علاوہ کوئی باقاعدہ دینی درسگاہ کا وجود نہ تھا۔ لیکن آزادی کے بعد آہستہ آہستہ منظّم کوششیں شروع ہوئیں اور کئی دینی جامعات قائم ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ آج پورے ہندوستان کے طول وعرض میں مدارس اسلامیہ کا ایک جال سا بچھ گیا ہے اور انتہائی نامساعد حالات کے باوجود یہ دینی مدارس علم کی شمع روشن رکھے ہوئے ہیں۔

لیکن مدارس اسلامیہ کی اس شاندار تاریخ کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان کی تاریخ کے ان ادوار میں جب کہ مسلمانوں کا اقتدار تھا لڑکیوں کی اعلیٰ دینی تعلیم کا کوئی مدرسہ یا جامعہ نہیں تھی۔ آزادی کے بعد کے ابتدائی دہوں میں بھی یہی صورتحال کارفرما رہی۔ ابتدائی تعلیم کے لیے محلّہ کے چھوٹے مکاتب جو مساجد سے منسلک رہتے تھے اس حد تک لڑکیوں کی دینی تعلیم کے لیے اجازت تھی۔ تعلیم وتعلم

کے دروازے لڑکیوں کے لیے بند تھے۔ بعض دانشوروں کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی ومعاشرتی زوال میں جہاں اور بہت سے عوامل کارفرما رہے وہیں اس میں لڑکیوں کی تعلیم سے دوری بھی ایک اہم وجہ بنی۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے اکابرین کی طرف سے جتنی توجہ لڑکوں کی تعلیم پر مرکوز رکھی گئی لڑکیوں کی تعلیم اتنی ہی بے اعتنائی کا شکار رہی۔ اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے یہ جس قسم کی بھی احتیاط ہو لیکن ان کی یہ تدبیر صدیوں پر محیط ہوگئی اور اس کا نقصان پوری امت مسلمہ کو اٹھانا پڑا۔ اس حقیقت کا اظہار مولانا عبد الحئ فرنگی محلی (وفات 1887ء) نے بھی کیا وہ لڑکیوں کی تعلیم کے تعلق سے اپنے زمانہ کے رائج نظریات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ناسازگار حالات کی بناء پر مستقل طور پر کسی کے حق کو سلب نہیں کیا جاسکتا'' (دینی مدارس میں تعلیم: ص 219۔ سلیم منصور خالد۔ بحوالہ دینی مدارس کے لیے نصاب نو کی تجویز) چناں چہ ان کے ان افکار وخیالات کے مسلم معاشرے پر خاطر خواہ اثر ہونے لگا لیکن ظاہر ہے صدیوں کی تلافی آنِ واحد میں نہیں ہوسکتی تھی۔ لہٰذا ملت اسلامیہ کو اس تعلق سے بیدار ہوتے ہوتے مزید سو سال بیت گئے۔

آخر کار بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں باضابطہ طور پر لڑکیوں کی دینی تعلیم کے لیے اعلیٰ دینی جامعات کے قیام کے ذریعہ منظّم کوششیں شروع ہوئیں۔ شمالی ہند میں جامعۃ الصالحات (رامپور یو. پی) کے ذریعہ آغاز ہوا۔ جو ابتداً صرف لڑکیوں کا ایک عام اسکول تھا اسکو بانی جامعہ مولانا عبدالحئ مرحوم نے 72-1971 میں جماعت اسلامی کے رفقاء کے مشورہ اور تعاون سے (جن میں مولانا ابواللیث اصلاحی مرحوم کا بطور خاص

ذکر کیا جاسکتا ہے) ایک اعلیٰ دینی تعلیم کے مرکز کے طور پر قائم کیا اور دور دراز مقامات سے آنے والی لڑکیوں کی تشنگی علم کا خیال کرتے ہوئے ہاسٹل بھی قائم کیا۔ یہ جامعہ، جماعت اسلامی کی فکر کا حامل ہے (یہاں حنفی مسلک کی تعلیم دی جاتی ہے) اس کے کچھ عرصہ بعد ''جامعۃ الصالحات'' ہی کے نام سے لڑکیوں کے ایک اہم دینی ادارہ مالیگاؤں (مہاراشٹرا) میں قائم ہوا۔ جو تبلیغی جماعت کی فکر کا حامل ہے۔ اس کے بعد یہاں سے فراغت پانے والی لڑکیوں نے ہندوستان کے طول وعرض میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے شعوری طور پر جو جدوجہد کی اس کے نتیجہ میں آج لڑکیوں کی دینی تعلیم کے لیے پورے ملک میں اتنی جامعات قائم ہوچکی ہیں جن کا شمار بھی مشکل ہے۔

جہاں تک حیدرآباد کا تعلق ہے یہاں کے لڑکوں کے لیے جتنے دینی مدارس ہیں اس سے کہیں زیادہ عصر حاضر میں لڑکیوں کے دینی مدارس قائم ہوچکے ہیں۔ حیدرآباد میں 80 کے دہے میں لڑکیوں کے لیے مدارسِ اسلامیہ کا آغاز ہوا۔ یہاں کے معروف دینی جامعات جو لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم میں مصروف ہیں ان میں سے جامعۃ البنات، جامعہ عائشہ نسواں، جامعۃ المؤمنات، جامعہ دارالفرقان، جامعۃ القرآن، جامعۃ الطاھرات، جامعہ سمیہ، جامعہ انوارالھدیٰ، جامعہ عائشہ صدیقہ، جامعہ راحت عالم للبنات اور جامعہ مکارم الاخلاق قابل ذکر ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ آج دینی مدارس کا جال پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے شائد ہی کوئی ضلع ایسا ہو جہاں کم از کم چار چھ دینی مدرسے نہ ہوں۔ حیدرآباد کو اس سلسلہ میں یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں لڑکیوں کے دینی تعلیمی ادارے دیگر شہروں کے مقابلہ

میں سب سے زیادہ ہیں۔ان اداروں میں 95% مدارس ایسے ہیں جہاں غریب و نادار لڑکیاں تعلیم حاصل کررہی ہیں جہاں ان غریب لڑکیوں کو کھانا، کپڑا، رہائش اور کتابیں سب کچھ مفت مہیا کی جاتی ہیں۔ گویا یہ مدرسے اور جامعات ناخواندگی کو دور کرنے اور تعلیم نسواں کو عام کرنے میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔لڑکیوں کی دینی تعلیم کے واسطہ سے ہندوستان میں تعلیم نسواں کا یہ سب سے بڑا وسیلہ ثابت ہو رہے ہیں۔

ہمیں یہ حقیقت نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندوستانی مسلمان بحیثیت مجموعی معاشی طور پر کمزور ہیں جس کی وجہ سے ان کے لیے تمام سہولتوں سے آراستہ ایسی بڑی دانش گاہیں کھولنا جو مسلمانوں کی تعداد کے لحاظ سے ان کی تمام ضرورتوں کی تکمیل کرسکیں، آسان نہیں ہے۔اس لیے ان کی مقدور بھر کوشش یہی ہے کہ یہ مدارس معاشی دشواریوں کے باوجود زندہ رہیں اور دین اسلام کی حفاظت اور ملت اسلامیہ کی خدمت کرتے رہیں۔

ان مدارس سے تعلیم نسواں کو عام کرنے اور اردو زبان کو فروغ دینے میں جو مدد مل رہی ہے اس کی قدر کرنی چاہیے۔اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ماضی میں دینی تعلیم کو جتنی اہمیت دی جاتی تھی آج پھر اس کی ضرورت و اہمیت کو اتنی ہی شدت کے ساتھ محسوس کیا جارہا ہے۔ دینی تعلیم کی ضرورت اور اس کے تقاضوں پر غور کریں تو اس کی جو کچھ بھی وجوہات نظر آتی ہیں وہ اپنی جگہ اہم ہیں لیکن اس کا بالواسطہ فائدہ ایک طرف اردو زبان کو پہنچ رہا ہے تو دوسری طرف تعلیم نسواں کی تحریک کو۔ جہاں تک اردو زبان کی ترویج و اشاعت کا سوال ہے یہ سب جانتے ہیں کہ دینی مدارس میں اردو ذریعہ تعلیم سے

قرآن و حدیث اور دیگر عربی علوم پڑھائے جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں اردو سیکھنا اور سکھانا ان مدارس کی بنیادی ضروریات میں شامل ہوجاتا ہے۔ان مدارس کے توسط سے اردو زبان کو دور دراز علاقوں تک قریہ قریہ اور دیہاتوں تک اپنے پاؤں پھیلانے کا موقع مل رہا ہے۔جن علاقوں میں مسلمانوں کی مادری زبان تلگو یا کوئی دوسری علاقائی زبان ہے وہ بھی دینی تعلیم کی خاطر اور دین کے اصل سرچشموں یعنی قرآن و حدیث کے حقیقی متن کو سمجھنے کی خاطر اردو زبان سیکھنے پر مجبور ہیں۔ بلکہ ان کے اندر اردو میں تحریر و تقریر کی ایسی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ واپس اپنے علاقوں میں جاکر اردو زبان کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ان کی اردو تحریروں کی وجہ سے اردو اخبارات اور کتابوں کو عوام میں مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ مدارس کے طفیل ہی غیر اردو داں علاقوں اور صوبوں میں بھی اردو کے قارئین پیدا ہوتے جارہے ہیں۔ بلکہ جہاں کبھی جامعات کی فارغ طالبات کو شادی کے بعد ہندوستان کے باہر جانے کا موقع ملتا ہے تو جہاں جہاں وہ پہنچتی ہیں وہاں وہاں اردو زبان کی اشاعت کا ذریعہ بھی بنتی ہیں۔یہی معاملہ مدارس کے فارغ لڑکوں کا بھی ہوتا ہے جو مدارسِ اسلامیہ سے فراغت کے بعد روزگار کے سلسلہ میں بیرونی ممالک پہنچتے ہیں تو اپنے ساتھ اردو زبان کو بھی پہنچاتے ہیں۔اس زاویہ سے دیکھا جائے تو مدارس اسلامیہ نے اردو کو کئی بیرونی ممالک تک پھیلا کر اسے ایک بین الاقوامی زبان بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

موجودہ دور میں جبکہ محبان اردو، اردو زبان کی بقاء کے تعلق سے فکرمند ہیں انھیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ شمالی ہند میں اور خاص کر اتر پردیش اور بہار میں اردو زبان کا

عمل دخل ختم ہوتا جارہا ہے۔ ایسے میں یہ مدارس اور مکاتب ہی ہیں جنھوں نے اردو زبان کو زندہ رکھا ہے اور انھیں کی بدولت اردو کا چلن گھروں میں بھی باقی ہے۔ جن خطوں اور علاقوں میں یہ مکاتب یا مدارس نہیں رہیں گے وہاں سے اردو زبان کو اجنبی اور غریب الدیار بن کر رخصت ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔

بے شک یہ دینی مدارس دنیا کو سنوارنے میں زیادہ معاون ثابت نہیں ہوتے، آخرت کی کامیابی کے لیے مقصود صفات کو اجاگر کرنے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود لڑکیوں کے دینی مدارس سے جو مادی فائدہ صنف نازک کو پہنچ رہا ہے اس میں سب سے اہم یہ ہے کہ مسلم خواتین میں تعلیم عام ہورہی ہے، اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ تعلیم عام ہونے کے نتیجہ میں سماجی شعور میں اضافہ ہورہا ہے۔ خواتین کو دین سے دور رکھ کر جس طرح اب تک ان کو تعلیم سے محروم رکھا گیا تھا اس نقصان کو وہ محسوس کرنے لگی ہیں۔ اب علم دین کے حصول کے نتیجہ میں انھیں اسلام میں عورت کو دیئے گئے مقام، منصب اور اپنے حقوق کی آگہی ہونے لگی ہے۔ آج کی مسلم عورت دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنے لگی ہے کہ اب تک دین کا حوالہ دے کر یا سماجی روایات کا حوالہ دے کر مسلم سماج نے اس کا بہت استحصال کیا ہے۔ دینی مدارس کی طالبات میں اب ایک سماجی شعور ابھر رہا ہے۔ ان کو احساس ہو چلا ہے کہ مرد کی اہمیت کا حوالہ دے کر مسلم عورت کو کس طرح بے دست و پا کر دیا جاتا ہے۔ وہ یہ جان گئی ہے کہ جہیز جیسی سماجی روایت کا حوالہ دے کر کس طرح اسکو میراث سے محروم کیا جاتا ہے وہ اس حقیقت سے بھی واقف ہوگئی ہے کہ اسلام جو کہ حقوقِ نسواں اور تعلیم و تعلم کا سب سے بڑا علمبردار ہے اسی

مذہب اسلام کے حوالہ سے عورت کے حقوق کو سلب کر کے اور تعلیم سے محروم کر کے صدیوں تک اس کا استحصال کیا جاتا رہا۔ آج کی دین پسند عورت اپنے حقوق سے واقف ہو کر اپنی سماجی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے قدم بڑھا چکی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ایک انصاف پر مبنی مسلم سماج کی تشکیل ہوگی جو ہر قسم کے صنفی امتیاز سے پاک ہوگا۔ جہاں ایک مسلم عورت اسلام کے عطا کردہ تمام اختیارات سے مستفید ہو سکے گی۔

یہاں پر حیدرآباد کے دینی جامعات میں سے ایک منفرد دینی جامعہ کا حوالہ دینا ضروری ہے جس سے اسبات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ کس طرح یہ دینی ادارہ انگریزی ذریعہ تعلیم سے اعلیٰ پیشہ وارانہ تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کو اور ملازمت پیشہ خواتین کو اردو زبان سے روشناس کرا کے انھیں علم دین سے آراستہ کر رہا ہے۔ یہ ''جامعہ مکارم الاخلاق'' ہے جو حیدرآباد کے محلّہ عنبر پیٹ میں واقع ہے۔ جدید طریقہ تعلیم سے متاثر ہو کر اس کے بانی جناب غلام محمد خان (B.D.O. Rtd) نے فاصلاتی طرز پر دینی تعلیم کو ان خواتین و طالبات تک پہنچانے کا عزم کیا ہے جو جدید تعلیم کے حصول میں مصروف ہونے کی وجہ سے یا ملازمت کی وجہ سے دینی تعلیم کے لیے روزآنہ وقت نہیں نکال سکتیں ایسی خواتین و طالبات کے لیے صرف اتوار کے دن قرآن و حدیث کی تعلیم اور عربی زبان سکھانے کا نظم رکھا گیا ہے۔ یہ جامعہ 2001ء میں قائم ہوئی۔ اس کی افادیت کی وجہ سے بہت سے لیڈی ڈاکٹرس، انجینئرس، لکچرس اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طالبات اس ادارے سے رجوع ہورہی ہیں اور دینی تعلیم سیکھنے کی خاطر انھیں اردو زبان بھی سیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ چوں کہ اس ادارہ میں علمیت و فضلیت کی مختصر مدتی تعلیم ہورہی ہے لہٰذا اس کے نصاب میں قرآن و حدیث اور فقہ کے ان حصوں کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے جو خواتین کے حقوق و ذمہ داریوں سے متعلق ہیں۔ اس

جامعہ کا قیام دینی مدارس کی تاریخ میں ایک نئے بدلاؤ کا مظہر ہے۔ جامعہ مکارم الاخلاق کے ذریعہ امید ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں صحیح اسلامی شعور کے ساتھ ساتھ اردو زبان سے واقفیت عام ہوگی، ان کے گھروں میں، اوران کی آنے والی نسلوں میں اردو کا چلن عام ہوگا نیز سماجی شعور کو عام کرنے میں بھی پیش رفت ہوگی۔

یہاں ان دو تحقیقی مقالوں کا حوالہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ مطالعات نسواں کے تحت لکھے گئے ہیں۔ ایک مقالہ کا عنوان ہے ''جدید تعلیم یافتہ خواتین کا اعلیٰ دینی تعلیم کی طرف رجحان، ایک جائزہ'' اس موضوع کے تحت 43 ایسی طالبات وخواتین سے انٹرویو لیا گیا جو 15 سال سے 50 سال کے درمیان تھیں اوراسی مذکورہ جامعہ مکارم الاخلاق میں دینی تعلیم حاصل کررہی تھیں۔ جب ان سے سابق ذریعہ تعلیم کے بارے میں معلوم کیا گیا تو 67 فیصد طالبات نے بتایا کہ انکا ذریعہ تعلیم انگریزی رہا۔ 5 فیصد نے تلگو میڈیم سے 2 فیصد نے ہندی میڈیم سے تعلیم حاصل کی تھی۔ بقیہ اردو جانتی تھیں۔ ان سب نے بتایا کہ ان کی مادری زبان اردو ہے لیکن وہ اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھیں۔ بلکہ اردو تقاریر کو سمجھنے میں بھی ان کو دشواری ہوتی تھی کیونکہ ان میں اردو کے دقیق الفاظ استعمال ہوتے ہیں لیکن اب ان کو یہ دشواری نہیں رہی بلکہ انھوں نے دینی تعلیم کی بدولت اردو میں لکھنے اور پڑھنے کی خاطر خواہ صلاحیت حاصل کرلی ہے اوراپنے ساتھیوں اورعزیزوں کو اردو سکھانے کا ذریعہ بن رہی ہیں۔

دوسرا مقالہ بھی جو شعبہ معالعاتِ نسواں کے تحت لکھا گیا ہے اس کا موضوع ہے ''دینی مدارس کی تعلیم اورلڑکیوں میں امپورمنٹ'' اس میں مقالہ نگار ڈاکٹر رفعت سیما نے چار دینی جامعات کے 133 طالبات کا انٹرویو لیا اور یہ تحقیق کرنے کی کوشش کی کہ دینی تعلیم کس

حد تک لڑکیوں میں سماجی مجازیت پیدا کرنے میں معاون بن سکتی ہے۔ اس مقالہ کے اختتام پر جو مجموعی جائزہ پیش کیا گیا اس میں بتایا گیا کہ عصر حاضر کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان دینی جامعات کا مختلف یونیورسٹیز سے الحاق کیا جارہا ہے جیسے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ، ہمدرد یونیورسٹی وغیرہ۔ جس کی وجہ سے یہاں کی فارغ التحصیل طالبات جدید تعلیم سے بھی مربوط ہورہی ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہورہا ہے کہ ان کی معلومات میں وسعت پیدا ہورہی ہے، انکا ذہن کشادہ ہورہا ہے۔ ان میں اعتدال پیدا ہورہا ہے اور وہ زیادہ باشعور ہوتی جارہی ہیں۔ ان مدارس کی طالبات نے مختلف سماجی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں جو عزم حوصلہ کا ثبوت دیا ان کی مثالیں بھی اس مقالہ میں پیش کی گئی ہیں جس سے اس خیال کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ لڑکیوں کے یہ دینی مدارس تعلیم نسواں کو عام کرنے میں، سماجی مجازیت کو قائم کرنے میں اوراردو کے فروغ میں ایک قابل ستائش رول ادا کررہے ہیں۔

الغرض ہندوستان میں تعلیم نسواں اوراردو زبان کی ترویج واشاعت کے لیے جدوجہد کرنے والوں کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ جب تک دینی مدارس زندہ ہیں ان کے توسط سے لڑکیوں کی ناخواندگی کے مسائل بھی حل ہوں گے اوراردو زبان بھی زندہ رہے گی۔

☆☆☆

اُردو رسم الخط

''دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی''

ڈاکٹر سید تقی عابدی (ٹورنٹو کنیڈا)

اگر چہ اُردو رسم الخط کا مسئلہ تقریباً سو ڈیڑھ سو سال سے کھڑا کیا گیا ہے لیکن گذشتہ پچاس ساٹھ برسوں میں اس بحث میں جذباتیت کو بڑا دخل ہو چکا ہے جس کی وجہ سے مسئلہ سلجھنے کے بجائے الجھتا جا رہا ہے۔ آج سے تقریباً پینتیس سال قبل پروفیسر گوپی چند نارنگ نے دہلی کے رسالے ''جامعہ'' مطبوعہ مارچ ۱۹۷۲ء میں اپنے مضمون ''اُردو رسم الخط'' میں صحیح کہا تھا کہ ''زبان کی طرح رسم الخط بھی عوامی چیز ہے اور ہر شخص کو اس پر اظہار خیال کا حق پہنچتا ہے۔ اس لیے اس مسئلے پر لکھنے والوں میں عالم اور عامی سبھی شامل ہیں۔ لیکن زیادہ تر تحریریں جذباتیت سے مغلوب ہو کر لکھی گئی ہیں جن کا مقصد اتنا روشنی پھیلانا نہیں جتنا گرمی بڑھانا ہے۔ ضرورت ہے کہ اُردو رسم الخط کے مسئلہ پر معروضی علمی انداز سے نظر ڈالی جائے اور تبدیلی کا مشورہ دینے والوں کے محرکات کا پتہ چلایا جائے نیز موجودہ رسم الخط کو زندہ رکھنے کے تہذیبی اور لسانیاتی پہلوؤں پر غور کیا جائے۔ پنڈت آنند نرائن ملّا نے اپنے خطبہ صدارت جے پور اردو کانفرنس میں کہا تھا: ''تقسیم ہند کی وجہ سے اکثریت کے دلوں میں جو غبار آ گیا ہے وہ کسی طرح مٹنے کا نام نہیں لیتا اور پاکستان کے

خلاف جو غصہ ہے وہ غریب اُردو پر اتارا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کو اس ملک کی زبان ماننے سے انکار ہے۔''

اُردو رسم الخط کے مسائل پر غور کرنے کے لیے اس کا لسانیاتی پہلو اور اس کا اُردو زبان سے رشتہ دیکھنا پڑے گا۔ کسی بھی زبان کا رسم الخط اس زبان کی آوازوں کو علامتوں سے ظاہر کرتا ہے اس لیے وہ زبان کا تابع ہوتا ہے لیکن اغلب زبانوں میں وہ اُس زبان کی شناخت بن جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کسی بھی رسم الخط میں دوسری زبانوں کی آوازوں کو بڑی حد تک پیش کیا جا سکتا ہے لیکن صرف ایک زبان کا رسم الخط اُسی زبان کی صوتیات کو پوری طرح سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے چناں چہ اُردو کا رسم الخط اُردو کے لیے مختص ہے اور اسی لیے یہی اُردو کا چہرہ یا اُردو زبان کے جسم پر اُس کی چمڑی کی طرح ہے جس کے تبدیل کرنے میں جسم کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ چوں کہ اُردو کا رسم الخط صدیوں کے تجربات اور استعمال کے بعد اس مقام پر پہنچا ہے کہ اس کی مانوسیت اور ہماہنگی اُردو زبان کی صوتیات سے گھل مل گئی ہے اسی لیے اب اس کی کھال نوچ کر اس پر دوسری کھال چڑھانا ممکن نہیں اس عمل سے اُردو زبان کی شناخت اور انفرادیت ختم ہو سکتی ہے۔

بھارت میں بعض سیاست داں اور مغربی دنیا کے بعض اُردو و ہندی کے ادیب جو اُردو کے رسم الخط کو دیوناگری یا رومن رسم الخط میں تبدیل کرنے کے خواہاں ہیں ان کی وجوہات زیادہ تر کم علمی، غلط فہمی، مفاد پرستی اور ذہنی تیرگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان کے نظریات کے تحت

۱۔اُردو رسم الخط ایک غیر ملکی عربی/فارسی رسم الخط ہے۔ یہ اسلامی رسم الخط ہے جس کا بھارت بھومی سے تعلق نہیں۔

۲۔اُردو میں مستعملہ فارسی، عربی وترکی کے الفاظ، اصطلاحات اور تلمیحات وغیرہ کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے نہیں بلکہ یہ سب عرب وعجم کی پیداوار ہیں۔

۳۔اُردو رسم الخط کو دیوناگری میں تبدیل کرنے سے بھارت میں قومی یکجہتی بڑھ سکتی ہے۔

۴۔رسم الخط کی تبدیلی سے اُردو کے لسانی ذخائر دیوناگری میں آسانی سے منتقل ہو سکتے ہیں۔

۵۔چوں کہ اُردو ہندی ایک ہی زبان ہے بلکہ اُردو ہندی کی ''شیلی'' ہے اس لیے دو رسم الخط کی ضرورت نہیں۔

۶۔ترکی اور ازبکستان کے تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ زبان ترکی اور ازبک کا رسم الخط رومن اور روسی کرنے سے زبان ختم نہیں ہوئی بلکہ زبان کی ترقی ہوئی۔

۷۔ہندوستان اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں اُردو کو زندہ رکھنے کے لیے رسم الخط کی قربانی ضروری ہے۔

۸۔اُردو رسم الخط مشکل ہے اس میں کئی حروف ایک ہی آواز کے لیے ہیں جن سے رسم الخط کی تدریس اور تکنیکی ترقی میں رکاوٹ پیش آتی ہے اس لیے اس رسم الخط کو بدلنا چاہیے۔

۹۔جدید ترسیلی ٹکنالوجی جس میں انٹرنیٹ سائبر سسٹم وغیرہ ہیں اس میں اُردو آسانی کے ساتھ رومن حروف میں لکھی جاسکتی ہے۔

اوپر بیان کیے گئے نظریات پر تفصیلی گفتگو درکار ہے لیکن ہم اس مضمون کی نوعیت سے اجمالاً چند نکات پر روشنی ڈالیں گے۔

یہ بھی زمانہ کی ستم ظریفی ہے کہ اُردو کے رسم الخط کو عربی/فارسی کا رسم الخط بتا کر اُسے خصوصاً بھارت میں خارجی یا غیر ملکی رسم الخط بتایا جاتا ہے۔ یہاں کچھ نادان دوست جنھیں ہمیشہ ادبیات کو اسلامیات میں تبدیل کرنے کا جنون رہتا ہے اس رسم الخط کو قرآن مجید کے رسم الخط سے بھی تعبیر کرتے ہیں جس کا نتیجہ شدید ردعمل کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اُردو کا رسم الخط سامی خاندان سے تعلق رکھتا ہے جو عربی فارسی سے ہوتا ہوا اور صدیوں کے تجربات اور استعمال کی منازل سے گذر کر اب خاص اُردو رسم الخط ہو گیا ہے کوئی عرب یا ایرانی نہ اس کو صحیح طریقہ سے پڑھ سکتا ہے اور نہ ہی لکھ سکتا ہے مزید اس کو عربی یا ایرانی رسم الخط نہیں کہہ سکتا۔اس میں موجود حروف تہجی اعراب اور علامتیں کچھ سامی الاصل ہیں اور کچھ خاص ہندوستانی جن کی آمیزش نے اسے خاص اُردو پن دیا ہے۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اُردو زبان اور لسانیات میں اُردو رسم الخط کی صوتیات پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔''اسے عربی فارسی رسم الخط کہنا غلط ہے اور ہمیں اس کو اُردو رسم الخط کہنے پر اصرار کرنا چاہیے۔جس طرح اُردو ایک آزاد اور مستقل زبان ہے اسی طرح اُردو رسم الخط بھی ایک آزاد اور مستقل رسم الخط ہے۔''

پروفیسر فتح محمد ملک اپنی مرتب کردہ کتاب ''اُردو زبان اور رسم الخط'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔''اُردو زبان کو ابتداء ہی میں عربی، فارسی رسم الخط کی نعمت میسر آ گئی۔ ساتھ ہی ساتھ برصغیر کے ہر خطے کی زبان میں بالکل قدرتی طور پر

عربی رفارسی الفاظ شامل ہوتے چلے گئے ۔صدیوں یہ لسانی عمل جاری رہا۔تب جا کر کہیں اُردو زبان ہند اسلامی کلچر کی علامت بن کر اُبھری ۔۔۔۔ جب مسلمانوں سے سیاسی اقتدار چھین کر انگریز برصغیر پر قابض ہو بیٹھے تو ہندو احیائیت کے علمبرداروں نے انگریزوں کی سرپرستی میں ہند اسلامی کلچر کی اسلامی شناخت کو مٹانے کی مہم کا آغاز کر دیا۔ اُردو زبان کے عربی رسم الخط کے ساتھ ساتھ اُردو میں شامل عربی فارسی الفاظ مسلمانوں کے خلاف منافرت کی اس مہم کا اولین نشانہ بنے ۔کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے منشی للولال جی نے ۱۸۰۳ء میں ''پریم ساگر'' کی صورت میں اُردو پر پہلا پتھر پھینکا۔''

جناب عزیز احمد ''اُردو زبان کا فروغ اور تحفظ'' میں لکھتے ہیں ۔اُردو کا رسم الخط اس کا اپنا منفرد رسم الخط ہے اور دنیا کے حسین ترین رسم الخطوں میں سے ایک ہے ۔ یہ ایک طویل تاریخی عمل سے وجود میں آیا ہے ۔ہم اسے صدیوں سے اسی شکل میں برتتے اور قبول کرتے آئے ہیں اور اب بھی کرتے ہیں ۔ ہمارا رسم الخط ہمارے تلفظ ہماری شائستگی اور ہمارے لسانی ،ادبی ،علمی اور ثقافتی سرمائے کے تحفظ کی ضمانت ہے ۔ جس طرح اُردو کا ماخذ اس کے اپنے علاقے کے عوام ہیں اسی طرح اُردو کا رسم الخط بھی اپنے علاقے کی تاریخ کے بطن سے فطری انداز میں صورت پذیر ہوا ہے اور رفع و ارتقاء کے عمل سے گذرا ہے۔

۱۹۶۰ء کے لگ بھگ جب اُردو کے مشہور ادیب خواجہ احمد عباس نے ہندی کے رسالے ''دھرم یگ'' میں ایک مضمون شائع کیا جس میں اُردو والوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنا رسم الخط دیوناگیری کر لیں تو اس کے جواب میں پروفیسر گوپی چند

نارنگ نے اپنے مضمون ''اُردو رسم الخط ۔ایک تاریخی بحث'' کے عنوان میں لکھا۔''یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ جو لوگ اُردو رسم الخط کو تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں وہ اُردو اصوات تو کجا اُردو اعراب سے بھی پورے طور پر واقف نہیں ہوں گے ۔رسم الخط کی بات کرتے ہوئے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ ہندی اور اُردو ایک زبان ہیں ۔ یہ بات جتنی صحیح ہے اتنی نہیں بھی ہے یعنی بنیاد کے اعتبار سے بے شک ہندی اور اُردو دونوں زبانیں ایک ہیں لیکن اپنے ارتقاء کے دوران بوجوہ یہ زبانیں ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ دونوں زبانیں شورسینی پراکرت کی جانشین ہیں اور دہلی کے گرد و نواح کی کھڑی بولی پر قائم ہیں ۔اُردو اور ہندی کو اب دو ملتی جلتی لیکن آزاد اور مستقل زبانیں سمجھنا چاہیے ۔ بنیاد کو ایک تسلیم کرنے سے یہ قطعاً لازم نہیں آتا کہ دونوں کا رسم الخط ایک ہو۔ اگر یہ بات ضروری ہوتی تو آج اڑیا، بنگالی ، اور آسامی زبانوں کا رسم الخط ایک ہی ہوتا کیوں کہ یہ تینوں ماگدھی پراکرت کی جانشین ہیں لیکن اس کے باوصف ان کا رسم الخط ایک دوسرے سے مختلف ہے ۔یہی ہندی اور اُردو کا معاملہ ہے دونوں آریائی زبانیں ہیں لیکن اپنے ارتقائی سفر میں یہ دونوں زبانیں اتنی آگے بڑھ چکی ہیں کہ اب ان کے لیے ایک ہی رسم الخط کا تجویز کرنا دونوں کے حق میں مضر ہوگا۔

پروفیسر گیان چند جین کی متنازعہ کتاب'' ایک بھاشا دولکھاوٹ' دوادب'' کے پیش لفظ میں پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں ۔'' سچائی یہ ہے کہ ہندوستان میں دو نہیں تین زبانیں مروج ہیں ۔ایک ہندوستانی ہے جو عام بول چال کی زبان ہے اور تقریباً ملک کے ہر حصے میں ہے دوسری ہندی اور تیسری اُردو'' ۔ پروفیسر

واستو ماہر لسانیات نے جو اُردو اور ہندی کے درمیان سات بنیادی اختلافات کی نشان دہی کی ہے یعنی رسم الخط، ش خ، ذ ض، غ وغیرہ کے تلفظ، نشان اضافت، قافیہ وردیف، اصناف سخن رباعی غزل مرثیہ وغیرہ، تلمیحات وغیرہ مگر یہ بھی حتمی نہیں ہیں ان کے علاوہ بہت کچھ مشترک ہے۔

پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں۔''ایک بات واضح ہے کہ زبان کا لازمی رشتہ رسم الخط سے نہیں ہوتا۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں یہی خوش فہمی عام ہے،،۔ راقم پروفیسر صاحب کے جواب میں یہ ضرور کہے گا کہ زبان کا لازمی رشتہ رسم الخط کے ساتھ نہ سہی مگر زبان کا رسم الخط کے ساتھ رشتہ لازمی ہے اور پھر دنیا بھر میں اُردو ہندی جیسی دو زبانیں نہیں جن کا رسم خط ایک کر دینے سے دوسرے کے وجود کو خطرہ لاحق ہو جائے۔

پروفیسر گیان چند جین نے اپنی اس متنازعہ کتاب میں بھی اپنے سابقہ مضامین کے خیالات کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''دراصل اُردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں۔'' ''اُردو ادب اور ہندی ادب دو آزاد ادب ہیں لیکن اُردو اور ہندی دو مختلف زبانیں نہیں ہیں''۔ ''دخیل الفاظ سے زبان کا تعین نہیں ہوتا۔ رسم خط کا فرق بھی اسی طرح ایک زبان کے دو حصے نہیں کر سکتا۔''

اِسی کتاب کے مقدمہ میں جناب کمال احمد صدیقی صاحب نے لکھا۔''جہاں تک گیان چند جین کے بنیادی نظریے کا سوال ہے کہ اُردو ہندی ایک زبان ہیں مجھے اس سے اتفاق ہے۔'' یہاں اس بات کا ذکر بھی بیجا نہیں کہ پروفیسر گیان چند جین اُردو ہندی کو ایک زبان مانتے ہوئے بھی اُردو رسم الخط کی حفاظت پر زور دیتے

ہیں۔''مجھے اُردو زبان اس کے اپنے رسم الخط اور اس کے ذخیرہ الفاظ کے ساتھ پسند ہے۔ میں اِسے اُردو خط کے علاوہ کسی اور لپی میں برداشت نہیں کر سکتا۔ ہمارے جو اہل ہندی چاہتے ہیں اگر اُردو دیوناگری لپی میں لکھی جائے اور اس کا شبد بھنڈار دیسی ہوتا جائے تو وہ اُردو کہاں رہے گی۔ میں ہندوستان کے اُردو والوں سے صرف اتنا کہوں گا کہ وہ اپنا رسم الخط بدلنے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوں۔ اگر انہوں نے اس سلسلے میں کوئی کمزوری دکھائی تو اُردو ہندی کے اسالیب میں بہہ کر ختم ہو جائے گی۔ ہندوستان کے آئین میں اقلیتوں کی زبان اور رسم الخط کے تحفظ کو گارنٹی دی گئی ہے۔''

افسوس اس بات کا ہے کہ ہم اُردو والوں نے اُردو ہندی ایک زبان کہنے کا الزام صرف اہل ہندی پر رکھا جب کہ حقائق سے پتا چلتا ہے کہ اُردو کے عظیم مشاہیر بھی اسی نالۂ شبگیر کے ہمنوا تھے۔

بھارت میں اُردو رسم الخط کو دیوناگری سے اور مغرب میں رومن رسم الخط سے بدلنے کے حامیوں میں خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، راہی معصوم رضا، ڈاکٹر ملک راج آنند، ہاشم علی اختر کے علاوہ کئی اردو اور ہندی کے ادیبوں کے نام ملتے ہیں۔ یہ افراد بھی اُردو کی بقاء کی ضمانت کے لیے اُردو رسم الخط کی قربانی جائز سمجھتے تھے۔ اگرچہ ان افراد کی تعداد کم تھی اور اب بھی اس ذہنیت کے لوگوں کی تعداد محدود ہے لیکن ان کے نظریات کے مطابق بھارت اور مغربی دنیا میں اُردو لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے اور اُردو بولنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے یعنی اُردو اب کانوں کی زبان بن کر زندہ ہے اور یہ آنکھوں کی زبان نہیں رہی چناں چہ رسم الخط کو تبدیل کر کے

اُردو کو زندہ رکھا جائے۔

ان افراد سے ہمارا سوال یہ ہے کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ اُردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر ہم کہیں ''مجھے پانی دو'' تو یہ ہندی ہے، اُردو ہے یا ہندوستانی اس کا فیصلہ کیسے ہو اور اگر ہم پانی کو دیوناگری میں لکھیں تو اِسے کیسے اُردو کہہ سکیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہمیں دیوناگری یا رومن رسم الخط میں اُردو لکھنا اور پڑھنا سیکھنا ہے تو پھر اُردو رسم الخط جو خود اُردو کا عمدہ رسم الخط ہے اُسے ہی کیوں نہ سیکھا اور سکھایا جائے۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ ہر زبان کا اپنا ادبی، علمی، تہذیبی اور ثقافتی ورثہ ہوتا ہے جو تحریری شکل میں محفوظ رہتا ہے اور اسی بنیاد پر اُس زبان کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے اگر ہم اپنا رسم الخط بدل دیں تو کیا یہ سارے ادبی خزانے بے معنی اور بے قیمت نہ ہوں گے۔ کیا ترکی زبان میں لکھی گئی صدیوں کی پرانی ترکی رسم الخط کی کتابیں جو کتب خانوں میں بے مصرف پڑی ہوئی ہیں ہمارے لیے لمحہ فکر اور مقام عبرت نہیں بن سکتی ہیں؟

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے ہماری زبان کے مضمون ''اُردو کا المیہ'' مطبوعہ جون ۱۹۷۱ء میں لکھا۔ چوں کہ ہندی اور اُردو ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں اس لیے اس میں ترجمے کا پردہ کم سے کم حائل رہتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور ''ادب اور نظریہ'' کے مضمون میں لکھتے ہیں۔ ''اُردو کی بنیاد کھڑی بولی پر رکھی گئی ہے۔ اس اعتبار سے اس میں اور ہندی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہندی اور اُردو دو مستقل جداگانہ زبانیں نہیں ہیں''۔

پروفیسر احتشام حسین صاحب ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' کے

مقدمہ میں لکھتے ہیں۔ ''حقیقت یہ ہے کہ لسانیات کے نقطہ نظر سے اُردو اور ہندی کو دو زبانیں قرار دینا صحیح نہیں۔ اگرچہ اُردو اور ہندی لسانیاتی مفہوم میں دو زبانیں نہیں ہیں لیکن عملی حیثیت سے اس وقت تک انھیں دو الگ الگ زبانوں کا مرتبہ حاصل ہے۔''

پروفیسر فتح محمد ملک اُردو زبان اور اُردو رسم الخط میں لکھتے ہیں۔

''لگ بھگ نصف صدی پیشتر امریکی سی آئی اے کی تائید و حمایت سے اقتدار میں آنے والے فوجی آمر فیلڈ مارشل ایوب خان نے جب اُردو کو رومن رسم الخط اپنا کر ''ترقی'' کرنے کا فرمان جاری کیا تھا تب ہمارے سرکردہ ادیبوں اور دانشوروں نے یہ فرمان ماننے سے انکار کر دیا تھا۔۔۔۔ آج ہمارے یہاں ایک مرتبہ پھر بڑی خاموشی اور کمال عیاری کے ساتھ ہمارا الیکٹرانک میڈیا اُردو کو رومن رسم الخط میں پیش کرنے میں مصروف ہے ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے اشتہارات میں رومن رسم الخط کے ذریعہ ہماری قومی زبان کا حلیہ بگاڑنے میں منہمک ہیں۔ کراچی کے ماہنامہ ''نفاذ اُردو'' نے اپنے مئی ۲۰۰۸ء کے شمارے میں خبر دی ہے کہ کراچی سے رومن رسم الخط میں اُردو کے ایک روزنامہ کا اجراء عمل میں آ گیا ہے مجھے یقین ہے کہ اس اخبار کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس سے پہلے وقتاً فوقتاً رومن رسم الخط میں لکھے گئے اُردو کتابچوں کا ہوتا چلا آیا ہے۔ رومن اُردو کی ترویج کی یہ مساعی اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ ہماری اور ہماری قومی زبان کی منفرد تہذیبی اور لسانی شناخت کو مٹانے کے درپے قوتیں آج بھی سرگرم کار ہیں۔

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ جنہوں نے پروفیسر گیان چند جین کے جواب میں کتاب ''ایک زبان جو مسترد کی گئی'' لکھی اپنے مضمون ''ہندی امپیریلزم اور

اُردو'' میں لکھتے ہیں۔''یہ ہندی امپیریلیزم ہی تو ہے کہ شمالی ہندوستان میں ۴۸ علاقائی بولیوں کو ہندی نے اپنے قلم رو میں شامل کر رکھا ہے جس سے ان بولیوں کی انفرادیت ختم ہوگئی ہے اور ہندی بولنے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا ہے۔۔اس امر کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا کہ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندی بولنے والوں کی تعداد ہندوستان کی کل آبادی کا ۴۰ فیصد ہے۔اگر ہندی کے فیصد میں سے ان بولیوں کے فیصد کو وضع کر لیا جائے تو ہندی بولنے والوں کا فیصد گھٹ کر ۲۷ رہ جاتا ہے۔جینؔ صاحب بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہندی والوں نے ہندی امپیریلزم کے بل پر متعدد دوسری زبانوں اور بولیوں کو اپنی قلم رو میں ملا لیا۔آئین ہند کے آٹھویں شیڈول میں مندرج ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں کے ساتھ اُردو کا بھی اندراج ملتا ہے۔جینؔ صاحب اپنے ایک لسانی مضمون''اُردو ہندی یا ہندوستانی''مطبوعہ ہندوستانی زبان اکتوبر ۱۹۷۳ء میں لکھتے ہیں''ہندوستان کے آئین میں اُردو ہندی کو دو زبانوں کی حیثیت سے درج کرنا سیاسی مصلحت ہے لسانی حقیقت نہیں۔''

اُردو اور ہندی نچلی سطح پر بلا شبہ ایک زبانیں ہیں۔اس سے کسی ماہر لسانیات کو انکار نہ ہوگا لیکن ادبی علمی تہذیبی اور فنکشنل سطحوں پر بلا شبہ یہ دو مختلف زبانیں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اُردو اور ہندی کو ایک زبانیں قرار نہیں دیا جا سکتا۔

پروفیسر بیگ مزید لکھتے ہیں اُردو بھی جو ایک خود مختار ترقی یافتہ اور معیاری زبان ہے ہندی امپیریلزم سے نہ بچ سکی۔اہل ہندی نے اُردو کی ادبی اور لسانی تاریخ سے مبینہ طور پر چشم پوشی کرتے ہوئے محض اپنی تنگ نظری اور لسانی تعصب کی بناء

پر اور ہندی کی برادری کو وسیع تر کرنے کی غرض سے اس زبان کو ہندی کی ایک ''شیلی'' قرار دے دیا۔''شیلی'' کا مطلب ہوتا ہے کسی زبان کا محض ایک اُسلوب یا اسٹائل۔کسی آزاد مستقل اور ترقی یافتہ زبان کو کسی دوسری زبان کی شیلی کہنا اس کے وجود کی نفی کرنا ہے اس کی لسانی انفرادیت کو ختم کر دینا ہے۔اور اس کے تمام تر ادبی اور لسانی سرمایے پر شب خون مارنا ہے۔اہل ہندی نے اُردو کو ہندی کی شیلی قرار دے کر یہی سب کچھ کیا ہے۔ اُردو کو ہندی کی شیلی کہنے کی بدعت انیسویں صدی کے نصف دوم میں شروع ہوئی جب کھڑی بولی ہندی کے ایک حمایتی ایودھیا پرساد کھتری نے کھڑی بولی ہندی اور اُردو میں کوئی فرق نہ مانتے ہوئے اُردو کو ہندی کی ''شیلی'' قرار دے دیا۔کھتری کہتے تھے کہ اُردو اور ہندی میں فرق صرف ''لپی'' رسم الخط کا ہے۔کھتری اہل اُردو کو یہ مشورہ بھی دیتے تھے کہ وہ فارسی رسم خط کو چھوڑ کر دیوناگری رسم خط اختیار کر لیں۔'' اُدھر مسلم لیگ نے اسے خطرے کی گھنٹی جان کر ۱۹۱۷ء کے کلکتہ کے اجلاس اور ۱۹۱۹ء کے امرتسر کے اجلاس میں اُردو زبان اور فارسی حروف تہجی کے تحفظ کی ضرورت پر زور دیا جس کا نتیجہ ۱۹۳۶ء کی قرار داد میں دفعہ (۱۱) اُردو زبان اور رسم الخط کی حفاظت قرار پایا۔

ڈاکٹر اطہر فاروقی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔اگر اُردو کی گیان چند جین کے لیے واقعی کوئی قدر تھی تو کیا انہوں نے اپنے بچوں کو اُردو پڑھائی۔راقم نے کئی بار شہر لاس اینجلس میں گیان چند جین کے بیٹے بہو اور خاندان کے افراد سے ملاقات کی وہ سب سلیس اور شگفتہ اُردو میں بات کرتے ہیں مجھے یہ علم نہیں کہ وہ اُردو پڑھ اور لکھ بھی سکتے ہیں۔ڈاکٹر اطہر فاروقی کا سوال محکم ہے لیکن اس سوال کو صرف گیان چند کی فیملی

تک محدود رکھنا صحیح نہیں۔ برصغیر میں بھارت اور پاکستان کے زیادہ تر افراد جو اپنے کو اُردو کا مسیحا کہتے اور کہلواتے ہیں ان کے گھروں میں بھی اب اُردو صرف کانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے اکثر خاندان کے جوان اُردو رسم الخط سے بے بہرہ ہیں۔ اُردو رسم الخط ایک زندہ اور توانا رسم الخط ہے جو نہ صرف اُردو زبان و ادب کو ترقی کی راہ پر گامزن رکھنے کی ضمانت کرتا ہے بلکہ دوسری بولیوں کو زندہ رکھنے اور اُن کو ادب کے زمرے میں ترقی دینے کے لیے مددگار ثابت ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد صغیر خان کے مطابق قدیم زبان پہاڑی جس کا تعلق بھی ہند آریائی خاندان کی زبانوں سے ہے جو آج بھی کروڑوں لوگوں کی زبان ہے اور جسے ماہرین لسانیات نے مشرقی پہاڑی یا نیپالی، وسطی پہاڑی اور مغربی پہاڑی یا لہندا کہا ہے اور جو ریاست جموں کشمیر کے علاقوں، نیپال اور ڈیرہ دون، شملہ وغیرہ میں رائج ہے اور جس کے لیے ماضی بعید میں اور بعض مقامات پر آج بھی ''لنڈا'' شاردا یا ٹاکری رسم الخط استعمال ہوتا رہا ہے تو اب اسے زندہ اور ترقی یافتہ زبان کی حیثیت دینے کے لیے شاہ مکھی یا نستعلیق رسم الخط ہی استعمال ہو رہا ہے چناں چہ جب اُردو رسم الخط میں اتنی گنجائش ہے کہ دوسری قدیم بولیوں کو بھی اس میں لکھا اور پڑھا جا سکتا ہے تو پھر کیسے اُردو کا سر اُس کے کاندھوں پر بار ہوگا۔

یہ سچ ہے کہ آج سے تقریباً سو سال قبل اُردو ترقی بورڈ کا قیام عمل میں آیا اور آج اُردو تحفظ بورڈ کی ضرورت لاحق ہے اُردو زبان صرف بول چال یا کانوں کی زبان بنتی جا رہی ہے ایسے موقع پر اُردو رسم الخط کے مسائل اُردو لکھنا پڑھنا اور اُردو کی بنیادی تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔ آج سے چند برس پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ رسم الخط کا مسئلہ

پاکستان کا ادبی سماجی، لسانی، سیاسی اور مذہبی مسئلہ اس لیے بھی نہیں ہے کہ وہاں مقامی زبانوں اور بولیوں کو بھی اُردو رسم الخط میں لکھا جاتا ہے لیکن یہ بات بھی ذہن نشین کرنی چاہیے کہ دنیا کے کسی حصے میں بھی جو مسئلہ اُردو کی بقاء کے لیے اٹھتا ہے وہ خود بخود پاکستان کے ادیبوں دانشوروں اور اُردو پرستاروں کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ پریسیڈنٹ ایوب خان کے زمانے سے آج تک رومن رسم الخط کی تبلیغ اور تشہیر شدت سے جاری ہے جس کا نتیجہ آج خود پاکستان کے معاشرے اور سائبر انٹرنیٹ سسٹم پر دیکھا جا سکتا ہے جس کا ذکر پروفیسر فتح محمد ملک نے بھی اپنی مرتبہ کتاب میں کیا ہے۔ اُردو پرستاروں کو چاہیے کہ جذباتیت کے بدلے محنت اور سچی لگن سے اس مسئلہ کو حل کریں۔ اگر اُردو والے اُردو کے رسم الخط کو اپنے بچوں کو سکھاتے رہیں تو دنیا کی کوئی قوت ان سے رسم الخط کو چھین نہیں سکتی۔ یہ سچ ہے کہ حکومت کی سرپرستی اور ہمدردی زبان کے فروغ میں مدد دیتی ہے لیکن یہ صرف اُس وقت ممکن ہے جب اُردو والے خود اُردو کے ساتھ اس کی بنیادی تعلیم، اس کو روٹی اور روزگار سے جوڑنے اور اس کے رسم الخط وغیرہ کو جدید ٹکنالوجی کی مدد سے عام کرنے میں پیش پیش رہیں۔

اُردو رسم الخط اُردو کی آن بان اور شان ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو کی پہچان بھی ہے۔ اس کا رشتہ اُردو ادب سے جسم اور جلد کا رشتہ ہے اس میں صدیوں کی ادبی، علمی تہذیبی مذہبی اور ثقافتی اقدار کی نمائش ہے اسی کی مدد سے ہم میڈل ایسٹ اور ایشیاء کے کئی ملکوں سے لسانی رشتے قائم کر سکتے ہیں، یہ دوسری زبانوں کی نسبت مختصر نویسی کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہ غیر ملکی یا کسی خاص مذہب کی میراث نہیں بلکہ ایک مستقل زبان

ہے جو برصغیر کے بطن سے پیدا ہوئی اور اسی سرزمین پر پلی بڑی ہوئی اور آج اسی کا سایہ ایک گھنے درخت کے مانند ہند پاک سرحد کے دونوں جانب ہے اور اس کی ٹھنڈی ہوائیں دنیا کے گوشے گوشے میں نسیم سحر کی طرح دلوں کو شاد کرتی ہیں۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنی کتاب ''اُردو زبان اور اس کا رسم الخط'' کے دوسرے حصے میں رسم خط پر عمدہ گفتگو کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ دیونا گری اور رومن رسم خط میں اُردو سے زیادہ دشواریاں اور نقائص ہیں۔ اُردو کا رسم خط بدلنے سے جو مضر اثرات اور منفی نتائج ہوں گے اس کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔

۱۔ رسم خط بدلنے سے زبان کی ہیئت بدل جاتی ہے۔

۲۔ عربی اور فارسی سے رابطہ جو زبان کی نشو ونما کے لیے ہے ختم ہو جائے گا۔

۳۔ زبان کا حال اور ماضی سے رشتہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے لفظوں کی پہچان باقی نہ رہے گی۔

۴۔ ہزار ہا کتابیں جو اس رسم خط میں چھپ چکی ہیں ضائع ہو جائیں گی۔

۵۔ حرفوں کی تبدیلی سے حساب جمل کا وجود نہ رہے گا۔

۶۔ شاعروں اور ادیبوں نے جو لفظی صنعتوں میں کمال دکھایا ہے وہ نظر نہ آ سکے گا۔

چناں چہ اُردو کا موجودہ رسم خط اُسی طرح سے برقرار رہنا چاہیے۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ رومن اُردو۔نو Roman urdu? No میں لکھتے ہیں

Script is to language what spirit is to body. Without its own, innate script, a language is merely a dead body a spiritless mass of assembled limbs. Is that

what we want urdu to become by discarding the arabic script and taking on the roman one."

ہم اس گفتگو کہ آخر میں صرف یہی کہیں گے اگر اُردو والے رسم الخط کی حفاظت اور اس کے استعمال کی عادت کر لیں اور اس گراں قدر امانت کو اپنی نئی نسل کو منتقل کریں تو دنیا کی کوئی قوت ان سے ان کی زبان کا رسم الخط چھین نہیں سکتی۔ ہمیں دوسروں پر الزام دھرنے سے قبل اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے کہ اس جرم میں حقیقی مجرم کون ہے۔ ہم نے اس گفتگو میں سطروں سے زیادہ بین السطور باتیں کہی ہیں اور بہت سی باتیں بقول آزاد انصاری ؎

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

اور اسی لیے ؎

میں میکدہ کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا

☆☆☆

جناب معصوم مرادآبادی

پروفیسر محمد ظفر الدین

ڈاکٹر امام اعظم

ڈاکٹر نکہت جہاں

ڈاکٹر محمد احسن

اردو کے فروغ واشاعت میں میڈیا کا رول

معصوم مرادآبادی (نئی دہلی)

سعودی عرب کی اس مقدس اور مبارک سرزمین پر اردو کے پروانوں کا یہ اجتماع اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اردو زبان اور تہذیب، تمام تر نشیب وفراز کے باوجود مقبولیت اور کامرانی کی منزلیں طے کررہی ہے۔ یہ اب کسی ایک ملک، خطے یا علاقے تک محدود نہیں ہے کیونکہ نہ صرف اردو کی نئی اور دل آویز بستیاں آباد ہورہی ہیں بلکہ اردو سے محبت کرنے اور اسے دل دینے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔ کسی بھی زبان کی مقبولیت اور ہردل عزیزی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ لوگ دیوانہ وار اس کے گرویدہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اردو کے ساتھ تو معاملہ یہ ہے کہ اس کی مخالفت کرنے والے بھی بات یہاں سے شروع کرتے ہیں کہ واقعی اردو بڑی شیریں زبان ہے۔ اردو زبان کی شیرینی اور لطافت اس کے بولنے، برتنے اور لکھنے پڑھنے والوں سے زیادہ ان لوگوں پر عیاں ہے جو اسے سنتے، سوچتے اور اپنے خوابوں میں بساتے ہیں۔

اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی ہے اور وہاں کی گنگا جمنی تہذیب کی گود میں اس کی پرورش اور پرداخت ہوئی۔ بلا لحاظ مذہب وملت ہر اس شخص نے اس زبان کو اپنایا جس کے دل میں محبت کے جذبات موجزن تھے اور جو اپنے دلی احساسات وجذبات کو

ایک نرم اور دل پذیر زبان میں بیان کرنا چاہتا تھا۔ اردو زبان میں یہ غیر معمولی صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ لطیف اور حسین جذبات کو لفظوں میں پرونے کا سب سے موثر وسیلہ ہے۔ اس طرح اگر یہ کہا جائے کہ اردو محبت کرنے والوں اور اس پر جان و دل نثار کرنے والوں کی زبان ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

وہ کرے بات تو ہر بات سے خوشبو آئے
ایسی بولی وہی بولے جسے اردو آئے

یوں تو اردو زبان کی توسیع و اشاعت میں ان تمام عوامل و عناصر کا حصہ ہے جو اس کی تعلیم و تدریس، ترویج و ارتقا کے مختلف شعبوں میں سرگرم ہیں لیکن یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ عوامی سطح پر اردو کو مقبول عام بنانے میں جو کردار میڈیا نے ادا کیا ہے وہ شاید دوسرے عوامل نے مجموعی طور پر ادا نہیں کیا۔ آج برصغیر ہندو پاک کے علاوہ یوروپ و امریکہ اور مشرق وسطیٰ میں عوامی رابطوں اور رشتوں کو مضبوط بنانے کا سہرا اردو میڈیا کے سر ہے جو صحرائے عرب تک اپنی مضبوط اور توانا آواز رکھتا ہے۔ وطن سے ہزاروں میل دور اس عالمی اردو کانفرنس کے میزبان شہر جدہ سے اردو کا کثیر الاشاعت روزنامہ 'اردو نیوز' اور ہفت روزہ 'اردو میگزین' شائع ہوتا ہے۔ حال ہی میں سعودی گزٹ نے اپنے ہفتہ وار میگزین 'آواز' کی اشاعت بھی شروع کر دی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ میڈیا عوامی رابطے اور اطلاعات کی ترسیل کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ ذرائع ابلاغ نے جیسے جیسے ترقی اور کامرانی کی منزلیں طے کی ہیں، ویسے ویسے میڈیا کی دسترس میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ آج میڈیا کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ کوئی

بھی خبر یا اطلاع میڈیا کی پہنچ سے باہر نہیں ہے۔ ساری دنیا کی خبریں اور نئی اطلاعات آپ کو ہر لمحہ میڈیا کے ذریعہ ملتی رہتی ہیں۔ آپ ٹی وی، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ یا موبائل کی مدد سے ہر وقت ساری دنیا کے رابطہ میں رہتے ہیں۔ ان ایجادات نے اطلاعات کی ترسیل اور میڈیا کی ترقی میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ہمارے لیے یہ بات خوش آئند ہے کہ آج اردو کے ذرائع ابلاغ بھی ان سے بھرپور استفادہ کر رہے ہیں۔ وہ اردو صحافت جو کسی زمانے میں سست رفتار ٹیلی پرنٹر مشینوں، دقت پسند کاتبوں اور دقیق مترجموں پر انحصار کرتی تھی آج انٹرنیٹ کے دور میں داخل ہو چکی ہے اور اس کے ذریعہ اردو خبروں کی فراہمی کے علاوہ، اردو سافٹ ویئر اور اردو خبر رساں ایجنسی کی موجودگی میں عالمی ذرائع ابلاغ سے آنکھیں چار کر رہی ہے۔

1981 میں اردو سافٹ ویئر نوری نستعلیق کی ایجاد کے بعد اردو اخبارات میں ترقی اور جدید کاری کا جو عمل شروع ہوا تھا۔ اس میں 1992 میں اردو کی اولین خبر رساں ایجنسی یو این آئی کے اجراء نے چار چاند لگا دیئے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یو این آئی (یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا) آج بھی دنیا کی اکلوتی اردو خبر رساں ایجنسی ہے جو ہندوستان کے 70 اردو روزناموں کو خبریں فراہم کرتی ہے۔ اردو سافٹ ویئر اور خبر رساں ایجنسی کی آمد کے بعد اردو اخبارات و جرائد کی طباعت کے میدان میں بھی ایک اچھوتا انقلاب آیا۔ رنگین طباعت اور دیدہ زیب تصویروں کی اشاعت نے اردو اخبارات کا حلیہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ آج برصغیر ہندو پاک کے علاوہ نیویارک، لندن، ٹورنٹو، دبئی اور جدہ سے ایسے دیدہ زیب اردو اخبارات و رسائل شائع ہو رہے ہیں جنہیں

آپ دنیا کی کسی بھی بڑی زبان کے اخبارات وجرائد کے ساتھ پورے اعتماد سے رکھ سکتے ہیں۔اسی طرح ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ برطانیہ،امریکہ، جرمنی،مصر،ایران اور سعودی عرب ریڈیو پر اردو نشریات اور معیاری خبر ناموں کی مقبولیت اردو ٹی وی چینلوں کی آمد اور عالمی پیمانے پر ان کی رسائی نے پوری دنیا میں اردو کی ترسیل وترویج کے عمل کو آسان بنادیا ہے۔ اس طرح آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو کی دنیا اب محض ہندو پاک اور امریکہ و برطانیہ یا عرب ممالک تک محدود نہیں ہے بلکہ آپ دنیا کے ہر ملک اور خطہ میں اردو نشریات اور ویب سائٹس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔بعض اردو چینلوں کے ذریعہ اردو تعلیم وتدریس کے پروگراموں کی نشریات سے ان لوگوں میں بھی اردو سیکھنے اور پڑھنے کا شوق پیدا ہورہا ہے جو اب تک صرف سماعت کی حد تک اس سے مستفید ہورہے تھے۔

ہندوستان کے تناظر میں اگر آپ صورتحال کا جائزہ لیں تو محسوس ہوگا کہ وہاں اردو میڈیا کا دائرہ مسلسل بڑھ رہا ہے اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہورہے ہیں۔ اگرچہ یہ صورتحال شمالی ہندوستان میں اطمینان بخش نہیں ہے تاہم جنوبی اور وسطی ہندوستان میں اردو اخبارات و جرائد اور الیکٹرانک میڈیا کو مسلسل فروغ حاصل ہورہا ہے۔جنوبی ہندوستان میں حیدرآباد اردو میڈیا کا سب سے بڑا مرکز ہے، جہاں سے چار بڑے اردو روزناموں کی اشاعت کے علاوہ ای ٹی وی کی نشریات بھی ہوتی ہیں۔اور یہیں آزاد ہندوستان کی پہلی اردو یونیورسٹی بھی قائم ہوئی۔اس اعتبار سے حیدرآباد کو سلطنت اردو کا دارالخلافہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

الیکٹرانک میڈیا کے میدان میں دور درشن کے اردو چینل، آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس اور اردو مجلس جیسے پروگراموں کی نشریات اور ابلاغ عامہ کے دیگر ذرائع کی موجودگی میں اردو میڈیا کی ترقی کا منظر نامہ اطمینان بخش ہے۔ ہندوستان کی پچھلی مردم شماری میں تقریباً 5 کروڑ لوگوں نے اردو کو اپنی مادری زبان کے طور پر درج کرایا تھا۔ رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا (RNI) کی تازہ دستیاب رپورٹ کے مطابق ملک میں اردو اخبارات وجرائد کا مجموعی سرکولیشن 76 لاکھ ہے اور تعداد اشاعت کے اعتبار سے اردو میڈیا ہندوستان میں تیسرے مقام پر ہے۔یعنی ہندی اور ملیالم کے بعد سب سے زیادہ اخبارات وجرائد اردو زبان ہی میں شائع ہوتے ہیں۔اردو کی اشاعت کے اہم مراکز میں سری نگر، حیدرآباد، بنگلور، ممبئی، دہلی، لکھنؤ، پٹنہ، کلکتہ اور جالندھر شامل ہیں۔ نت نئے اردو اخبارات کا اجراء بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو میڈیا جدید ٹکنالوجی سے استفادہ کے ساتھ ساتھ اپنے قارئین کی تعداد میں بھی اضافہ کررہا ہے۔

اردو میڈیا کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے اگر آپ فلم کو بھی میڈیا کے زمرے میں شامل کریں تو فلموں کے ذریعہ بھی اردو کو خاطر خواہ فروغ حاصل ہوا ہے۔فلمی دنیا میں اداکاروں، مکالمہ نویسوں، گلوکاروں اور نغمہ نگاروں کے علاوہ تکنیشین کے لیے بھی اردو جاننا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر فلمی دنیا تک رسائی ممکن نہیں۔اپنی ترقی اور آگے بڑھنے کے لیے فلم انڈسٹری سے وابستہ لوگ اردو زبان سیکھتے ہیں خواہ اس کے لیے انہیں کتنا ہی پیسہ کیوں نہ خرچ کرنا پڑے۔گذشتہ 70-60 سال میں ہندوستانی فلموں کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب اردو زبان ہی رہی ہے اور ان فلموں کے ذریعہ اردو کو خاطر

خواہ فروغ حاصل ہوا ہے۔اس بات سے قطع نظر کہ ان فلموں کو ہندی کا سرٹیفکٹ دیا جاتا ہے لیکن ان کی زبان اور اپروچ اردو ہی ہوتی ہے۔

مجموعی طور پر وہ اردو میڈیا جس کا دائرہ کسی زمانے میں محض اخبارات ورسائل تک محدود تھا' اسے آج جدید ٹکنالوجی اور ذرائع ابلاغ کی حیرت انگیز ترقی نے بے حد وسیع کر دیا ہے۔آج اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا کے علاوہ انٹرنیٹ' ای پیپرز، نیوز ویب سائیٹ اور خبروں کی برق رفتار ترسیل کے ان گنت ذرائع وجود میں آ چکے ہیں۔خود اردو کے تمام بڑے اخبارات کے انٹرنیٹ ایڈیشن موجود ہیں جنہیں عرف عام میں ای پیپرز کہا جاتا ہے۔علاوہ ازیں اردو شعر وادب کو مقبول عام بنانے میں اردو کی درجنوں ویب سائٹ عالمگیر پیمانے پر تشنگان اردو کو سیراب کر رہی ہیں۔آج صحیح معنوں میں داغؔ کے اس شعر کی بازگشت پوری طرح سنائی دے رہی ہے ۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

☆☆☆

پروفیسر اے۔ایم پٹھان کانفرنس کے **افتتاحی** اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے

کانفرنس کے شرکاء کا ایک منظر

مشینی ترجمہ

ذخیرۂ اُردو میں بیش بہا اور سریع اضافے کا ضامن

پروفیسر محمد ظفر الدین
صدر شعبۂ ترجمہ
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ترجمہ دور حاضر کا ایک اہم ترین علمی میدان اور بنیادی ضرورت بن چکا ہے۔ اُردو زبان میں سرمایہ علم کی منتقلی کا انحصار انسانی تراجم پر ہے جس کی رفتار ظاہر ہے کہ بہت تیز نہیں ہے۔ اسے تیز رفتار بنانے کے لیے لازم ہے کہ جدید تکنالوجی سے بلا تکلف اور بھرپور استفادہ کیا جائے۔ نئے طریقوں اور تکنیکوں کے استعمال سے ترجمہ کی رفتار اور معیار کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ دُنیا کی ترقی اور رفتار کے ساتھ زبانوں میں بھی اس صلاحیت کی اشد ضرورت ہے کہ وہ وقت کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرلیں اور جدید ترقیات سے بھی بھرپور استفادہ کرنے کے قابل بنیں۔ یہ بات تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ بیسویں صدی مشینوں کی صدی تھی جب ترقی یافتہ تکنالوجی یعنی اطلاعاتی تکنالوجی (Information Technology) نے دُنیا کے مختلف شعبوں پر زبردست اثر ڈالا۔

حالیہ برسوں میں محققین اور ماہرین تکنالوجی نے بہت سے طریقے، تکنیک اور

آلات ایجاد کر لیے ہیں جن کے ذریعے ترجمہ کے عمل میں زبردست تیزی لائی جا سکتی ہے۔ترجمہ کے میدان میں ان طریقوں' وسائل اور تکنیک کا استعمال اور موثر اطلاق نہایت فائدہ مند ہے اور یہیں سے ترجمہ کی تکنالوجی (Translation Technology) جنم لیتی ہے۔ترجمہ کی تکنالوجی سے استفادہ کرتے ہوئے ترجمہ کا عمل نہایت منظّم' تیز رفتار اور معیاری بن سکتا ہے۔

مشینی ترجمہ دور حاضر کے زبردست علمی انقلاب کا باعث بن سکتا ہے۔اس کے اثرات دُنیا کے تہذیب وتمدن پر بھی ہوں گے اور سیاست پر بھی۔علم وتحقیق کے میدان میں بھی یہ استفادہ کا موجب بنے گا اور ابلاغ وترسیل کے میدان میں بھی۔مشینی ترجمہ دراصل تکنالوجی کا ایک خوبصورت روپ ہے جس کے ذریعہ ترجمہ کی رفتار و کارکردگی میں اضافہ ہوگا۔دُنیا بھر میں تکنالوجی کے ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر ترقی کی منزلوں کی جانب گامزن ہیں اور یقیناً ترجمے کے میدان میں بھی یہ اثر انداز ہو رہے ہیں۔

دُنیا بھر میں خودکار ترجمہ (Automatic Translation)' مشینی ترجمہ (Machine Translation) یا کمپیوٹر اعانتی ترجمہ (Computer Aided Translation) پر زبردست کام ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی مختلف پروجیکٹس پر کام انجام دیے جا رہے ہیں تا کہ ہندوستانی زبانوں میں ان ترقیات سے استفادہ ممکن ہو۔اُردو زبان میں مشینی ترجمے کا کام ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے۔اُردو دُنیا کے ماہرین لسانیات' ماہرین تکنالوجی اور طلبا و اساتذہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس

اہم ترین میدان میں موجود چیلنجز کا سامنا کریں اور اُردو زبان کو جدید تکنالوجی سے لیس کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔عربی' فارسی اور ہندی زبانوں میں مشینی ترجمے کے میدان میں ہوئے تجربات اور کامیابیوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔اُردو رسم الخط نستعلیق کا مسئلہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ یونی کوڈ کے منظر عام پر آنے کے بعد اب اُمیدیں روشن ہوئی ہیں۔ سافٹ ویئر تیار کرنے والی کمپنیاں اور ادارے یونی کوڈ (Unicode) کو استعمال کرتے ہوئے اُردو داں طبقہ کو بھی جدید ترقیات سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کر سکتے ہیں۔

ترجمے کی تکنالوجی

'ترجمے' کی 'تکنالوجی' سمجھنے کے لیے آیئے ہم ان دونوں کے الگ الگ مفاہیم پر نظر ڈالیں۔

'ترجمہ' ایک زبان سے دوسری زبان میں خیالات' احساسات اور جذبات کو منتقل کرنے کا نام ہے۔ترجمے کے عمل میں معانی اور مطالب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کیا جاتا ہے کہ اصل عبارت کی خوبی اور مطلب من وعن باقی رہتا ہے۔

'تکنالوجی' کسی مقصد کے حصول کے لیے اطلاقی تکنیکوں اور طریقوں (Applied Techniques and Methods) کا منظّم مطالعہ (Organised Study) ہے۔ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ علم کی وہ شاخ ہے جو صنعتی فنون' اطلاقی سائنس اور انجینئرنگ وغیرہ سے بحث کرتی ہے۔

ان دونوں کو مربوط کر کے ہم ترجمے کی تکنالوجی کے معنی اخذ کر سکتے

ہیں۔آیئے !ہم اس تصور کو کچھ اور پھیلائیں۔''ترجمے کی تکنالوجی دراصل ایسے نظام' تکنیک اور امدادی وسائل کے ارتقا' انطباق اور استعمال کا نام ہے جس کے ذریعہ مختلف زبانوں میں مواد کی منتقلی کے عمل میں بہتری لائی جا سکے۔'' لہٰذا ترجمے کی تکنالوجی کے مفہوم میں وہ تمام تکنالوجیاں شامل ہیں جو مشینی ترجمہ کے عمل میں استعمال میں آتی ہیں۔

اسی تعریف کو مزید جامع انداز میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔''ترجمہ کی تکنالوجی دراصل عمل ترجمہ اور لسانی نزاکتوں کے سلسلہ میں سائنٹفک علم کا انطباق ہے تا کہ ترجمے کی رفتار اور مقدار میں اضافہ کو اس طرح ممکن بنایا جا سکے کہ معیار متاثر نہ ہو۔''

ایک اور انداز میں ترجمے کی تکنالوجی کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے۔ ''ترجمہ کے عمل میں جدید مہارتوں اور آلات کا انطباق ترجمے کی تکنالوجی کہلاتا ہے۔اس میں وسائل اور طریقوں کے استعمال اور عمل ترجمہ کی تکمیل تک ماحول کا مکمل کنٹرول شامل ہے۔''

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترجمہ کی تکنالوجی:

1. عمل ترجمہ میں جدید مہارتوں اور تکنیکوں کا اطلاق ہے۔
2. جدید طریقوں اور وسائل کے ذریعہ ترجمہ کو آسان بنانا ہے۔
3. موثر اور معیاری تراجم کے لیے ماحول پر قابو پانا ہے۔

درج بالا تمام تعریفوں کے تجزیے کے بعد اور ترجمے کی تکنالوجی کے مفہوم کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''ترجمے کی تکنالوجی تکنیکوں اور طریقوں کی ایسی علمی شاخ ہے جن کے ذریعہ عمل ترجمہ کے اہداف کا تیز رفتار حصول ممکن ہوتا ہے۔''

ترجمے کی تکنالوجی کی خصوصیات

ترجمے کی تکنالوجی کے مفہوم کو اس کی خصوصیات کے مطالعہ کے بعد مزید بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے جو درج ذیل ہیں:

1. اس عمل میں مادخل (In-put) اور ماحصل (Out-put) دونوں پہلو شامل ہیں۔
2. یہ معیاری اور تیز رفتار ترجمے کے لیے جدید طریقوں اور تکنیکوں پر زور دیتی ہے۔
3. اس میں معیار کی برقراری کے لیے مکمل اور منظّم عمل کی تشکیل پر زور دیا جاتا ہے۔
4. اس میں سافٹ ویئر اور ہارڈ ویئر کا استعمال شامل ہے۔
5. یہ ماحول' وسائل اور طریقوں کو کنٹرول کر کے ترجمے میں سہولت بہم پہنچاتی ہے۔

ترجمے کی تکنالوجی دراصل ایک مکمل عمل ہے جو نہ صرف ترجمے کے لیے سہولتوں (facilities) سے بحث کرتا ہے بلکہ اس میں بہتر اور تیز رفتار ترجمے کے لیے مقاصد کا تعین' مواد کا تعین' خودکار ترجمے کی تربیت' طریقے اور وسائل کا استعمال شامل ہیں۔اس میں جدید وسائل کی منظّم منصوبہ بندی' صورت گری' تیاری' انتظام اور ترجمے کے عمل کی جانچ بھی شامل ہے۔

مشینی ترجمہ

ترجمہ کے عمل میں تکنالوجی کے استعمال سے مراد' ترجمے کے لیے تکنالوجی سے وابستہ مشینوں کا استعمال ہے۔اس میں وسیع طور پر برقی اور برقیاتی آلات (Electric and Electronic Tools) شامل ہیں جن کے ذریعہ ترجمے کے عمل میں سہولت ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ترجمے کی تکنالوجی دراصل ترجمے کا مشینی تصور ہے اور

ایسے ترجمے کو جو جدید آلات کے استعمال کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے' مشینی ترجمہ کہتے ہیں۔

مشینی ترجمے کے ذریعے ترجمے کا بنیادی مقصد نہ صرف پورا ہوتا ہے کہ ایک زبان میں موجود معلومات کو دوسری زبان میں پیش کیا جائے بلکہ اس میں فرد کی شخصی محنت کا عنصر کم ہو جاتا ہے اور بڑی مقدار میں مواد کو نہایت تیز رفتاری کے ساتھ دوسری زبانوں میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔اس اہم ترقی نے میدانِ ترجمہ میں بہت زبردست اثرات ڈالے ہیں۔ اس سے عمل ترجمہ آسان ہو گیا' ترجمے کی رفتار میں اضافہ ہوا' خودکار نظام نے انسان کو جسمانی مشقت سے آزاد کیا اور پھر عملی جانچ (Practical Testing) کی خودکاری (Automation) نے معیارات کو بھی گرنے سے بچایا۔ تکنالوجی کی روز افزوں ترقیوں نے اس معاملے میں مائیکرو سطح تک لسانی نزاکتوں کو ملحوظ رکھا ہے اور مزید ترقی کا عمل جاری ہے۔ دُنیا کی کئی زبانوں میں ترجمے کے عمل کو مشینی طریقے کے استعمال سے نہایت فائدہ ہوا۔ دُنیا کی ترقی یافتہ زبانوں مثلاً انگریزی' فرانسیسی' جرمن' جاپانی' چینی' اسپینی' ڈچ' اطالوی' پرتگیزی' روسی اور کوریائی زبانوں نے اس جانب بھرپور پیش رفت کی۔ کمپیوٹر کی وجہ سے یہ کام سہل ہوتا گیا۔ لسانی میدان میں انجینئرنگ کے ماہرین بطور خاص انفارمیشن تکنالوجی اور کمپیوٹر انجینئروں نے اس کام کو آسان بنانے کا مستقل بیڑا اُٹھا رکھا ہے۔ موجودہ رکاوٹوں کو دور کیا جا رہا ہے بلکہ مستقبل میں امکانی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے بھی ماہرین اپنی کوششوں میں مصروف ہیں۔

مشینی ترجمے کی ضرورت

انسان ہمیشہ سے سہولت پسند واقع ہوا ہے۔ ترقی کے لیے ہمیشہ اس نے جدید ترین وسائل کو نہ صرف اپنایا ہے بلکہ ان کی تخلیق کے لیے بھی ہمیشہ ہمہ تن مصروف رہا ہے۔ الفاظ کی منتقلی کے لیے ایک طویل عرصے تک صرف قرطاس وقلم انسان کے مددگار رہے لیکن اس کے ذریعہ علوم کی ترسیل یا مختلف زبانوں میں منتقلی بہرحال انسان کی محدود صلاحیتوں کے ساتھ مشروط تھی۔ دوسرے اس میں وقت بھی کافی لگتا تھا۔ دورِ جدید میں انسانی ترقی نے آسمانوں کو چھونے کی کوشش کی ہے۔ ہر روز نئے نئے موضوعات انسان کی تحقیق کا جزو بنے ہوئے ہیں اور جدید ترین میدانوں میں ترقیات نے نئی نئی ایجادات اور اختراعات کو جنم دیا ہے۔ علم کے پھیلاؤ اور وسعت سے بھرپور استفادہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ دُنیا کے مختلف خطوں میں ہونے والی تحقیقات اور نئے نئے تجربات کو دیگر مقامات تک بھی منتقل کیا جائے اور اس عظیم کام کی تکمیل میں ترجمہ ہی موثر ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اب موجودہ دور میں اگر مثال کے طور پر دیکھا جائے تو معلومات کے خزانوں سے بھرپور استفادے کے لیے انگریزی زبان سے دوسری زبانوں میں علوم کی منتقلی کے بغیر استفادہ ممکن نہیں ہے۔ زیادہ تر کتابیں' مضامین' جریدے اور تحقیقی مواد انگریزی زبان ہی میں دستیاب ہے۔ صرف وہی لوگ جو انگریزی زبان سے واقف ہیں اس سرمایۂ علم سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ انسان اگر کوشش کرے تو چند کتابوں یا ذرائع علم کا اپنی زبان میں ترجمہ کر سکتا ہے لیکن مکمل علمی وسائل سے بہرحال وہ محروم رہے گا۔ جب تک وہ ترجمہ کے کام میں کچھ اور آگے بڑھے گا' زمانہ مزید تیزی کے ساتھ کافی آگے بڑھ چکا

ہوگا۔ نئے نئے مضامین کی آمد اور کتابوں کی اشاعت اتنی تیز ہے کہ انسانی مدد سے ترجمہ ہوتے ہوتے اس موضوع پر کئی دوسری کتابیں یا مضامین شائع ہو جاتے ہیں۔ وہ زبانیں جو ترقی یافتہ نہیں ہیں ان کے لیے تو اور بھی مسائل ہیں۔ اُن کے عوام کے لیے نئی ترقیات سے واقفیت کے لیے کوئی تیز رفتار وسیلہ ہی بہترین ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ یہ کام جدید تکنالوجی کو استعمال کرتے ہوئے انجام دیا جائے تاکہ ترجمے کا کام مشین انجام دے اور ترجمے کی رفتار میں اضافہ ہو۔ اس طرح کسی علمی شہ پارے کے منظر عام پر آنے کے کچھ وقت بعد ہی اس کی ترسیل دیگر زبانوں میں ممکن ہو جائے گی۔ خصوصاً طالبان علم و تحقیق کے لیے یہ مصنوعی ذریعہ کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوگا اس لیے کہ اس طرح اُن کی گہری نگاہیں علوم و فنون کے نہایت باریک گوشوں پر بھی پڑ سکیں گی۔

اس بات کی بھی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے کہ ترجمہ کے اندر یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ انسان کی فطری صلاحیت و مہارت میں فرق ہوتا ہے جس کا اثر ہمیشہ ترجمہ اور ترجمان پر پڑتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ کسی فرد میں ترجمہ کی مطلوبہ صلاحیتوں کی افزائش کے لیے وقت اور پیسہ دونوں ہی کافی مقدار میں درکار ہوتے ہیں۔ لیکن اگر پیمانوں کو متعین کر کے مشینی ترجمہ کا اہتمام کیا جائے تو ترجموں میں یکسانیت اور ہم آہنگی کا فروغ بڑی حد تک ممکن ہے۔

یہ بات صارفین (Consumers) کے نقطہ نظر سے بھی اہم ہے کہ پیداوار (Production) اگر کم قیمت ہو تو بازار (Market) میں وسیع پیمانے پر جگہ بنالے گی

اور صارفین کو زیادہ فائدہ پہنچاتے ہوئے مقبول عام ہوگی۔ اگر مشینی ترجمہ کو تجارتی نقطہ نظر (Business Point of View) سے دیکھا جائے تو یہ عہد حاضر کی بنیادی ضرورت بن چکا ہے۔ انٹرنیٹ کی ترقی نے مشینی ترجمے کی ضرورت و اہمیت میں بیش بہا اضافہ کر دیا ہے اور علمی وسائل تک رسائی کے امکان نے مشینی ترجمے کے مستقبل کو نہایت ہی روشن کر دیا ہے۔ آج کے دور میں مشینی ترجمے کی اہمیت سیاسی طور پر بھی تسلیم کی جا چکی ہے۔ کئی بین الاقوامی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں مشینی ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے گفتگو، تقریریں، تنقید و تعریف کے علاوہ کتابیں، دستاویزات اور رسائل و جرائد کا ترجمہ مشین یعنی کمپیوٹر کے استعمال کے ذریعہ ایک اہم ضرورت بن چکا ہے۔ مثال کے طور پر اقوام متحدہ کے آڈیٹوریم میں نصب مائیکروفونس مشینی ترجمہ کی خودکار صلاحیتوں سے آراستہ آلات سے لیس ہیں جس کی وجہ سے مختلف ممالک کے لوگ اپنی مادری زبان میں مقرر کے خیالات و احساسات کو پا سکتے ہیں۔ ہندوستانی پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ اینکسی میں بھی اس طرح کی سہولت موجود ہے مگر یہاں ترجمے کا کام مشین نہیں کرتی بلکہ مختلف زبانوں کے مترجمین کرتے ہیں۔ مشینی ترجمے نے انٹرنیٹ پر موجود علمی مواد کے تیز رفتار ترجمے کو ممکن بنا کر دُنیائے ترجمہ میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔

مشینی ترجمے کا آغاز و ارتقا

ترجمے کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مشینی ترجمہ دراصل ترجمہ کی تاریخ کے چوتھے دور (یعنی 1960ء سے آج تک) سے تعلق رکھتا ہے۔ ٹائپ رائٹر اور پرنٹر جیسی مشینوں کی ایجاد نے انسان کو اس بات کا فہم عطا کر دیا تھا کہ وہ

الفاظ کی منتقلی کے لیے آلات کا استعمال کرنے لگیں۔ ابتدائی دور میں امریکا اور روس میں اس سلسلے میں تجربات کیے گئے۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ ابتدائی تجربات نے انسان کو بڑی کٹھن آزمائشوں میں مبتلا کر دیا۔ 1970ء کی دہائی میں یہ مسائل شدید اختلافات تک پہنچ گئے۔ ماہرین لسانیات (Linguists) اور ماہرین تکنالوجی (Technologists) کے مابین ہمیشہ دو گروہ کام کرتے رہے۔ خصوصاً اکثر زبان کے ماہرین کا یہ ماننا رہا کہ مشینی ترجمہ محض ایک خیالی خاکہ یا تصور ہے اور عملاً ناممکن ہے۔ مختلف زبانوں کا تنوع ان کی ہمہ گیریت اور مخصوص تہذیب کے ساتھ ان کے رشتے کو دیکھا جائے تو ایک مشین کے لیے یہ بات ممکن نہیں محسوس ہوتی تھی کہ وہ خود سے ترجمے کا عمل انجام دے سکے۔ 1970ء کی دہائی کا یہ دور کبھی ''دورِ سیاہ'' سے تعبیر کیا گیا اور کبھی ''دورِ اختلاف'' سے۔

1960ء میں بورس پیوزنر (Boris Pevzner) نے روس میں لسانی انجینئری (Language Engineering) کا کام شروع کیا تھا جب کہ ان کے شاگرد میخائل بلیخمان (Michael Blekhman) بھی 1970ء کی دہائی کے نصف میں اس میدان تحقیق میں شامل ہو گئے تھے۔ 1970ء کی دہائی کے دورِ اختلاف کو دیکھیں تو دو بڑے گروپ اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ ایک عملی گروہ تھا جو انجینئروں پر مشتمل تھا اور جس کا ایقان تھا کہ مشینی ترجمہ عملی طور پر ممکن ہے۔ وہ اس میدان میں کوشاں بھی تھے۔ اس گروہ کی قیادت رائے منڈ پیوٹروسکی (Raimund Piotrowski) کر رہے تھے اور دوسرا نظریاتی گروہ تھا جو ماہرین لسانیات پر مشتمل تھا۔ یہ گروہ اول الذکر گروہ کی

شدید مخالفت کر رہا تھا۔ اس کی قیادت موقر ماہر زبان پروفیسر آئیگور میلچک (Igur Melchuk) اور پروفیسر یوری آپریشین کر رہے تھے۔ کچھ اس طرح کی کیفیات امریکا اور دیگر علاقوں میں بھی پائی جاتی تھیں۔

1970ء کی دہائی میں ترجمہ کی خودکاری یا ترجمہ کی تکنالوجی پر کام کرنے والے جیالوں کی محنتوں نے 1980ء سے قبل ہی نتائج دینے شروع کر دیے تھے اور اُمید کی ایک کرن میدانِ ترجمہ میں اُبھرتی ہوئی نظر آنے لگی۔ ابتدائی دور میں یہ ترجمے بڑے ہی ناقص اور کمزور ہوا کرتے تھے اور اس میں انسانی صلاحیتوں کا بے پناہ استعمال ضروری رہتا تھا۔ یہ ترجمے محدود اور متعین قسم کے مواد ہی کے لیے کامیاب محسوس کیے گئے لیکن ہر اگلا تجربہ کارآمد اضافوں اور بہتری کے لیے نئے راستے کھولتا چلا گیا۔ 1980ء کی دہائی میں مشینی ترجمہ کی کامیابی اس بات سے محسوس کی جاسکتی ہے کہ تجارتی سطح پر مشینی ترجمے کا آغاز ہو گیا۔ چنانچہ 1983ء میں پہلی دفعہ PC یعنی پرسنل کمپیوٹر (Personal Computer) کے لیے ترجمے کا سافٹ ویئر تیار ہوا جس کا نام Vasconcellos تھا۔ اور آج مشینی ترجمے کے کئی سافٹ ویئر بازار میں دستیاب ہیں۔

کمیشن آف یورپین کمیونٹیز (Commission of European Communities) نے 1976ء میں یہ فیصلہ کیا کہ انگریزی اور فرانسیسی زبان کے درمیان مشینی ترجمے کے امکانات کا جائزہ لیا جائے اور ایک سافٹ ویئر تیار کیا جائے۔ اس کا نام سسٹران (Systran) رکھا گیا۔ رائے منڈ پیوٹروسکی (Raimund Piotrowski) نے 1970ء کے ابتدائی ایام ہی میں آل یونین لنگوسٹکس گروپ

تشکیل دی تھی جس کا نام اُنہوں نے اسٹیٹسٹکا ریچی (Statistica Rechi) یعنی تقریری شماریات (Speech Statistics) رکھا تھا۔تقریری شماریات کے قزاقستانی تحت گروپ کے افراد کی جانب سے چمکنٹ ٹیچرس ٹریننگ کالج' قزاقستان پر 1976ء ہی میں پہلا قابلِ عمل سوویت مشینی ترجمہ کا نظام (First Operational Soviet Machine Translation System) تیار کیا گیا۔ اس گروپ کی قیادت پروفیسر کے بیخ تیوف(Prof. K. Bekhtayev)اور پروفیسر پی ساچی کووا (Prof. P. Sadchikova) کررہے تھے۔اس نظام کو آئی بی ایم کمپیٹیبل مین فریمس (IBM Compatible Mainframes)پر چلایا گیا۔ اس میں انگریزی ۔روسی زبانوں میں لفظ بہ لفظ' محاورہ بہ محاورہ ترجمے کے لیے ایک کیمیائی پیٹنٹ (Chemical Patent) کے مواد کا ترجمہ کیا گیا۔اس ترجمے کے طریقے کو بعد میں انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری قزاقستان اکیڈمی آف سائنس میں استعمال کیا گیا۔ پیوٹروسکی کے ایک دوست پروفیسر یوری مارچک جو ماسکو کے رہنے والے تھے'آل یونین سنٹر فار ٹرانسلیشن کے ڈائرکٹر تھے۔اُنہوں نے تین مشینی ترجموں کے سسٹم کا احاطہ کرنے والے ایک پروجکٹ کی قیادت کی تھی۔ یہ تین سسٹم انگریزی۔ روسی زبان (AMPAR) ' جرمن۔روسی زبان (NERPA) اور فرانسیسی۔روسی زبان (FRAP) تھے۔ 1977ء میں AMPAR نظام نافذ کر دیا گیا تھا۔ 1978ء میں مانٹریال یونیورسٹی کناڈا میں TAUMMETEO سسٹم تیار ہوا جو کناڈا کی موسمی اطلاعات کی ایجنسی کے لیے بنایا گیا تھا کہ انگریزی میں موسمیاتی اطلاعات کا فرانسیسی ترجمہ کیا جا سکے۔اس میں تقریباً

1500 الفاظ (اصطلاحات) کا ذخیرہ استعمال کیا گیا تھا۔

1993ء میں بین الاقوامی مشینی ترجمہ کی انجمن انٹرنیشنل اسوسی ایشن آف مشین ٹرانسلیشن' امریکا نے مشینی ترجمہ کے 72 استعمال کنندگان کا ردعمل جاننے کے لیے ایک سروے کیا جن میں سے 38 نے جواب دیے۔ان میں سے 16 امریکا'11 یورپ اور 11 جاپان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے 82 فیصد لوگوں نے 17 مختلف سسٹمس (نظاموں) میں مشینی ترجمہ کا استعمال کیا تھا۔ یہ لوگ 25 ہزار سے 45 لاکھ الفاظ کا ترجمہ کررہے تھے۔1993ء ہی میں چین کی ایک کمپنی نے' جس کا نام چائنا نیشنل سافٹ ویئر اینڈ ٹکنالوجی سروس کمپنی ہے' چینی زبان سے انگریزی میں مشینی ترجمہ کا نظام پیش کیا جو SINO-TRANS کے نام سے موسوم ہے۔اس کی بنیادی لغت میں چار ہزار سے زائد الفاظ شامل ہیں۔اور یہ 1000 سے زائد لسانی قواعد وضوابط سے آراستہ ہے۔1996ء میں قنغاوا یونیورسٹی (Qinghava University) کے کمپیوٹر سائنس کے شعبہ میں جاپانی زبان سے چینی زبان کے ترجمہ کا سسٹم EBMT شروع ہوا۔ 1998ء میں چینی لینگویج پروسیسنگ پروجیکٹ تکمیل کو پہنچا۔1999ء میں چین میں کارپس کی تیاری کا کام شروع ہوا جس میں 25 ملین چینی الفاظ کی شمولیت متوقع تھی۔ 2001ء میں چینی حکومت کی مدد سے خودکار تقریر سے تقریر کے انگریزی۔چینی زبان کے پروجیکٹ اور نیچرل لینگویج پروجیکٹ بشمول مشینی ترجمہ کا آغاز ہوا۔جاپان میں جاپانی۔انگریزی' جاپانی۔ مالے اور جاپانی۔چینی زبان میں پروجیکٹس جاری ہیں اور تقریری ترجمہ کے لیے ATR:C-Stan جیسا نظام موجود ہے۔ 1996ء میں تھائی

لینڈ کی حکومت نے بھی مشینی ترجمہ کے میدان میں پیش قدمی کی اور وہاں IT-2000 پروگرام کے تحت کام شروع کیے گئے۔ وہاں ویب پر مبنی ایک لغت (Lexitron) کی تیاری جاری ہے جو انگریزی۔تھائی زبان میں ہے۔اس کے علاوہ PARSIT ترجمہ کا نظام بھی جاری ہے جس میں انگریزی۔تھائی اور دیگر زبانوں کا ترجمہ پیش نظر ہے۔کوریا میں انگریزی سے کوریائی زبان کے لیے KAIST پروجیکٹ جاری ہے جس کی اعانت وہاں کی وزارت سائنس و تکنالوجی کررہی ہے۔ انگریزی۔کوریائی زبان کے لیے Caption/EK اور KE-ETRI پروجیکٹ بھی شروع کیے گئے اور چینی کوریائی مشینی ترجمے کے لیے Pohang University of Science & Technology ' KAIST ' ETRI (کوریائی۔چینی) جیسے پروجکٹس جاری ہیں۔1990ء سے 2001ء کے دوران ہندوستان کی حکومت نے بھی مشینی ترجمہ کے لیے قابل قدر پروجیکٹس لیے ہیں جس میں درج ذیل اہم ہیں:

1990-91 کے دوران TDIL (ٹکنالوجی ڈیولپمنٹ ان انڈین لینگویجز) پروجیکٹ پر کام ہوا۔اس میں کارپورا (Carpora) کے فروغ' اوسی آر (Optical Character Recogniser)' متن سے تقریر' مشینی ترجمہ' کی بورڈ کے معیارات اور معلومات کے آپسی تبادلے کے لیے بین الاقوامی قواعد کی تیاری کا کام شامل ہے۔ 2000-01ء میں سات اہم اقدامات ہوئے۔ان میں معلوماتی وسائل' معلوماتی ذرائع' ترجمہ کے لیے اعانتی نظام' انسانی مشینی انٹرفیس سسٹمس' لوکلائزیشن' اسٹنڈرڈائزیشن اور لسانی تکنالوجی کے انسانی وسائل کا فروغ شامل ہیں۔ ہندوستان میں ہندوستانی زبانوں

کی تکنالوجی کے لیے 2010 ویژن تیار کیا گیا۔اس کا ویژن ذیل میں بیان کیا گیا ہے:

"Digital unite & knowledge for all."

(ڈیجیٹل اتحاد اور سب کے لیے علم)

ہندوستان میں مشینی ترجمہ کی اہمیت اور موجودہ صورتحال

اکیسویں صدی کے آغاز میں دُنیا میں سافٹ ویئر تکنالوجی کا گویا سیلاب آ گیا اور اس کا استعمال ترجمہ کے میدان میں بھی ہوا۔ ہندوستان گرچہ ایک ترقی پذیر ملک ہے مگر اس کے باوجود سافٹ ویئر تکنالوجی میں اس نے دُنیا بھر میں زبردست انسانی وسائل مہیا کیے ہیں اور کررہا ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ دُنیا کے ترقی یافتہ ممالک کو سافٹ ویئر میدان میں انسانی وسائل کی فراہمی کے علاوہ آؤٹ سورسنگ کے ذریعہ بھی کمپیوٹر سافٹ ویئر پیکیجز کی تیاری میں ہندوستان کا زبردست کردار رہا ہے۔لسانی مسائل کی باریکیوں کو سمجھنے میں بھی اس ملک کی نوعیت اس لحاظ سے منفرد سمجھی جاسکتی ہے کہ دُنیا کی زبانوں اور بولیوں کی بڑی تعداد اس ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

ہندوستان جیسے وسیع وعریض ہمہ لسانی ملک میں ایک زبان کے مواد کی دوسری زبان میں منتقلی ایک فطری مطالبہ ہے۔اکثر و بیشتر ریاستی حکومتیں اپنی ریاستی زبانوں میں اپنا کام انجام دیتی ہیں جب کہ مرکزی حکومت کے لیے تمام معاملات میں دو زبانیں یعنی ہندی اور انگریزی مستعمل ہیں۔ ریاستی اور مرکزی حکومت کے درمیان بہتر تال میل کے لیے متعلقہ رپورٹس اور دستاویزات کے تراجم نہایت ہی ضروری ہیں۔مترجمین کی قلت کی وجہ سے بہت ساری معلومات یا تو ضائع ہو جاتی ہیں یا پھر ان کو صحیح وقت پر دوسری

زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا جس کی وجہ سے حکومت کے معاملات میں معیار کا فقدان محسوس ہوتا ہے۔ ان مسائل کا حل یا تو مشین اعانتی تراجم ہیں یا پھر مترجمین کی کھیپ تیار کرتے رہنا ہے۔ مرکزی وزارت اطلاعاتی تکنالوجی حکومت ہند (Ministry of Information Technology - http://www.mit.gov.in) نے بعض مخصوص میدان میں ترجموں کے نظام کی نشاندہی کی ہے جن میں حکومت کے انتظامی طریقے اور فارمیٹس، پارلیمنٹ کے سوالات وجوابات، فارمیسی سے متعلق معلومات، قانونی اصطلاحات اور اہم فیصلے جیسے اہم علاقے شامل ہیں۔ 91-1990 ہی میں وزارت مذکورہ نے ایک اہم پروجیکٹ ہندوستانی زبانوں کے لیے تکنالوجی کا فروغ - (Technology Development for Indian Languages TDIL) کی شروعات کر دی تھی تاکہ ہندوستانی زبانوں میں معلومات کی پروسیسنگ کا آغاز ہو جائے جس میں دیگر کاموں کے علاوہ مشینی ترجمہ بھی شامل ہے۔

TDIL پروجیکٹ کے مالی تعاون سے ہندوستانی زبانوں میں ایک مشین اعانتی ترجمہ کا نظام Anusaaraka تیار ہو چکا ہے۔ انوسارا کا نظام اصل زبان کا مخصوص خاکہ ہدفی زبان سے قریب ترین زبان میں پیش کرتا ہے۔ اس خاکہ میں اصل زبان (Source Language) کے ایسے الفاظ ہدفی زبان (Target Language) کے ترجمہ میں بہر حال شامل ہو جاتے ہیں جن کا کوئی متبادل لفظ ہدفی زبان میں موجود نہیں ہوتا ہے۔ انوسارا کا کو پانچ زبانوں کی جوڑیوں کے لیے تیار کیا گیا۔ وہ زبانیں ہیں: تلگو۔ کنڑا۔ مراٹھی۔ بنگالی اور پنجابی۔ ان سب کی ہندی کے ساتھ

جوڑی تیار کی گئی ہے۔ یہ بات خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ہے کہ ان تمام زبانوں میں انوسارا کا کوای میل ذریعہ سے استعمال کے قابل بنایا گیا ہے۔ انوسارا کا پروجکٹ پر کام انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کانپور میں شروع ہوا۔ بعد میں اس پر عمل آوری لینگویج ٹکنالوجیز ریسرچ سنٹر، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹکنالوجی حیدرآباد میں ستیم کمپیوٹرس پرائیوٹ لمیٹیڈ کے مالی تعاون سے ہوئی۔ اس تحقیقاتی گروپ کی سربراہی پروفیسر راجیو سنگل کر رہے ہیں۔

نیشنل سنٹر فار سافٹ ویئر ٹکنالوجی (NCST) میں معلومات پر مبنی کمپیوٹر نظام کے شعبہ (Knowledge Based Computer Systems Division-KBCS) کے لیے معروف نیچرل لینگویج گروپ کی جانب سے ماترا (MaTra) پر کام ہو رہا ہے۔ ماترا دراصل انسان اعانتی منتقلی پر مبنی ترجمہ کا نظام (Human Aided Transfer based Translation System) ہے جو انگریزی سے ہندی ترجمہ کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ سارا کام بھی TDIL کی مدد سے انجام پا رہا ہے۔ اسی طرح صحت عامہ کی مہمات میں مدد دینے کے لیے تیار کردہ مخصوص پروگرام انگلا بھارتی (ANGLA BHARTI) ہے، جو عملی طور پر نافذ بھی کیا جا چکا ہے۔ انگلا بھارتی کا یہ پروجکٹ پروفیسر آر ایم کے سنہا (Prof. R. M. K. Sinha) نے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی، کانپور میں 1991 میں شروع کیا تھا تاکہ انگریزی سے ہندوستانی زبانوں کے تراجم میں مشین اعانتی نظام سے استفادہ حاصل کیا جاس کے۔

سنٹر فار ڈیولپمنٹ اینڈ ایڈوانسڈ کمپیوٹنگ (CDAC) نے ملٹی لنگول پاکٹ ٹرانسلیٹر ڈیزائن پروجکٹ (Multi Lingual Design Translator Project) پر کام کی ذمہ داری لی ہے۔ ان کے ذہن کے مطابق یہ کام درحقیقت ان بیرونی سیاحوں کے لیے کافی مددگار ثابت ہوگا جو ہندوستان میں سیر وتفریح کے لیے آتے ہیں لیکن زبان کے فرق کی وجہ سے اکثر معلومات کے حصول یا مواقع سے استفادہ کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ امید ہے کہ اس طرح کا پاکٹ ٹرانسلیٹر خود ہندوستان میں بھی ایک ریاست سے دوسری ریاست تک سفر کرنے والوں کے لیے نہایت معاون ثابت ہوگا۔ اسی مرکز CDAC پر انگریزی سے ہندی زبان میں مشینی ترجمہ کے نظام کی تیاری کا کام بھی ہو رہا ہے جس میں تینوں زبانوں کے گرامر پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔

کلکتہ کی جادوپور یونیورسٹی (Jadavpur University) میں کمپیوٹر سائنس اور انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ پر انوباد (Anubaad) پروجکٹ کے تحت انگریزی سے ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کے لیے عمومی مثال پر مبنی مشینی ترجمہ کے نظام (Generalised Example Based Machine Translation) پر کام ہو رہا ہے۔ یہ کام دراصل ڈاکٹر شیواجی بندواپادھیاے (Dr. Shivaji Bandyopadhyay) کے تحقیقاتی ایوارڈ گرانٹ کے تحت انجام دیا جا رہا ہے جس کے لیے یو جی سی نے 1999ء میں مزید امداد منظور کر کے ان کے حوصلے بلند کیے ہیں۔

مشینی ترجمہ اور کمپیوٹر اعانتی ترجمہ

مشینی ترجمہ دور حاضر کی ترقیوں سے استفادہ کی موثر مثال ہے جس میں مواد

کی ایک زبان سے (اصل زبان) دوسری زبان (ہدفی زبان) میں منتقلی کے لیے انسان کے بجائے مشین ترجمہ کا کردار ادا کرتی ہے۔ ابتدائی دور میں یہ مشین مینول (Manual) یا دستی مشینیں تھیں لیکن الکٹرانکس کی ترقی نے ان مشینوں کے معیار اور ان کے ذریعہ انجام پانے والے کاموں کی رفتار دونوں میں زبردست تبدیلیاں کر دیں۔ اس طرح ترجمہ کے عمل میں استعمال ہونے والی مشینوں میں کمپیوٹر کی ایجاد نے بھی انقلاب برپا کر دیا۔ اور آج دور حاضر میں مشینی ترجمہ کا نام آتے ہی کمپیوٹر کی تصویر ہماری نگاہوں میں آ جاتی ہے۔

عملاً کمپیوٹر اعانتی ترجمہ دراصل ایک نہایت ہی پیچیدہ عمل ہے جس میں ایسے مخصوص آلات اور ٹکنالوجی کا استعمال ہوتا ہے جو ترجمہ کرنے والے کی ضروریات کی تکمیل کرتے ہوں، جن کی تمام کاموں میں شمولیت ہوتی ہے نہ کہ صرف محدود سطح پر۔ ایسے ترجموں میں کمپیوٹر دراصل ایک کارگاہ (Work Station) بن جاتا ہے جہاں مترجم کو مختلف النوع مواد، وسائل اور پروگرامس مہیا ہوتے ہیں جیسے یک لسانی یا ذولسانی لغتیں، متوازی متن، ترجمہ شدہ مواد جو مختلف زبانوں بشمول اصل زبان اور ہدفی زبانوں میں موجود رہتا ہے، اصطلاحات کا جامع سرمایہ وغیرہ۔ ہر مترجم کمپیوٹر کے ہمراہ اپنے مخصوص ترجمے کا ماحول تیار کر لیتا ہے اور کمپیوٹر کی مدد سے ترجمے کے اہداف کی تکمیل کرتا ہے۔ اس طرح کمپیوٹر اعانتی ترجمہ دراصل مترجم کو برموقع اور برمحل (On the Spot) لچک (Flexibility) اور حرکت وعمل کی ایسی آزادی دیتا ہے جس سے مترجم کو نہ صرف اپنے کام میں سہولت فراہم ہوتی ہے بلکہ اس کی معلومات میں بھی تازگی پیدا ہوتی ہے جس سے

وقت کی بے پناہ بچت ہوتی ہے۔کمپیوٹر اعانتی ترجمہ دراصل مشینی ترجمہ کی وہ ترقی یافتہ شکل ہے جس میں کمپیوٹر ایک مشین کا کردار ادا کرتا ہے۔ایک ایسی مشین کا جو ہمہ پہلو بھی ہے اور ہمہ جہتی سہولتوں سے آراستہ بھی' تیز رفتار بھی ہے اور وسعت کی حامل بھی۔اس طرح کمپیوٹر اعانتی تراجم میں فرد اور مشین دونوں کا بہترین تال میل رہتا ہے۔

مشینی ترجمہ کا عمل

مشینی ترجمہ میں مشین انسانی دماغ کا کردار ادا کرتی ہے۔ترجمہ کے عمل میں مشین کی مخصوص انداز میں تیاری نہایت اہم ہے۔اس مشین کے فہم اور یادداشت میں وہ تمام باتیں ڈال دی جاتی ہیں جو ایک انسانی دماغ کے اندر ممکن العمل ہیں۔مثلاً کسی مخصوص زبان کے حروف' اشارات' الفاظ' محاورے' استعمال کے ماحول کے ساتھ الفاظ کے مفہوم کی تبدیلیاں' مخصوص اصطلاحات' صرف ونحو کے ضابطے اور قاعدے' لسانی باریکیاں اور لسانی اصول' ادبی نزاکتیں' الفاظ اور اصطلاحات کے ہمہ پہلو مفاہیم' صوتی تبدیلیاں' املا کے اصول وغیرہ۔اور جب یہ مشین مکمل طور پر تیار ہو جائے تو پھر اس میں ہدفی زبان سے متعلق بھی درج بالا تمام ضروری باتوں کو سمو دیا جاتا ہے۔اس طرح یہ مشین اب کام کے لیے تیار ہوگئی۔ اب اس میں آٹو میٹک تبدیلیے (Automatic Convertors) کا استعمال کیا جاتا ہے جو یا تو کوئی آلہ (ہارڈ ویر) ہوتا ہے یا پھر کوئی پروگرام (سافٹ ویر) اور اصل زبان کے متن کو اس مشین کے حوالے کیا جاتا ہے تاکہ وہ حسب حکم اپنا کام انجام دے۔اور پھر حسب منشا اور دستیاب سہولتوں کو استعمال کرتے

ہوئے متن کو دوسری مطلوب زبان میں حاصل کرلیا جاتا ہے۔ یہ پورا عمل تحریری اور تقریری دونوں طور پر ممکن ہے۔ یہ اتنا تیز رفتار ہے کہ اس میں پلک جھپکتے ہی مطلوبہ مواد ہدفی زبان میں حاصل کرلیا جاتا ہے۔

مشینی ترجمہ کے عمل میں مشین کا کردار ہی مرکزی ہوتا ہے۔اس لیے اسے استعمال کرنے والے کو مشین کی ساخت' اس کے استعمال کے طریقوں اور اس کی تمام نزاکتوں سے مکمل طور پر واقف ہونا ضروری ہے۔مشین ایک ایسا آلہ ہے جو ہارڈ ویر اور سافٹ ویر دونوں پر مشتمل ہوتی ہے۔لہٰذا اسے استعمال کرنے والے کو اس کے ہارڈ ویر سے مکمل واقف ہونا اور اس کے پروگراموں کے استعمال کے طریقوں پر مکمل گرفت ضروری ہے۔ موجودہ دور میں اس طرح کی واقفیت کے لیے خود مشین کے ہمراہ بھی Help ہینڈ بک کے عنوان سے معلوماتی مواد / کتابچہ فراہم کر دیا جاتا ہے یا اسے بھی مشین میں سافٹ مواد کی شکل میں لوڈ کر دیا جاتا ہے تاکہ استعمال کرنے والا فوری طور پر اُس سے استفادہ کر سکے یا اپنی مشکل آسان کر سکے۔

ترجمہ میں استعمال ہونے والی مشین اپنے ساتھ زائد اشیا (Accessories) بھی رکھتی ہے۔ان زائد اشیا کو بھی غیر اہم نہیں سمجھا جاسکتا۔ دراصل مشین انسان کے غلام کا کردار ادا کرتی ہے اور اس کی صحت وعافیت کا کارکردگی اور نتائج پر غیر معمولی اثر پڑتا ہے۔

مشینی ترجمہ کرتے ہوئے یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ترجمہ کے لیے استعمال ہونے والی مشین عموماً فروغ پذیر (Developing) ہوتی ہے۔اسے بنانے والی ایجنسیوں کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ استعمال کنندہ وقتاً فوقتاً مشین کی قابلیت میں اضافہ کر سکے اور حسب موقع وضرورت مشینی دماغ میں جدید معلومات اور ڈاٹا کا ادخال ممکن ہو سکے۔

دور جدید کی ترقیات نے تو ان مشینوں کے استعمال کو بھی نہایت آسان بنا دیا ہے اور مزید سہولت کے لیے یوزر فرینڈلی (User Friendly) یا سہل الاستعمال مشینوں کا چلن اب عام ہو چکا ہے۔ جہاں انگلی کے ایک اشارے سے سارے مطلوبہ کام نہایت قلیل وقت میں انجام پا جاتے ہیں۔

انسانی تراجم بمقابل مشینی تراجم

	انسانی تراجم	مشینی تراجم
1	انسان کے ذریعہ ترجمہ کے عمل میں زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔	مشین کے ذریعہ کم وقت میں کام انجام دیا جا سکتا ہے۔
2	انسان محدود مقدار میں ترجمہ کا کام کر سکتا ہے۔	مشین کے ذریعہ بڑی مقدار میں ترجمہ کا کام انجام پا سکتا ہے۔

3۔	انسان کے ذریعہ کیے جانے والے ترجموں کا معیار مترجم کی صلاحیت پر منحصر ہوتا ہے۔	مشین کے ذریعہ ہونے والے تراجم ابتدا میں ناقص ہوتے ہیں لیکن مشین کے معیار میں تبدیلی اور زائد لسانی امکانات سے اسے آراستہ کرتے ہوئے ترجمہ کے معیار کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔
4۔	انسانی ترجمے کا معیار یکساں نہیں ہوتا اس لیے کہ ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق ترجمہ کرتا ہے۔	مشینی ترجموں کا معیار یکساں ہوتا ہے اس لیے کہ ایک دفعہ معیارات متعین ہو جائیں تو مشین میں وہ غیر متبدل ہوتے ہیں۔
5۔	انسانی مترجمین کی قلت ہر وقت محسوس کی گئی ہے۔	مشین تیار ہونے کے بعد ان کی فراہمی کہیں بھی اور کسی بھی جگہ ممکن ہے۔
6۔	انسانی ترجمے کے لیے اخراجات زیادہ ہوتے ہیں۔	مشینیں معیاری تراجم نہایت کم داموں میں فراہم کر سکتی ہیں۔
7۔	اکثر و بیشتر انسان مقررہ مدت میں ترجمہ نہیں کر پاتے۔	پابندی وقت مشینی ترجمہ کی اہم ترین خصوصیت ہے۔

8۔ انسانی ترجمہ علوم کی فی الفور متعلقہ زبان میں منتقلی کا کام مکمل طور پر انجام نہیں دے سکتے۔ اور جب تک ترجمے ہو پاتے ہیں، علم مزید ترقی کر جاتی ہے۔

علوم وفنون کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ ساتھ ان کی دوسری زبانوں میں فی الفور منتقلی ممکن ہے۔

9۔ انسان کی صحت اور اس کی زندگی کے مسائل اکثر وبیشتر مترجمین کے لیے رکاوٹ بنتے ہیں۔ اور ترجمہ کرانے کے لیے ہر وقت مترجمین کے پیچھے لگے رہنا پڑتا ہے۔ جس کے باعث انسانی وسائل کا بے شمار زیاں اور غیر ضروری استعمال بھی ہوتا ہے۔

مشین کی خرابیاں انسان دور کرسکتا ہے اور پھر مشین فوراً کام کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

10۔ ایک ہی متن کو کئی زبانوں میں ترجمہ کرنے کے لیے الگ الگ ماہرین کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور پھر ان کا بھی اصل زبان اور ہدفی زبان دونوں سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے۔

مشین کے لیے یہ کام مشکل نہیں اور وہ بہ آسانی یہ کام انجام دے سکتی ہے۔ مشینوں کو دونوں زبانوں کے مطلوبہ معیار کے مطابق ماہرین زبان کی نگرانی میں تیار کیا جاسکتا ہے۔

11۔ مختلف مضامین کے ترجموں میں متعلقہ مضامین کے ماہرین یا کم از کم پوری طرح معلومات رکھنے والے ایسے افراد کی ضرورت پڑتی ہے جو دونوں زبانوں پر اچھی دسترس رکھتے ہوں۔

ایسی مشینیں تیار ہوچکی ہیں جو مضمون اور زبان دونوں پر دسترس رکھتی ہیں۔

12۔ ہر جگہ دستیاب نہیں ہوتے۔

ہر جگہ دستیاب ہوسکتی ہے۔

مشینی تراجم کے مختلف استعمال

مشینی ترجمہ انٹرنیٹ اور ''علمی دھماکے'' کے اس دور میں نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔

انفرادی طور پر مشینی ترجمہ کے درج ذیل استعمال ممکن ہیں:

1۔ اپنی پسند اور ذوق کی کتابوں، رسائل اور جرائد کے تیز رفتار ترجمہ کے لیے

2۔ اہم دستاویزات اور فی الفور مطلوب مواد کے ترجمہ کے لیے

3۔ انٹرنیٹ پر موجود معلومات سے بھرپور استفادہ کے لیے

4۔ مطلوبہ موضوع پر ویب صفحات (web pages) کو حسب شوق یا ضرورت کے مطابق زبانوں میں آن لائن ترجمہ کرنے کے لیے

5۔ ویب چاٹنگ کے موقع پر مختلف علاقوں کے افراد سے رابطہ کے لیے

6۔ تعلیمی وسائل سے استفادہ کے لیے

اداروں اور تنظیموں کے لیے بھی مشینی ترجمہ درج ذیل میدانوں میں نہایت کارآمد ہے:

1۔ تجارتی سطح پر ترجمہ کرنے کے لیے۔ بعد میں اس پر نظر ثانی کے لیے انسانی وسائل کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔

2۔ بڑے کاروباری ادارے یا سرکاری اداروں میں صیغہ راز کی دستاویزات کے ترجمہ کے لیے تاکہ ترجمہ شدہ مواد کہیں پر بھی افشا نہ ہو اور پوشیدہ رہے۔

3۔ حکومتوں اور عوامی فلاح و بہبود کے اداروں کی اس کیموں سے مختلف علاقوں کے عوام کو واقف کرانے کے لیے

4۔ بڑے پیمانے پر تشہیر اور پروپیگنڈہ کے لیے

5۔ فی الفور مطلوب اہم صحافتی مواد اور خبروں کے ترجمہ کے لیے

6۔ انٹرنیٹ کے ذریعہ آن لائن ترجمہ کی سہولت مہیا کرنے والے ادارے اپنے روزمرہ استعمال کے لیے

7۔ تعلیمی ادارے اپنے طلبا کو جدید ترین معلومات سے آراستہ کرنے کے لیے

8۔ حکومتی عہدیداران اور سیاسی قائدین کے دوروں کے موقع پر

9۔ علم اور تحقیق کے میدان میں عملاً مصروف اداروں کے لیے مطلوبہ مواد کے حصول کے لیے

مشینی ترجموں کی کامیابیاں

مشینی تراجم کی زیادہ تر کامیابیاں آن لائن محسوس کی گئیں۔ آج کل تو انٹرنیٹ پر مفت خدمات فراہم کرنے والی مختلف ویب سائٹس موجود ہیں جو آن لائن تراجم کی سہولیات سے استفادہ کنندگان کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔ مثال کے طور پر Google ایک مشہور سرچ انجن ہے لیکن اس کی اضافی خدمات میں ترجمہ کی دو سہولتیں فی الوقت موجود ہیں۔

(i) چند متعینہ زبانوں مثلاً انگریزی، پرتگالی، اسپینی، جرمن، روسی، فرانسیسی، چینی اور عربی زبان وغیرہ میں داخل کردہ مواد کے خودکار ترجمہ کی سہولت موجود ہے۔ یہ تراجم انگریزی سے ان زبانوں میں یا ان زبانوں سے انگریزی زبان میں کیے جاسکتے ہیں۔

(ii) آپ کے مطلوبہ ویب پیج کا ترجمہ درج بالا آٹھ زبانوں میں سے آپ جس

میں بھی چاہیں، فی الفور کیا جا سکتا ہے۔

1993ء میں بین الاقوامی مشینی ترجمہ کی انجمن (International Association of Machine Translation) کی جانب سے، جس کا صدر دفتر امریکا میں ہے، مشینی ترجمہ کے 72 استعمال کنندگان کا ردعمل جاننے کے لیے کیے گئے سروے کے مطابق جواب دینے والے سبھی استعمال کنندگان میں ایک بات مشترک تھی کہ ان کے کیے گئے ترجمے عموماً کسی پروڈکٹ کے ٹکنیکل مینول (Technical Mannual) پر مشتمل تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ٹکنیکل مینول کا مشینی ترجمہ نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اصل میں اس مسئلہ پر تحقیق کرنے والوں اور خود اس طرح کے سافٹ ویر استعمال کرنے والوں نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ مشین کے ذریعہ ترجمے کا عمل ترجمہ کی پیچیدہ نوعیت کا حل نہیں ہے۔ اس لیے مشینی ترجمہ صرف انہیں جگہوں پر استعمال کیا گیا جہاں اس کو کامیابی سے استعمال کرنا ممکن تھا۔ مشینی ترجمہ کے میدان میں یہ تجربات جاری ہیں اور علمی اور فنی مواد اور کتابوں کے لیے ان ترجموں کے بھرپور فوائد سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح صحافتی اور قانونی تراجم کے لیے یہ نہایت موزوں ہیں۔ ادبی اور منظوم ترجموں اور تہذیب وتمدن سے متعلق مواد پر مشینی ترجمہ کو ابھی بہت لمبا سفر طے کرنا ہے۔

مشینی تراجم کے مسائل

مشینی ترجمہ یقیناً ابھی اپنی عمر کے ابتدائی ایام سے گزر رہا ہے۔ ہر روز اس کے قویٰ مضبوط ہو رہے ہیں اور ذہن وسیع تر بنتا جا رہا ہے۔ ابتدائی ایام ہی میں جب مشینی

ترجمہ کا تصور عام ہو رہا تھا محققین نے اس میدان کے بنیادی مسائل کو چیلنج بنا لیا تھا اور ایک عظیم کارنامہ انجام دیتے ہوئے مشینی ترجمہ کی عملیت (Practicability) کو ثابت کر دیا تھا۔

بظاہر مشینی ترجمہ میں کئی مسائل اور پیچیدگیاں محسوس ہوتی ہیں۔ جن سے لگتا ہے کہ مشینی ترجمہ ناممکن العمل ہے۔ لیکن یہ محض خام تصور ہے۔ انسانی ذہن نے متعدد ناکامیوں اور کمزوریوں کا حل بہرحال تلاش کر لیا ہے۔ بقیہ مسائل جو ابھی حل طلب ہیں اُن پر بھی قابو پا لیا جانا قطعی ناممکن نہیں ہے۔ چند اہم مسائل جو آج محسوس ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

1۔ ابہام (Ambiguity): اکثر وبیشتر اصل زبان کے بعض الفاظ یا جملے سمجھنے میں مشین تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے اور ترجمہ کی جگہ کچھ کا کچھ تحریر ہو جاتا ہے۔

(i) ابہام صرفی نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے۔

(ii) یہ ابہام نحوی اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے۔

(iii) یہ ابہام اصل زبان کی تحریر میں غلطی، ہجوں کی غلطی یا کسی لفظ کے چھوٹ جانے سے بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

(iv) مخصوص اصطلاحات کی وجہ سے بھی ممکن ہے۔

(v) اسمائے خاص کی وجہ سے بھی ممکن ہے۔

2۔ جگہ چھوڑ دینا (Blank Space): کبھی کبھی مشین اپنے ترجمہ میں اصل زبان کے الفاظ یا جملوں کو نہ سمجھ کر اس کی جگہ خالی چھوڑ دیتی ہے۔ اس کی چند وجوہات یہ ہیں:

(i) زبانوں کے صرفی/نحوی تفاوت کی وجہ سے

(ii) بالکل جدید الفاظ یا سمجھ میں نہ آنے والی اصطلاحات کی وجہ سے

(iii) لغت کی عدم تکمیل کی وجہ سے

3۔ غلط ترجمہ (Wrong Translation): بعض دفعہ مشین کے ترجمے میں غلط ترجمے آجاتے ہیں:

(i) مشین کے دماغ میں مکمل معلومات کے نہ فراہم کیے جانے کی وجہ سے

(ii) محاوروں کے معاملہ میں صحیح معلومات نہ دینے کی وجہ سے

(iii) کسی تکنیکی خرابی کے باعث

4۔ پیچیدگیاں (Complexities): مشینی تراجم میں کبھی ایسی زبان استعمال ہوتی ہے کہ اصل اور ترجمہ میں زمین آسمان کا فرق ہوجاتا ہے۔ یہ فرق جملوں کی عدم ترتیب یا الفاظ کی غیر مناسب تنصیب کی شکل میں سامنے آتا ہے:

(i) اصل زبان کے طویل اور غیر مربوط جملوں کی وجہ سے

(ii) ہم معنی الفاظ کی کثرت کی وجہ سے

(iii) کسی تکنیکی خرابی کی وجہ سے

مشینی ترجمے کے لیے سب سے بنیادی ہتھیار ایسی ڈکشنریاں یا لغتوں کی تیاری کا کام ہے جو زبان کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مناسب الفاظ کے انتخاب میں معاون ہوں۔ ایسی لغت کو E-Dictionary کہتے ہیں۔ ان لغتوں میں لفظ کی صرفی ونحوی خصوصیات کی وضاحت بھی کردی جاتی ہے۔ جن زبانوں میں اس چیلنج کو قبول کیا گیا وہی زبانیں مشینی ٹرانسلیشن کے میدان میں مثبت نتائج دے پارہی ہیں۔

مشینی تراجم یا کمپیوٹرا عانتی تراجم میں اہم ترین مسئلہ طرزتحریر (Font) کا بھی ہے۔ زبانوں کے مختلف فونٹس کو مشینیں پہچانتی ہیں اور ان کا موثر استعمال کرتے ہوئے عمل ترجمہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ لیکن اگر غیر ترقی یافتہ یا ترقی پذیر زبانوں کے بارے میں سوچا جائے تو ان کے لیے مشینی ترجمہ عملاً اُس وقت تک ناممکن نظر آتا ہے جب تک کہ وہ زبانیں مشینوں کے فہم کے مطابق فونٹ تیار نہ کرلیں۔ یہ فونٹ ایک طرف بآسانی مشین میں داخل کرنے کے قابل ہو اور دوسری طرف مشین میں موجود لسانی تجزیہ نگار آلہ کے لیے قابل استعمال اور قابل رسائی بھی ہو۔

مشینی ترجمہ کے عمل نے تمام زبانوں کے ماہرین کو اس بات پر غور کرنے پر مجبور کردیا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر لسانی ہم آہنگی موجودہ دور کی اہم ترین ضرورت بن چکی ہے۔ کم از کم بعض اہم نکات پر تو زبانوں میں اشتراک اور ہم آہنگی کے بغیر مشینی ترجمہ ناقابل عمل بن جاتا ہے۔

اُردو اور مشینی ترجمہ

اُردو زبان دُنیا کی ترقی پذیر زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ اُردو بولنے اور لکھنے والے افراد کی بڑی تعداد دُنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے۔ اُردو تراجم نے نثری اور شعری تخلیقات کے علاوہ مختلف علوم، مذاہب اور تصوف کا احاطہ کیا ہے۔ صحافتی میدان میں اُردو تراجم کا اہم کردار ہے۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی خبروں سے وابستہ صحافیوں نے انگریزی اور دیگر زبانوں سے اُردو میں تراجم کرتے ہوئے معلومات کو وسیع پیمانہ پر پھیلایا ہے۔ آج ترجمہ اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی بنیادی ضرورت بن گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ

انسانی وسائل کے ساتھ ترجمہ کا کام جاری تو ضرور ہے لیکن اگر تیز رفتار اور بڑی مقدار میں معلومات کا ترجمہ کرنا ہو تو مشینوں (کمپیوٹر) سے استفادہ ناگزیر ہے۔

ہم اس بات سے بھی واقف ہیں کہ معلومات کا زیادہ تر خزانہ چاہے وہ جدید علوم وفنون کی کتابیں ہوں، رسائل وجرائد ہوں یا خبریں اور تبصرے سبھی انگریزی زبان میں موجود اور دستیاب ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جہاں تک اُردو زبان کا معاملہ ہے اس میں علوم وفنون اور دیگر معلومات کا تقریباً سارا ذخیرہ ہی ترجمے کا مرہون منت ہے۔

اُردو زبان میں مشینی ترجمہ کے لیے مقتدرہ قومی زبان، پاکستان نے بھی کافی پیش قدمی کی ہے۔ وہاں کثیر الفاظ پر مشتمل ای ڈکشنریوں کے علاوہ MS Office میں کارکرد فونٹس اور اُردو کی بورڈ وغیرہ تیار کر لیے گئے ہیں۔ پاکستان میں پروفیسر سرمد حسین کی نگرانی میں نیشنل یونیورسٹی فار سائنس اینڈ ٹکنالوجی، لاہور میں بھی مشین ٹرانسلیشن پر بہت بڑے پیمانے پر کام ہو رہا ہے۔ پروفیسر سرمد حسین انفارمیشن ٹکنالوجی اور لسانیات کے حوالے سے عالمی سطح پر مقبول شخصیت ہیں۔ توقع ہے کہ وہاں سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ آئے گا اور اُردو ترجمہ کو بحیثیت مجموعی فائدہ پہنچے گا۔

اُردو زبان میں مشینی تراجم کے سلسلہ میں شروع سے ہی کوئی حوصلہ افزا ردعمل نہیں ملتا ہے۔ محرومی اور احساس کمتری نے بڑی اکثریت کو اُمید اور توقعات سے دور کر دیا۔ اس کا اثر لازماً کسی بھی مقابلہ جاتی میدان میں آگے بڑھنے کی رفتار پر پڑتا ہے۔ اس لیے اُردو زبان میں مشینی ترجمہ آج بھی ابتدائی دور میں ہی ہے۔

ہندوستان میں مشین ٹرانسلیشن پر وزارت انفارمیشن ٹکنالوجی کے تحت گیارہ

ہندوستانی زبانوں میں کام ہو رہا ہے جس میں اُردو ہندی کے علاوہ تلگو، تمل، کنڑ، ملیالم، مراٹھی، گجراتی، بنگالی، پنجابی اور اُڑیا شامل ہیں۔ یہ کام باضابطہ طور پر ستمبر 2006ء میں شروع ہوا اور اسے اُصولاً ستمبر 2008ء میں مکمل ہونا ہے۔ یہ پروجیکٹ اپنی تکمیل کی منزلوں کی جانب تیزی سے گامزن ہے اور توقع ہے کہ ایک سال کے اندر مکمل ہو جائے گا اور ان زبانوں میں آن لائن ترجمے کی سہولت دستیاب ہو جائے گی۔ تکمیل کے بعد ان زبانوں کا کوئی بھی مواد ان میں سے کسی بھی زبان میں دستیاب رہے گا۔ واضح رہے کہ ان گیارہ زبانوں میں چوں کہ انگریزی شامل نہیں ہے اس لیے اس پروجیکٹ کے کامیاب ہونے کے باوجود انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ممکن نہیں ہوگا، جو دراصل اُردو کے لیے سب سے اہم اور بنیادی ضرورت ہے۔

اس پروجیکٹ میں IIIT حیدرآباد، آئی آئی ٹی ممبئی، آئی آئی ٹی الہ آباد، سی ڈیک پونا، سی ڈیک نوئیڈا اور شعبہ سنسکرت حیدرآباد یونیورسٹی شامل ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے پروجیکٹ کی بنیاد اُردو کے پروفیسر رحمت یوسف زئی نے ڈالی تھی جنھوں نے بنیادی طور پر یہ جاننا چاہا تھا کہ کیا کمپیوٹر کے ذریعے انگریزی سے اُردو میں ٹرانسلیشن ممکن ہے؟ اُنھوں نے جب یہ پروجیکٹ پروفیسر امبا کلکرنی (حیدرآباد یونیورسٹی) اور راجیو سنگل (آئی آئی آئی ٹی) کے ساتھ وزارت انفارمیشن ٹکنالوجی میں داخل کیا تو وہاں کے ذمہ داروں نے یہ بات سوچی کہ کیوں نہ اس پروجیکٹ کو ہندوستان کی اہم زبانوں کے لیے ایک ساتھ شروع کر دیا جائے۔ لہٰذا دس زبانوں کا انتخاب کیا گیا اور کام شروع کر دیا گیا۔ حال ہی میں اُن میں گیارہویں زبان کی حیثیت سے اُڑیا کو شامل کیا گیا ہے۔

اس پروجیکٹ میں اُردو اور ہندی زبانوں کو یہ امتیاز حاصل رہے گا کہ پروگرام میں اِن زبانوں میں ترجمے کے ساتھ رومن ترجمہ بھی آیا کرے گا۔ ملتے جلتے اِملا کے الفاظ کے لیے کمپیوٹر (/) لگا لگا کر ترجیح کے اعتبار سے کئی معنی دے دیا کرے گا۔ مثلاً جو کے لیے سب سے پہلے 'جو' پھر جَو اُس کے بعد جُو کے معنی دے گا۔ اس سافٹ ویئر میں ڈکشنری اس طرح فیڈ کی جا رہی ہے کہ الفاظ کی تفصیلات مثلاً واحد جمع' مذکر مونث' مترادف الفاظ اور اُس کا ماخذ وغیرہ کا بھی پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ اس پروجیکٹ میں ابتدائی دنوں میں علی گڑھ مسلم اور پنجابی یونیورسٹیاں بھی شامل تھیں مگر وہ غالباً ٹکنالوجی کی کمی کی وجہ سے الگ ہو گئیں۔ علی گڑھ کو صرف ڈاٹا فیڈ کرنے کا کام دیا گیا تھا۔ اگر اُردو کے حوالے سے بات کی جائے تو اس سافٹ ویئر کی خصوصیت یہ رہے گی کہ اگر آپ کے کمپیوٹر میں اِن پیج یا کوئی اُردو سافٹ ویئر نہیں بھی ہے تو آپ اُردو ٹرانسلیشن حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ پروگرام Simredo 'یونی کوڈ اور یوٹی ایف۔ 8 سافٹ ویئرس میں تیار کیا جا رہا ہے جن کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کہیں بھی کھولے جا سکتے ہیں۔

اُردو زبان کے اپنے کچھ مخصوص مسائل بھی ہیں جن کے باعث مشینی ترجمہ کے میدان میں خاطر خواہ ترقیاں نہیں ہو سکیں۔

اُردو کے ورڈ پراسسنگ کرنیوالے پیکیج (Package) ویسے تو کئی ہیں لیکن ہر ایک میں رمزانے (Coding) کا نظام مختلف ہے۔ یعنی ان پیکیج تیار کرنے والوں نے اپنے اپنے طور پر الگ الگ رمزانے کا نظام (Coding System) تیار کر لیا

ہے۔ ویسے کوڈنگ کے ایک عالمی ادارے Unicode نے جہاں تمام یوروپی زبانوں کے لیے حروف کی کوڈنگ کر لی ہے وہیں حال ہی میں اُردو کے حروف کی بھی کوڈنگ کی ہے اور باضابطہ ایک فونٹ بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ اُردو کی اس کوڈنگ کے نظام کو اُردو سافٹ ویر تیار کرنے والی کمپنیوں نے اختیار بھی کر لیا ہے اور سب سے پہلے BBC کی اُردو سروس نے آن لائن اس کوڈنگ کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اگر اُردو پیکیج تیار کرنے والی تمام کمپنیاں یونی کوڈ کو اختیار کر لیں تو دو مختلف کمپنیوں کے درمیان ہم آہنگی اور باہمی تبادلہ ممکن ہو سکتا ہے۔ اور اس سے معلومات کے تبادلے کی رفتار میں کئی گنا اضافہ ممکن ہے۔ یہاں ایک اور بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یونی کوڈ کا کوڈنگ نظام نستعلیق کے لیے کارآمد نہیں ہے۔

اُردو زبان میں جملوں کی ساخت کا یوروپی زبان کے جملوں کی ساخت سے مختلف ہونا بھی بڑا مسئلہ ہے۔ اور پھر ساری یوروپی زبانیں بائیں سے دائیں طرف لکھی جاتی ہیں جب کہ عربی اور فارسی کی طرح اُردو بھی دائیں سے بائیں جانب لکھی جاتی ہے۔ یہ مسئلہ واقعی بڑا مسئلہ ہے لیکن عربی زبان میں خودکار ترجمہ کے نظام کے نفاذ نے ثابت کر دیا ہے کہ ان مسائل پر قابو پانا جدید اطلاعاتی ٹکنالوجی (انفارمیشن ٹکنالوجی) کی مدد سے ممکن ہے اور لسانی اعتبار سے چاہے کوئی بھی مشکل ہو اس کو بیٹا فارمیٹ (β-Format) کی مدد سے حل کیا جا سکتا ہے۔

اُردو کا ایک اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس کے لیے عام طور پر نستعلیق طرز تحریر کا نظام استعمال ہوتا ہے جب کہ عربی میں نسخ رائج ہے۔ فارسی کے لیے ایران میں بہت

پہلے نستعلیق ہی رائج تھا لیکن انہوں نے اپنے تحریری نظام کو نسخ سے تبدیل کر لیا۔ نستعلیق کا حسن اس بات میں پوشیدہ ہے کہ اس میں بہت فنکارانہ مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نستعلیق کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ حروف کو ملا کر لکھتے ہوئے جوڑ ملایا جاتا ہے تو اس کی شکل تبدیل ہو جاتی ہے اور اس کی نشست میں بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ نستعلیق میں حروف ایک خط میں نہیں آتے بلکہ ان کے مقام میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

اُردو کی معتبر الکٹرانک لغت کا مسئلہ بھی اہم ہے جس کے بغیر مشینی ترجمہ ممکن نہیں ہے۔ فی الوقت یہ کام ابتدائی مراحل میں ہے۔ بعض ویب سائٹس نے آن لائن ترجموں کی سہولتیں دی ہیں مگر ان کی لغت بالکل محدود ہے اور ایک یا دو جملے کا ترجمہ وہ بھی محدود سطح ہی پر ممکن ہے۔ اس سلسلہ میں پاکستان میں مقتدرہ قومی زبان نے بعض قابل قدر کام انجام دیے ہیں۔ یہاں رسم الخط اور فونٹ کے مسائل پر بھی کام ہوا ہے اور الکٹرانی لغت پر بھی۔ ہندوستان میں اُردو زبان میں مشینی تراجم کے سلسلہ میں ایک پروجکٹ سینٹر فار ڈیولپمنٹ آف اڈوانسڈ کمپیوٹنگ میں بھی جاری ہے۔ مزید مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے سنٹر فار ویمن اسٹڈیز نے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹکنالوجی، حیدرآباد کے اشتراک کے ساتھ انگریزی، ہندی، اُردو الکٹرانی لغت کا کام بھی شروع کیا ہے۔ اس پروجکٹ میں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے شعبہ ترجمہ کے ریڈر ڈاکٹر محمد خالد مبشر الظفر اس الکٹرانک لغت کی ادارت کا کام انجام دے رہے ہیں۔ 5 ہزار الفاظ پر مشتمل اس الکٹرانی لغت کا کام جلد ہی مکمل ہونے والا ہے۔

اُردو میں مشینی ترجمہ کا مستقبل

دُنیا بھر میں لسانیات اور کمپیوٹر ٹکنالوجی کے ماہرین اس کام میں لگے ہوئے ہیں کہ اُردو کے لیے بھی ایک خودکار ترجمہ کا پیکیج تیار ہو جائے۔ پاکستان میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، نیشنل یونیورسٹی فار سائنس اینڈ ٹکنالوجی، لاہور اور ہندوستان میں وزارت انفارمیشن ٹکنالوجی حکومت ہند اور شعبہ ترجمہ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدرآباد سے اس سلسلہ میں بجا طور پر امیدیں وابستہ ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دُنیا بھر میں اُردو زبان میں مشینی ترجمے کے میدان میں ہو رہے علمی اور تحقیقی کاموں کے درمیان اشتراک اور ہم آہنگی پیدا کی جائے اور ایک مشترکہ لائحہ عمل ترتیب دیتے ہوئے کاموں کو تقسیم کر کے اہداف کو حاصل کیا جائے۔ یقیناً اُردو میں مشینی ترجمے کے چند مسائل ہیں لیکن ان پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر اس ضمن میں عربی اور فارسی زبانوں میں مشینی تراجم کے میدان میں ہوئی کامیابیوں سے استفادہ ممکن ہے وہیں ملک میں اُردو کی بہن کہی جانے والی زبان ''ہندی'' میں مشینی تراجم کی کامیابیوں سے استفادہ نہ کرنا بڑی نادانی ہوگی۔ یہ ذمہ داری ان تمام محبان اُردو پر عائد ہوتی ہے جو ماہرین ادب ولسان ہیں یا انجینئرنگ، کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹکنالوجی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بطور خاص ترجمہ کے میدان میں کام کرنے والے افراد کو اس ضمن میں آگے بڑھ کر ذمہ داری کو اپنے کاندھوں پر لینا چاہیے۔ یہ کام ایک نہایت ہی سنجیدہ فیصلہ اور طویل مدتی منصوبہ بندی اور استقامت واستقلال کا متقاضی ہے۔

☆☆☆

اردو زبان: مسائل اور حل

ڈاکٹر امام اعظم
ریجنل ڈائرکٹر
ریجنل سنٹر، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، دربھنگہ (بہار)

اردو زبان کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے ہمیں نہایت سنجیدگی سے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ ایسے مواقع پر ہم جذباتی گفتگو سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ چند مسلمات بیان کر کے خوش ہو لیتے ہیں بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اپنی نارسائی کی تسکین خوش فہمیوں سے کرتے ہیں۔ بجائے حالات و مسائل کے تجزیے کے چند روشن امکانات کی پیش بینی کر کے یا اپنوں اور حکومت کو موردِ الزام ٹھہرا کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور مسائل پیدا کرنے والے اسباب و عوامل سے آنکھیں چراتے ہیں۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ملکی اور عالمی تناظر میں اُردو اور اس کے مسائل کا جائزہ لیں اور اسے زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ جو علم، زبان یا قوم زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہو سکی وہ زوال آمادہ ہوئی یہاں تک کہ اس کا وجود بھی ختم ہو گیا۔ ایک رپورٹ کے مطابق روزانہ ۵۰ سے زائد زبانیں مرتی جا رہی ہیں۔

زندگی کے بے شمار تقاضے ہیں اور ہر تقاضہ کے مطابق مسائل ہیں۔ دبستانوں

سے دانش گاہوں تک اور آغوشِ مادر سے گھر بازار تک جہاں جہاں تک ہمارے خیالات اور ہماری ضروریات ہیں وہاں ہماری زبان کے مسائل ہیں۔ ان مسائل کو ہم مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

تقریر و تحریر کے مسائل: اُردو بحیثیت زبان کہاں تک ہمارا ساتھ دے رہی ہے؟ کہاں تک ساتھ دے سکتی ہے؟ اور کہاں جا کر ہمارا ساتھ چھوڑ دیتی ہے؟ اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

یہ ہمارے گھروں میں رابطے کی زبان ہے۔ ہمارے معاشرہ کا ایک بڑا طبقہ علمی پسماندگی کا شکار ہے۔ وہاں یہ زبان رابطہ کے طور پر رائج ہے لیکن اس کی خوبیوں کے ساتھ اسے اپنانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ سرکاری اسکولوں کے اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ سکنڈری سطح تک اردو داں بچوں کا، ڈراپ آوٹ سب سے زیادہ ہے۔ دوسرا طبقہ ان کا ہے اعلیٰ تعلیم جن کی نظروں کو خیرہ کر رہی ہے اور دولت جن کے لیے حاصلِ حیات ہے۔ یہ طبقہ نہ صرف اُردو چھوڑنے پر آمادہ ہے بلکہ اس کوشش میں مصروف ہے کہ بچے اچھی انگریزی بولیں، یہاں اُردو کم علمی کی علامت اور انگریزی باعث افتخار ہے۔ ہمارا سماج اور ہمارا دانش مند طبقہ ایسے لوگوں اور ان کے بچوں کی پذیرائی کرتا ہے اور اس کو باعثِ تقلید سمجھتا ہے۔ تیسرا متوسط طبقہ ہے جس کا ایک حصہ عاجزی کی بناء پر انگریزی استعمال نہیں کر رہا ہے مگر اس کی بول چال کی زبان پر Lingua Franca کا غلبہ ہے۔ ''میرے Backbone میں Pain ہے'' جیسی زبان یہاں استعمال ہوتی ہے۔ ان گھروں میں بھی بچوں کی زبان و بیان کی نگہداشت نہیں کی جاتی ہے کہ وہ

اچھی، بامحاورہ اور فصیح اردو بولیں، گھروں میں یہ حالت مایوس کن ہے۔

بول چال کی سطح پر فلمی گانوں کے باعث کچھ اثرات ضرور پڑتے ہیں، لیکن ان کا علمی استعمال نہیں ہو پا رہا ہے۔ خود فلم کی زبان جو کبھی بہترین اردو ہوا کرتی تھی اب یہ بھی Lingua Franca کا شکار ہے۔

حکومت اور لسانی پالیسیوں سے متعلق مسائل: زبان کی سرپرستی اور ترقی میں حکومتیں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں لیکن اردو کے ساتھ حکومتوں کا رویہ بالعموم سوتیلا پن کا رہا ہے لیکن زندہ قومیں سہاروں پر نہیں جیتی ہیں بلکہ بلند ہمتی سے نامساعد حالات کو سازگار بنانے کو کوشش کرتی ہیں۔

ہندوستان میں لسانی منافرت کی بنیاد انگریزوں نے ہی ڈالی تھی لیکن اس کی آبیاری ملک کی تقسیم کے بعد خوب ہوئی۔ کوٹھاری کمیشن نے تعلیم کو یکساں ملکی پیمانے پر نصاب تیار کرنے کی بات کہی تو اس کو مذہبی اداروں نے مسترد کر دیا اور کوئی نیا فارمولا سامنے نہیں آیا۔ اردو زبان میں بنیادی تعلیم دینے کا سلسلہ 1947ء کے بعد بہت سارے علاقوں میں بند ہو گیا۔ چوں کہ اردو پاکستان کی سرکاری زبان ہوگئی اس لیے یہ ہندوستان کی سرکاری زبان نہ ہوسکی۔ گرچہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہے لیکن خود وہاں بھی اس کی حالت اچھی نہیں ہے اور سرکاری کام کاج میں انگریزی ہی کا استعمال ہو رہا ہے ہندوستان کے آئین کی دفعہ ۲۹ (۱) میں تمام ہندوستانیوں کو اپنی زبان، رسم الخط اور تہذیب کی حفاظت کا حق دیا گیا ہے اس بنیاد پر حکومتیں لسانی پالیساں ضرور تشکیل دیتی ہیں مگر ان کے عمل کا جائزہ لیا جائے تو مایوسی ہوتی ہے۔ بہار میں اُردو کو دوسری

سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے اس بنیاد پر بعض مراعات اور تحفظات بھی ملی ہوئی ہیں لیکن صورت حال یہ ہے کہ اس وقت یہاں کے اسکولوں اور کالجوں میں اردو اساتذہ کی اسامیاں خالی پڑی ہوئی ہیں بلکہ بہت سی جگہوں پر ان کی جگہ دوسرے مضامین کے اساتذہ کی تقرری کر لی گئی ہے۔ اتر پردیش میں بھی اردو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے متعارف ہے مگر چھ سات امور کو چھوڑ کر سرکار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو یہاں سب سے زیادہ کسمپرسی کا شکار ہے۔ عام لوگ ہندی کی طرف مائل ہیں، اسکولوں اور کالجوں میں اردو کے طلبہ کی بے حد کمی ہے۔ البتہ مہاراشٹرا اور کشمیر میں اردو کی حالت ضرور خوش کن ہے اور اس کے اچھے نتائج بھی سامنے آرہے ہیں۔

سرکاری سرد مہری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہمیں خود اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم سرکاری مراعات سے کتنا استفادہ کر رہے ہیں۔ دفتروں میں اردو مترجمین سے دوسرے کام لیے جا رہے ہیں کہ ان کے پاس کام نہیں آرہے ہیں۔ اوپن اسکولنگ میں اردو ذریعہ تعلیم سے ایک فی صد داخلہ بھی نہیں ہو رہا ہے۔ یونیورسٹی کی سطح پر چند ایک فنی تعلیم کے لیے اردو میڈیم تعلیم میں سہولیات مہیا ہیں اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اس سلسلہ میں اچھا کام کر رہی ہے مگر ہمارے طلبہ اس کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔

علمی زبان کی حیثیت سے اردو کے مسائل: بلاشبہ ہماری زبان ہر سطح پر ترسیل کی صلاحیت رکھتی ہے۔ تاہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عالمی تناظر اور صارفی دور میں علوم و آگہی میں اردو کس حد تک ہمارا ساتھ دے سکتی ہے؟ میں یہاں ایک بات بتانا چاہتا ہوں کہ جب تک ہم علوم کی سطح پر دوسری اقوام کی تقلید کرتے رہیں گے اپنے موضوع پر اچھی صلاحیت

رکھنے کے باوجود دوسرے درجہ کی اہلیت کے حقدار ہوں گے۔ مثالی مہارت ہو تو اور بات ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں دیگر زبانوں سے بے نیازی برتا جانا ضروری نہیں ہے۔ تو کیا عام ذہانت رکھنے والے طلبہ کے لیے اپنے فن میں مہارت کے ساتھ دو زبانوں میں اظہار کی سطح پر، صلاحیت پیدا کرنا آسان ہے؟

یہاں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ ہم اپنی زبان میں ادب کے فروغ کے لیے جس طرح غور و فکر کر رہے ہیں کیا اسی طرح اپنی زبان میں علوم و فنون کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ ہمارے یہاں ادب کے تعلق سے جس قدر سمینار اور جلسے ہوتے ہیں ان میں علوم و فنون پر ہونے والے سمیناروں کی شرح کیا ہے۔ پھر جو سمینار اس موضوع پر ہوئے اس سے کس حد تک استفادہ ہوا ساتھ ہی کامیابی و ناکامی کے اسباب پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں غور و فکر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جو قومیں دنیا میں لسانی برتری رکھتی ہیں انہیں یہ برتری اپنے ادب کی بنیاد پر حاصل ہے یا کسی اور بنیاد پر؟

صحافت کے مسائل: ''جہاں تک اردو اخبارات و جرائد کا تعلق ہے دو ہزار سے زائد اشاعتوں کے ساتھ ہندی اور انگریزی کے بعد یہ تیسرے نمبر پر ہے۔ ۱۹۹۱ء میں دو ہزار سے زائد دو روزنامے تھے لیکن ان کی کل تعداد اشاعت محض ۲۵ لاکھ تھی۔ یوپی کے بعد دوسرے نمبر پر آندھرا پردیش ہے۔ آج پورے ملک میں اردو کا کوئی جریدہ یا اخبار ایسا نہیں ہے جو معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ معروف بھی ہو۔ کسی بھی اخبار کی اشاعت بہ مشکل پچیس ہزار سے تجاوز کرتی ہے۔ اردو زبان کبھی دنیا کی تیسری سب سے بڑی زبان سمجھی جاتی تھی جسے پانچ کروڑ ہندوستانی بولتے تھے۔'' (اردو دنیا اکتوبر ۰۵، بحوالہ ٹائمز

آف انڈیا نئی دہلی ۲۹ جون ۰۵)۔

یہاں بھی غور و فکر کا پہلو یہ ہے کہ شائع ہونے والے جرائد و مجلّات میں علوم و فنون سے تعلق رکھنے والے رسائل و جرائد کتنے ہیں۔ ہمارے عام مجلّات میں ان سے متعلق کتنے مضامین ہوتے ہیں۔ ان میں ایسے مشمولات کا معیار کیا ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں بہت سے ترجمے ہوتے ہیں۔ کیا ہمارے مضامین کے ترجمے دوسری زبان والے شائع کرنے پر مجبور ہیں۔ اس طرح ہمارے جرائد میں بچوں کے ادب کی شمولیت کتنی ہوتی ہے۔ کتابوں کی اشاعت بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے یہاں سال میں کتنی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ سماجی علوم، سائنس، ریاضی اور قانون وغیرہ سے تعلق رکھنے والی کتابیں کتنی ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق ہر سال صرف شعری مجموعے ایک ہزار سے زائد شائع ہو رہے ہیں۔ معیاری اور عمدہ تصنیفات و تالیفات پر مختلف اکیڈمیوں اور اداروں سے ملنے والے انعامات و اعزازات کی غیر ادبی شخصیتیں کتنی حقدار ہوتی ہیں۔ اس بے اعتنائی کا سبب ہماری بے توجہی ہے یا کتابوں کا غیر معیاری ہونا۔ ضرورت ہے کہ ہمارے یہاں جو غیر ادبی علمی کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان کا دیگر زبانوں کی ان موضوعات کی کتابوں سے تقابل کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ کم از کم ان کے مساوی کتابیں آسکیں۔

ہمارے یہاں ادب اطفال کی حالت بھی اچھی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں کتابیں تو کم آ رہی ہیں رسائل و جرائد بھی اسے اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ ہمارے بچوں کو اس عمر میں اگر دوسری زبانوں کی طرف مائل ہونا پڑا تو ظاہر ہے کہ آگے چل کر وہ کیوں کر

اپنی زبان کی طرف رجوع کرسکیں گے۔

تدریس کے مسائل: سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ کس سطح تک ذریعہ تعلیم اردو ہو۔ اعلیٰ تعلیمی سطح تک، اعلیٰ ثانوی تعلیم تک، یا ثانوی تک۔ مادری زبان کے ذریعہ تعلیم کی اہمیت مسلم ہے۔ اس کے بعد بڑا مسئلہ کتابوں کی فراہمی کا ہے جو کتابیں حکومت کی جانب سے فراہم ہوتی ہیں بالعموم ان کا معیار انگریزی یا دیگر بڑی زبانوں کے برابر نہیں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں کوئی عقل مند صرف زبان کے لیے اعلیٰ معیار سے دست بردار نہیں ہوسکتا ہے جب کہ صارفی دور کا تقاضہ بھی اس کے لیے مجبور کررہا ہے۔

ہمیں خود غور کرنا ہے کہ کس سطح تک اردو زبان میں معیاری کتابیں دستیاب ہو پائیں گی۔ اگر اعلیٰ تعلیمی سطح تک یہی ذریعہ تعلیم ہو تو موجودہ صورتحال میں تحقیق کی سطح پر یا ہماری زبان ساتھ دے پائے گی۔ عمر کے اس حصہ میں دوسری زبان سیکھنا آسان ہے اور کیا اس کی وجہ سے تحقیقی کام میں رخنہ نہیں پڑے گا۔ اس طرح کیا سائنس اور پیشہ ورانہ تعلیم کی سطح پر انگریزی سے بے اعتنائی برت کر صرف اصطلاحات تک واسطہ رکھتے ہوئے کیا ہم اپنی دوڑ جاری رکھ سکتے ہیں؟ یہ ہمارے لیے مسرت کی بات ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے پیشہ ورانہ فنی تعلیم کی طرف توجہ دیتے ہوئے اپنی زبان میں پڑھانے کا انتظام کرلیا ہے۔ لیکن کتنے ادارے اس میں ہمارا ساتھ دیں گے، طلبہ کا رجحان کس حد تک ہے اور طلبہ کو راغب کرنے کی کیا صورت ہوگی اور پھر وہی بات کہ تیز ترین تبدیلی کے ساتھ کیا ہم چل پائیں گے؟ یہاں صورتحال یہ ہے کہ ہم ترجمہ کے ذریعہ جب تک اپنے طلبہ کو واقف کراتے ہیں زمانہ دوسری تبدیلی سے دوچار ہوجاتا ہے۔

جہاں تک اردو ذریعہ تعلیم کا سوال ہے، بہت ساری اصطلاحات جو وضع کی گئی ہیں وہ نامانوس ہیں۔ انگریزی اور ہندی کے مقابلہ میں رائج نہیں ہیں۔ دوسری بات وضع اصطلاحات میں یہ بھی ہے کہ ہر جگہ الگ الگ ایک ہی انگریزی لفظ کے اصطلاحات دیکھنے کو ملتے ہیں جس سے بچوں یا بڑوں میں بھی ایک طرح کی تشکیک پیدا ہوجاتی ہے۔ اسے عام کرنے کے لیے عوامی سطح پر مہم کے طور پر بھی جو NGO'S ہیں اور اردو سے متعلق کام کرتی ہیں ان کو بھی توجہ دینی چاہیے۔ اس کے علاوہ ملک گیر پیمانے پر وضع اصطلاحات کی ایک کمیٹی ہونی چاہیے اور بنیادی تعلیم کی ہر سطح پر اساتذہ کی تقرری طے کرنی چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ووکیشنل اور پروفیشنل کورسیز کے آجانے کے بعد اردو داں طبقہ اس کی طرف بھاگ رہا ہے اس کے لیے ٹھوس متبادل نہیں ہے اور نہ اس جانب کوئی بڑی کوشش ہورہی ہے۔ اس لیے ان تمام سطحوں پر مرحلہ وار کمیٹیاں بنا کر مہم چلانے کی ضرورت ہے تاکہ اردو زبان جن مسائل سے دوچار ہے اسے حل کیا جاس کے۔

جو کچھ سچر کمیٹی کی سفارشات میں درج ہے اس میں زبان سے متعلق بھی باتیں کی گئی ہیں۔ تعلیم کے سلسلہ میں بھی زبوں حالی کا ذکر کیا گیا ہے۔ نوکریوں میں فیصد کا بھی تذکرہ ہے۔ مجموعی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو صورت حال نہایت ہی تشویش ناک ہے۔ ایسی صورت میں تمام اردو اداروں کو ایک کوآرڈی نیشن کمیٹی بھی بنانی چاہیے اور وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے پس منظر میں اردو کو درپیش مسائل کے حل کے لیے سر جوڑ کر اس کا لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے بغیر کوآرڈی نیشن کے یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی ایک ادارہ ان

سارے مسائل کو حل کر دے پھر طریقہ ءحل پر بھی گہری سوچ اور فکر کی ضرورت ہے۔

اردو کی آموزش کے مسائل: ہمارے یہاں غیر اردو دانوں کو اردو سکھانے کا انتظام تشفی بخش نہیں ہے۔اس طرح کی کتابوں کی بھی بہت کمی ہے اور اس جانب ہماری توجہ بھی نہیں ہے۔

ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی بقاء اور ترقی کے لیے مختلف سطحوں پر جدو جہد جاری ہے اور ہم مستقبل سے پرامید ہیں۔ جہاں تک پاکستان کا سوال ہے، اردو وہاں سرکاری زبان ہے۔مختلف صوبائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی و ترویج اطمینان بخش ہے۔مگر اردو کا جادو ہندو پاک سے باہر بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔مغربی اور خلیجی ممالک مثلاً کینڈا، انگلینڈ، امریکہ، جرمنی، آسٹریلیا، سوئیڈن، دوبئ، جدہ، شارجہ، دوحہ قطر، ابوظہبی، ریاض وغیرہ میں اردو کی محفلیں آراستہ ہو رہی ہیں، اخبارات، رسائل و جرائد نکل رہے ہیں۔ اردو کے مسائل پر غور و فکر ہو رہا ہے۔ کہیں کہیں عالمی سطح کے مشاعرے ہوتے ہیں اور کانفرنسیں ہوتی ہیں اور جید قلمکاروں کو انعامات سے بھی نوازا جاتا ہے جو خوش آئند امر ہے۔اس سلسلہ میں مزید یہ کہ کام کرنے کے سلسلہ میں محبان اردو اپنی مذکورہ سرگرمیوں کو جاری رکھتے ہوئے اردو کی بنیادی تعلیم کا مستحکم نظم کریں اور اسے تحریک کی شکل دیں۔اس بارے میں انہیں بالخصوص اپنے بچوں پر توجہ دینی ہوگی جو اردو کے تعلق سے مستقبل کے معمار ہیں۔ یہ ایک ایسا کام ہے جسے کیے بغیر دوسری کوئی کوشش اردو کے فروغ کے لیے کارگر نہیں ہوگی۔ جب تک ہم اپنے بچوں کو اردو سے آشنا نہیں کرائیں گے ہماری ساری کاوشیں جڑ کو چھوڑ کر شاخوں کو سیراب کرنے کے مترادف

ہوگی۔ممکن ہو تو مقامی اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا نظم بھی کرائیں۔

ادبی نشستوں اور مشاعروں میں نئی نسل کی شمولیت ضرور ہوتا کہ ماحول سازگار رہے۔ ویسے میرے خیال میں بیت بازی، غزل گائیکی اور دلچسپ قصہ خوانی کی بھی محفل منعقد ہونی چاہیے جس سے نئی نسل کی ذہن سازی ممکن ہے۔اس ضمن میں تقریری اور تحریری مقابلے بھی کارآمد ہو سکتے ہیں۔

اردو تعلیم کے شعبہ میں حال کے دنوں میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد نے کیا ہے۔ جو سرزمین ہند تک ہی محدود نہیں ہے باہر کی اردو آبادی میں بھی اس کی سرگرمیاں پھیل رہی ہیں اور تعلیم و تدریس کا ایک مضبوط نظام وجود میں آرہا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی اور بعض ریاستوں کی اردو اکیڈمیوں کے ذریعہ کوششیں جاری ہیں۔ مانو کے پروگرام ''مانو درشن'' دوردرشن کے ڈی ڈی ون چینل سے اوپن کلاس روم کی شروعات ہوئی ہے لیکن اس کے مثبت نتائج کا انتظار ہے۔

میں نے اشاروں میں اردو زبان کے بعض مسائل کا خاکہ پیش کیا ہے۔ان مسائل کے حل کے لیے سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے دنشوران بے لوث جذبہ سے متصف ہوں، ان کی شخصیت ایسی ہو کہ وہ قوم کے آئیڈیل بن سکیں۔ اس کے بعد ہمیں اپنے مسائل کو زندہ تحریک کی صورت میں بدلنا ہوگا اور تحریک کی رفتار بے حد تیز کرنی ہوگی۔ہمیں یہ چیزیں اپنے گھروں میں عمل میں لانا ہوں گی کیوں کہ اگر ہمارے خیالات اور عمل میں تضاد رہا تو قوم ہم پر ہرگز اعتماد نہیں کرے گی۔لوگوں کی نگاہ کا مرکز چمکتی ہوئی چیز ہوگی۔ وہ اس کے لیے آگے بڑھیں گے اور اپنی زبان سے دست

بردار ہوجائیں گے اور اگر قوم کا رشتہ زبان سے کٹ گیا تو زبان دھیرے دھیرے مرتی چلی جائے گی۔ پھر نہ وہ ہوں گے نہ ہمارے دانشور مگر اس کے ذمہ دار ہمارے دانشور ہی ہوں گے۔ ہم اگر زندہ ہوں تو ہماری تحریک بھی زندہ ہوگی اور ہماری تہذیب بھی ۔ حکومت ہمارے سامنے سپر ڈال دے گی۔ ہمیں ہمارے سارے حقوق مل جائیں گے۔ غرض یہ کہ جو کمیاں ہیں انہیں دور کیے بغیر اور اپنے کاموں کا تنقیدی جائزہ لیے بغیر محض اردو کے روشن امکانات کا نعرہ دینے اور قصیدہ گوئی سے اردو کے مسائل حل نہ ہوں گے۔ بقول شاعر ؎

وہ مجھ سے جب بھی ملتا ہے مری تعریف کرتا ہے
مرے عیبوں سے مجھ کو باخبر ہونے نہیں دیتا

☆☆☆

اردو زبان کا فروغ اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ڈاکٹر نکہت جہاں
ریڈر نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

'' اردو زبان کا فروغ' مسائل اور امکانات'' بہت وسیع موضوع ہے اس کا احاطہ مختصر وقت میں کرنا' ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے پھر بھی میں دیے گئے دورانیہ میں اپنی بات آپ تک پہنچانے کی کوشش کروں گی ۔ ترقی یافتہ ممالک ہوں کہ ترقی پذیر ممالک ہر جگہ مادری زبان میں تعلیم کی فراہمی کسی بھی شہری کا بنیادی حق ہے۔ مادری زبان میں تعلیم کی وکالت تمام ماہرین اور دانشوران تعلیم نے کی ہے۔ کیوں کہ مادری زبان جذبات اور استدلال کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہوتی ہے اور یہ سماجی بلوغیت 'عصری تصورات اور سیاسی شعور کی راہیں وا کرتی ہے اس کے علاوہ ناخواندگی کو ختم کرنے کے لیے بھی مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جب ہم ''اردو زبان کے فروغ'' کی بات کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کی جڑیں کتنی مضبوط ہیں؟ کیوں کہ بنیاد جس قدر مضبوط ہوگی عمارت کو اتنا ہی مستحکم اور متوازن بنایا جاسکتا ہے۔ لہذا اردو میں اعلیٰ تعلیم کے نظم کے ساتھ ساتھ اس کی بنیادوں کو استحکام عطا کرنا بھی اس لیے ضروری ہے کہ اسی پر اردو کی ایک ایسی عمارت کو تعمیر کرنا

ہے جو نسل در نسل اپنے ثمرات سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کر سکے۔اس افسوس ناک حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ زبان جس نے آزادی کی جنگ میں کلیدی رول ادا کیا تھا اور جسے گاندھی جی ہندوستانی تہذیب اور مشترکہ کلچر کا ایک دلکش مرقع قرار دیتے تھے آزادی کے بعد ایک اجنبی بلکہ دشمن زبان قرار دی گئی' اسے ہندوستان کی زبان نہیں بلکہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی درآمد کردہ بدیشی زبان کہا گیا۔آزادی کے بعد کی ان چھ دہائیوں میں اردو شکست و فتح' ترقی و تنزل' بہتری و ابتری کے منازل سے گزرتی رہی۔کہیں اس زبان کے لیے نئی راہیں کھلیں تو کہیں بہت سے راستے تنگ اور مسدود ہو گئے۔بہت سے اپنوں نے اس سے بیگانگی اختیار کی تو کچھ نئے حامی و علم بردار بھی اٹھے۔کبھی یہ زبان جانکنی کی حالت میں نظر آئی تو کبھی نئی توانائیوں کے ساتھ زندگی کی ہم سفر بنی۔کبھی بیگانوں نے تک اس کی خوش نوائی و خوش بیانی کا اعتراف کیا تو کبھی اپنوں نے ہی شکست و مایوسی کے احساس سے اس پر نکتہ چینی کی بہر حال اردو بہار و خزاں کے دور سے گزرتی رہی۔

لیکن آج میں اس شہ نشین سے جو اردو کے عالمی منظر نامہ پر غور و فکر' اس کی ترقی و ترویج نیز اس میں حائل رکاوٹوں کی نشاندہی کے لیے قائم کیا گیا ہے دنیا کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے ماہرین اور محبان اردو کی موجودگی میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو عالمی سطح پر اردو کے فروغ کا ایک اہم مرکز بنانے کا آغاز سمجھتی ہوں۔کیوں کہ نصف صدی قبل عثمانیہ یونیورسٹی کے ذریعہ تعلیم اردو کو ختم کر دیے جانے کے بعد محبان اردو کے خوابوں کی حسین تعبیر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی صورت میں ملی ہے جہاں

مختلف علوم و فنون کے علاوہ ماڈرن ٹکنالوجی کی تعلیم اردو میں دی جا رہی ہے۔اس حوالہ سے میں آپ کے سامنے فروغ اردو کے سلسلے میں چند نکات رکھنا چاہتی ہوں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اکیسویں صدی جسے ہم سائنس و ٹکنالوجی کی کرشماتی یا معجزاتی صدی بھی کہہ سکتے ہیں اس صدی میں وہی قومیں سربلند ہوں گی جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت اور قوت مدافعت ہے۔اس صدی کے ثمرات سے وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو بنیادی طور پر تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی فن میں ماہر ہیں۔ Hitech اور سائبر کلچر کے اس دور میں اردو زبان کی بقا اور ترقی کے لیے ہمیں غور و فکر کرنا ضروری ہے۔کیوں کہ مسابقت کے اس دور میں قابلیت اور صلاحیت کے بغیر ڈگریوں کا حصول کوئی معنی نہیں رکھتا۔اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو اردو میڈیم کے تدریسی معیار کو بلند کرنے کی ضرورت ہے اس سے نہ صرف نوجوانوں کی مسابقتی صلاحیتیں بہتر ہوں گی بلکہ ان میں ایک نیا اعتماد بھی پیدا ہوگا اور وہ کسی بھی پیشہ سے وابستہ ہو کر انفرادی' ملی اور قومی سطح پر اپنی خدمات بہتر طور پر انجام دے پائیں گے۔تادم تحریر اردو والوں کا ایک بڑا طبقہ محض روزگار کے محدود مواقع' کمزور معیار تعلیم اور ناقص نتائج کے پیش نظر اردو ذریعہ تعلیم کو نظر انداز کرتا رہا ہے اور معاشی طور پر کمزور طبقہ ہی بادل نخواستہ اپنے بچوں کو اردو اسکولوں میں شریک کرتا ہے۔یہاں میں آپ تمام کی توجہ سچر کمیٹی کی رپوٹ کی جانب مبذول کروانا چاہوں گی۔رپورٹ میں مسلمانوں کی سماجی' معاشی اور تعلیمی پسماندگی کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ مسلمان ہندوستان کے دوسرے اقلیتی طبقوں سے بھی زیادہ پسماندہ ہیں۔غریبی' تعلیم سے دوری 'اعلیٰ تعلیم سے

محرومی، مدرسوں کا جدید طرز کا نہ ہونا اور خواتین میں تعلیم کا فقدان وغیرہ اس کی پسماندگی کے اسباب ہیں۔ان تمام وجوہات کو جو مسلمانوں کی تعلیمی اہلیت میں رکاوٹ بن رہے ہیں دور کرنے کے لیے سچر کمیٹی نے چند سفارشات کی ہیں جن میں سے کچھ خاص یہ ہیں۔

جہاں جہاں مسلمانوں کی یا اردو بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہے وہاں اردو میں کینڈریہ ودیالیہ طرز کے پرائمری اسکولوں کو فروغ دینا جس کا نصاب CBSE طرز کا ہو۔

طالبات کے لیے جدید طرز کے محفوظ ہاسٹل قائم کیے جائیں۔

حکومت کی جانب سے مسلم طلباء کو اسکالرشپس دیئے جائیں تا کہ ان کے تعلیمی اخراجات پورے ہوسکیں۔

اردو میڈیم اسکولس میں انفرااسٹرکچر کی کمی کو دور کیا جائے۔

اردو میڈیم اسکولوں میں اساتذہ کی جائیدادوں کو پر کیا جائے اور اساتذہ کو خاص ٹریننگ دی جائے۔

اردو میں معیاری درسی کتابوں کی تیاری اور فراہمی۔

مسلمانوں میں عام طور پر فنی مہارت زیادہ ہوتی ہے۔ایسے ہنر جو رفتہ رفتہ ختم ہو رہے ہیں ان کو زندہ رکھنے اور مسلمانوں کو روزگار سے مربوط کرنے لیے انھیں ووکیشنل تعلیم دی جائے۔

یہ جان کر آپ کو مسرت ہوگی کہ سچر کمیٹی کی سفارشات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد نے جو کہ اردو کی ترقی و بقا کے مقصد سے قائم کی گئی ہے فکری و عملی طور پر اردو والوں کے لیے ارتقا کا ایک راستہ دیا ہے۔اردو زبان کو پسپائی کے دور سے نکال کر اچھی اور سازگار فضاء میں لانے، حوصلہ مندی سے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی شناخت بنانے کی ترغیب دی ہے۔اس یونیورسٹی کے منشور اور مقاصد میں اردو زبان کا فروغ، اعلیٰ اور پیشہ ورانہ تعلیم کی فراہمی کے علاوہ تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ مرکوز کرنا شامل ہے۔اپنے اس مقصد و منشور کے ساتھ اردو یونیورسٹی حیدرآباد نے فاصلاتی نظام تعلیم کے ذریعہ 1998 میں ڈگری کورسیز سے اپنے تعلیمی پروگراموں کا آغاز کیا۔اردو یونیورسٹی کے نظامت فاصلاتی تعلیم سے زیادہ سے زیادہ افراد مستفید ہو رہے ہیں۔خاص کر یہ طریقہ تعلیم خواتین کی تعلیم کے فروغ کا اہم ذریعہ ثابت ہوا ہے۔جس کے نتیجہ میں خواتین کی سماجی و معاشی حیثیت میں تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔خواتین کی ناخواندگی کے کئی اسباب رہے ہیں ان میں سے ایک اہم سبب مادری زبان میں اعلیٰ تعلیم کے ذرائع کا نہ ہونا بھی ہے۔ چوں کہ مادری زبان سے خواتین کا تعلق فطری اور راست ہوتا ہے اسی لیے اگر خواتین کو اعلیٰ تعلیم مادری زبان میں بآسانی میسر ہو جائے تو وہ اپنی صلاحیتوں کو بخوبی نکھار سکتی ہیں اور اپنی سماجی و معاشی حیثیت میں تبدیلی لاسکتی ہیں۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے انھیں یہ موقع دیا ہے فاصلاتی تعلیم سے مستفید ہونے والوں میں 53 فیصد خواتین ہیں۔جیسا کہ فاصلاتی تعلیم کا مقصد Reach to Unreach ہے اردو یونیورسٹی نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں موجود تشنگان علم کو باب علم تک پہنچانے کا مقدس فریضہ ادا کیا ہے۔ یونیورسٹی کی

جانب سے فاصلاتی طرز میں ایم اے اردو، ایم اے تاریخ، ایم اے انگریزی، بیچلر آف آرٹس، بیچلر آف سائنس، بیچلر آف کامرس، بیچلر آف ایجوکیشن، سرٹیفکٹ ان فوڈ اینڈ نیوٹریشن، سرٹیفکٹ ان پروفیشینسی ان اردو تھرو انگلش / ہندی، سرٹیفکٹ ان فنکشنل انگلش فار اردو اسپیکرس، ڈپلوما ان ٹیچ انگلش، ڈپلوما ان پرائمری ایجوکیشن، ڈپلوما ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونیکشن پروگرام کامیابی کے ساتھ چلائے جارہے ہیں اور تشنگان علم و ہنر کی جانب سے ان پروگراموں کی زبردست پذیرائی ہو رہی ہے۔ یونیورسٹی کے آٹھ علاقائی مراکز ملک کے مختلف حصوں دہلی، پٹنہ، بنگلور، بھوپال، دربھنگہ، کلکتہ، سری نگر اور ممبئی میں اور پانچ تحت علاقائی مراکز لکھنو، جموں، حیدرآباد، نوہ اور سنبل میں انتظامی اور تعلیمی تعاون فراہم کرنے کی غرض سے قائم کیے گئے ہیں۔ یونیورسٹی نے مشرق وسطیٰ میں اپنے تعلیمی مراکز اور امتحانی مراکز کھولنے کے ارادہ کے تحت یہاں یعنی جدہ میں اپنا امتحانی مرکز قائم کیا ہے۔ لندن اور شارجہ کے علاوہ کینڈا اور بعض دوسرے ممالک سے بھی اس طرح کے مراکز قائم کرنے کے لیے یونیورسٹی کو نمائندگیاں موصول ہورہی ہیں یہاں میں کہہ سکتی ہوں کہ فاصلاتی تعلیم کے ذریعہ اردو زبان کا مستقبل روشن ہے اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا نظامت فاصلاتی تعلیم شیخ الجامعہ پروفیسر اے ایم پٹھان کی سرپرستی اور نائب شیخ الجامعہ پروفیسر کے آر اقبال احمد کی رہبری اور نگرانی میں ترقی کے منازل طئے کررہا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ فاصلاتی طرز تعلیم کے تحت ایک لاکھ تیس ہزار سے زائد طلباء ملک بھر میں پھیلے 141 اسٹڈی سنٹرس میں اپنے ناموں کا اندراج کرواچکے ہیں۔ تاہم اس کے لیے اردو سے جڑے اداروں، تنظیموں اور مفکروں کو بھی فعال ہونے کی ضرورت ہے تاکہ

وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی میں اضافہ ہوتا رہے۔

اردو یونیورسٹی نے کیمپس طریقہ تعلیم کے تحت بی۔ایڈ، ایم ایڈ، ایم اے اردو، انگریزی، ہندی، فارسی، پبلک ایڈمنسٹریشن، ایم اے ٹرانسلیشن، ایم اے سوشیل ورک، ایم اے ان ماس کمیونیکشن اینڈ جرنلزم، ایم بی اے، ڈپلوما ان ایجوکیشن، ڈپلوما ان عربک، پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ان انفارمشن ٹکنالوجی، ایم فل اردو، انگریزی، ویمن ایجوکیشن، پی ایچ ڈی اردو اور ویمن ایجوکیشن کے پروگرام پیش کرنے کے علاوہ کئی ارتقائی اس کیموں کو روبہ عمل لاتے ہوئے اردو میڈیم کے اساتذہ اور طلباء میں مسابقتی روح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن میں سنٹر فار نہرو اسٹڈیز، یو جی سی نیٹ کوچنگ سنٹر، اصلاحی کوچنگ سنٹر، مرکز برائے کوچنگ اقلیتی طلبا، سنٹر فار پروفیشنل ڈیولپمنٹ آف اردو میڈیم ٹیچرس (CPDUMT) سنٹر فار دی اسٹڈی آف سوشیل ایکسکلوژن اینڈ انکلوژن اور اکیڈیمک اسٹاف کالج کا قیام شامل ہے۔ اردو میڈیم کے تربیت یافتہ اساتذہ کے فقدان کی وجہ سے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اردو میڈیم اساتذہ کی کئی جائدادیں مخلوعہ تھیں یونیورسٹی نے اس جانب خصوصی توجہ مرکوز کرتے ہوئے سری نگر، جموں و کشمیر بھوپال اور دربھنگہ میں ٹیچرس ٹریننگ کالج قائم کیے ہیں۔

آج کل ترجیحی اسکول کا تصور اپنی جڑیں مضبوط کررہا ہے اور تدریس کے مختلف معیار اور کوالٹی پر زور دیا جارہا ہے ایسے میں اردو میڈیم اسکول کے معیار تعلیم سے لوگوں کا اعتماد ختم ہورہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میڈیم کے اسکولوں میں تدریس کا معیار بلند کیا جائے لیکن تعلیم کا معیار اسی وقت بلند ہوسکتا ہے جب اسکول میں معیاری

اساتذہ موجود رہیں۔ چناں چہ اردو میڈیم اساتذہ کی تربیت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے سنٹر فار پروفیشنل ڈیولپمنٹ آف اردو میڈیم ٹیچرس قائم کر کے ایک قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس سنٹر کے تحت ایجوکیشنل تکنالوجی اور نصابی مواد کو جدید رجحانات کے مطابق برسرخدمت اردو ذریعہ تعلیم کے اساتذہ تک منتقل کیا جارہا ہے۔ اور پرائمری، سکنڈری اور سینیر سکنڈری اساتذہ کو تربیت دی جارہی ہے۔ اردو میڈیم کے معیاری اسکولوں کی ضرورت کے پیش نظر اردو یونیورسٹی نے یو جی سی کی منظوری کے بعد حیدرآباد اور دربھنگہ میں CBSE طرز پر ماڈل اسکولوں کا آغاز کیا ہے۔ یہ اسکول پہلی تا دسویں جماعت تک کے تعلیمی پروگرام پیش کریں گے۔

یونیورسٹی نے جہاں تشنگان علم کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے وہیں معاشی طور پر کمزور اور پسماندہ طبقات کو خود مکتفی بنانے کے لیے روزگار پر مبنی ووکیشنل تعلیم پر بھی توجہ دی ہے۔ یونیورسٹی کی جانب سے انڈسٹریل ٹریننگ انسٹیٹیوٹ حیدرآباد، بنگلور، دربھنگہ میں قائم کیے گئے ہیں جن میں میکانک ان الکٹرانکس، ایرکنڈیشنگ اینڈ ریفریجریشن میکانک، پلمبنگ اور الکٹریشن ٹریڈس میں سرٹیفکٹ کورس شروع کیے جاچکے ہیں۔ مستقبل میں یونیورسٹی حیدرآباد میں ڈپلوما ان میڈیکل لیاب ٹکنالوجی اور پیرا میڈیکل کورسیس شروع کرنے کا ارادہ بھی رکھتی ہے۔ کوئی بھی زبان اپنی تہذیب وثقافت کی امین ہوتی ہے اردو زبان میں بھی تہذیب وثقافت کے نایاب خزینے پوشیدہ ہیں ان کو محفوظ کرنے کے لیے یو جی سی نے اردو یونیورسٹی کو ذمہ داری سونپی ہے۔ کیمپس میں مرکز برائے اردو زبان، ادب وثقافت قائم ہو چکا ہے جہاں دنیا بھر میں موجود اردو کے

نادر ونایاب ذخائر کو محفوظ کیا جائے گا۔

یونیورسٹی نے اردو زبان میں اپنے تدریسی تصورات کو وسعت دینے اور موثر انداز میں پیش کرنے کے لیے انسٹرکشنل میڈیا سنٹر بھی قائم کیا جہاں تدریسی پروگرام اور اسباق کی تیاری کے بعد ان کو ٹیلی ویژن کے ذریعہ نشر کیا جارہا ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد اپنی کارکردگی کے پہلے دہے کی تکمیل کر چکی ہے۔ یونیورسٹی کے اس دس سالہ مسحور کن سفر کی روئداد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یونیورسٹی اپنے فعال اور دور اندیش شیخ الجامعہ پروفیسر اے ایم پٹھان کی سرپرستی ورہنمائی میں اردو زبان کی عظمت و وقار کو بحال کرنے کی سعی مسلسل میں جٹی ہوئی ہے اور تارکین تعلیم کو تعلیم سے جوڑنے کے لیے مشن کے طور پر کام کررہی ہے۔ اردو یونیورسٹی کے علاوہ اس وقت ہندوستان میں روشنی کی چند اور کرنیں بھی نظر آرہی ہیں مثلاً NCERT، انجمن ترقی اردو ہند اور اس کی شاخیں، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور حیدرآباد میں ادارہ ادبیات اردو اور عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کے امتحانات کا ایک جال بچھ چکا ہے۔ اردو نے سرزمین ہندوستان کے حدود پھلانگ کر دیار غیر میں بھی اپنی کمندیں ڈال دی ہیں اور اپنی شیرینی کا لوہا منوالیا ہے۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ آج نیپال کے مسلم گھرانوں میں اردو تعلیم کو ہر حال میں ترجیح دی جارہی ہے 1985 میں تربھون یونیورسٹی کٹھمنڈو میں شعبہ اردو قائم ہو چکا ہے۔ تہران یونیورسٹی میں بھی شعبہ اردو قائم ہے۔ جاپان میں ٹوکیو یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بھی اردو کی قابل تحسین خدمت ہورہی ہے۔ جاپان میں اردو کی داغ بیل ڈالنے والوں میں نمایاں اور معروف نام ہندوستان کے انقلابی رہنما مولوی برکت اللہ کا

ہے۔ان کے بعد پروفیسر آرگا مونے اردو زبان کے پرچم کو بلند کیا۔انھیں جاپان میں بابائے اردو کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ان کے بعد ان کے عزیز شاگرد پروفیسر سوزوکی تاتشی نے اردو زبان کی ترقی وترویج میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

جو ہندوستانی ملازمت کے سلسلہ میں خلیجی ممالک میں بس چکے ہیں انہوں نے وہاں اردو کی بساط بچھادی ہے اس سلسلہ میں وہاں محبان اردو کی خدمات بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں اس کی ایک مثال اردو اکیڈمی جدہ ہے۔یہ اکیڈمی مسلسل اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے سرگرم عمل ہے۔نئی نسل میں اردو تعلیم کو عام کرنا' مختلف طریقوں سے طلبا و اساتذہ کی ہمت افزائی کرنا' اردو میڈیم کے طلبا کے تعلیمی معیار کو بلند کرنا اس اکیڈمی کا مقصد ہے جو قابل تقلید ہے۔ آخر میں' میں یہی کہنا چاہوں گی کہ اردو کے فروغ کے لیے اردو تنظیموں' اردو کے اداروں اور محبان اردو کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے اپنے حلقوں میں اس بات کی مزید توسیع واشاعت کے لیے کام کریں تاکہ نئی نسل اور نوجوانوں کو اس بات کی ترغیب دی جاس کے کہ وہ نہ صرف اپنی مادری زبان اردو سیکھنے میں دلچسپی لیں بلکہ اس کی ترقی وترویج میں اپنا حصہ ادا کریں۔یہ خوف باطل ہے کہ اردو کی وجہ سے ہماری نئی نسل کی ترقی کی راہیں مسدود ہوجائیں گی۔ترقی اس وقت رکے گی جب ہم اپنی شناخت سے بے بہرہ ہوجائیں گے' جب ہم اپنے ماضی اپنی تہذیب اور اپنے ورثہ سے دور ہوجائیں گے۔

لہذا کسی ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ کیے بغیر کسی بھی مفاد اور مصلحت سے اوپر اٹھ کر ہمیں اردو کی بقا اور تحفظ کے لیے خود کو وقف کردینا چاہیے اور ایسی صورت حال میں جب کہ ہم

اردو کے دور افتادہ علاقوں میں مقیم ہیں تو ہماری ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔اگر ہم مذکورہ باتوں پر عمل کریں گے تو وہ دن دور نہیں جب اردو ذریعہ تعلیم میں لوگوں کا اعتماد بحال ہوگا اور طلباء کی تعداد کی کمی کا بہانا کر کے اردو اسکول بند نہیں کیے جائیں گے اور نہ ہی دوسرے اسکولوں میں ضم ہوں گے۔تعمیری اقدامات کے ذریعہ اردو ذریعہ تعلیم کے معیار کو بلند کرنا چاہیے تب ہی ہماری نئی نسل موجودہ مسابقتی دور میں کامیاب ہوسکتی ہے۔

☆☆☆

جناب چندر بھان خیال عالمی اُردو کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے شہ نشین پر موجود مہمانوں کے علاوہ حاضرین کانفرنس بھی دیکھے جاسکتے ہیں

شرکائے کانفرنس کا ایک منظر

عہدِ حاضر کا ترقیاتی منظرنامہ۔اور اردو زبان

(مسائل وتجاویز)

ڈاکٹر محمد احسن

ریجنل ڈائرکٹر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، بھوپال

اردو کا لسانی منظرنامہ:

جنوبی ایشیا جیسے کثیر مذہبی اور کثیر ثقافتی خطّے میں اردو ایک دل کش لسانی منظر نامے کی تشکیل تو کرتی ہے مگر بدقسمتی سے عام ہندوستانی ذہن میں یہ مسلمانوں کی زبان ہے، تقسیمِ ہند کی ذمہ دار ہے مگر یہ تمام غلط فہمیاں اِس حقیقت کو نہیں بدل سکتیں کہ اردو ایک مخلوط تہذیبی وِرثے کی امین ہے۔ ہندوستان جیسے کثیر اللسان ملک میں اردو کا لسانی امتیاز بھی غیر معمولی بات ہے۔تاریخِ زبانِ اردو اور زبانوں کی سیاست سے دل چسپی رکھنے والے طالب علموں کے لیے اردو کے سیاق وسباق میں ایک بڑی دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ زبان نہ صرف صوفیوں، بادشاہوں کے پیغامات کی زبان رہی ہے بلکہ اس زبان کا استعمال اِستعماری اور فرقہ پرست قوتوں نے بھی خوب خوب کیا۔آریہ سماج کی اردو مخالف تحریک کا ذریعہ اردو اس لیے تھی کیوں کہ اس وقت رابطے کی کوئی دوسری موثر

زبان موجود نہ تھی۔ استعماری قوتوں نے بھی ضرورت کے نظریے کے تحت اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اردو کا ہی استعمال کیا۔ لسانیات کے طالبِ علم یہ بات بہ خوبی جانتے ہیں کہ اصولاً زبانیں مذہب کا دوسرا نام نہیں ہوتیں یا اس بات کو یوں کہیں کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا مگر یہ پھر بھی طے ہے کہ اکثر زبانیں مذہبی استحصال کا ذریعہ بنتی رہی ہیں۔

اردو کس کی زبان ہے؟

اردو مسلمانوں کی زبان کبھی نہیں تھی مگر فرقہ پرست قوتوں نے اس کا خوب خوب استعمال کیا اگر ہم عملی سطح پر دیکھیں تو پائیں گے کہ ہندی بھی صرف ہندوؤں کی زبان نہیں ہے۔ شمالی ہند کے اسکولوں میں زیرِ تعلیم طلبہ میں بڑی تعداد مسلم طالبِ علموں کی ہے اور چوں کہ شمالی ہند میں مسلمانوں کی نئی نسلیں ہندی ذریعۂ تعلیم کی پروردہ ہیں اس لیے اُن تک پہنچنے کے لیے مسلم مذہبی جماعتوں کے سامنے ہندی کا سہارا لینے کے سوا چارہ نہیں۔ جماعتِ اسلامی کے ادب کا بھی بڑا حصہ (مع قرآن کے تراجم) ہندی میں بہ کثرت دستیاب ہے۔ یہی صورتِ حال تبلیغی جماعت اور دوسری مسلم مذہبی جماعتوں کے ادب کی ہے۔ شمالی ہند میں مسلمانوں کی نئی تعلیم یافتہ نسل چوں کہ اردو سے نابلد ہے اور اسے صرف ہندی آتی ہے، اس لیے یہ نتیجہ بہ آسانی نکالا جا سکتا ہے کہ ہندی مسلمانوں کی زبان ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اسی طرح اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنا ایک انتہائی پیچیدہ صورتِ حال کا نہایت سطحی تجزیہ ہوگا۔ مگر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ ہندی سے میری مراد عوام الناس یا ترسیل کی عام فہم زبان ہے۔ وہ سیاسی آلۂ کار نہیں، جس کے ذریعے آر۔ایس۔ایس اور دیگر فسطائی قوتیں ہندستان کو ہندو راشٹر بنانے کا خواب دیکھتی رہی ہیں۔

اردو کا تہذیبی ورثہ :

زبانیں مخصوص سماجی و تاریخی سیاق و سباق اور مخصوص سیاسی و تہذیبی فضا میں پیدا ہوتی ہیں، ترقی کرتی ہیں اور عروج و زوال سے ہم کنار بھی ہوتی ہیں۔ ان ارتقائی مراحل میں زبان کے بولنے والے اپنی مادری زبان سے اِس حد تک وابستہ ہو جاتے ہیں کہ اسے اپنا تہذیبی ورثہ سمجھتے ہیں، اور اس تہذیبی ورثے کے تحفظ کے لیے اکثر منفی سیاسی راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اگر کوئی لسانی معاشرہ، سیاسی اور جغرافیائی اسباب کی بنا پر منقسم ہو جاتا ہے تو اس کے بولنے والے لسانی اعتبار سے ایک دائرے میں رہتے ہوئے بھی اکثر اوقات دیدہ و دانستہ مختلف لسانی علائم کی تشکیل کا سبب بنتے ہیں یہ صورتِ حال صرف ہندی اور اردو تک محدود نہیں ہے مگر اردو اور ہندی کے سیاق و سباق میں دل چسپ بات یہ ہے کہ دونوں فرقے بولتے تو ایک ہی زبان ہیں مگر ایک اسے اردو کہتا ہے تو دوسرا ہندی۔ مسلمان ہندی کو سنسکرت کی وارث سمجھتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ لفظِ 'ہندی' فارسی الاصل ہے۔

اردو کا لسانی علاقہ اور اس کے اثرات:

فرقہ پرست سیاسی ایجنڈے سے قطعِ نظر ہندی اور اردو بولنے والوں کا جغرافیائی اور تہذیبی سطح پر Ethos مشترک ہے۔ اس حقیقت کو مفادات کے تابع چھپایا تو جا سکتا ہے مگر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ جب 1956ء میں لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیلِ نو عمل میں آئی اور ہر ریاست کی زبان کو اس ریاست کی سرکاری زبان

قرار دیا گیا تو اردو کو بھی جموں وکشمیر کی سرکاری زبان بنا دیا گیا جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے مگر اردو اُن کی مادری زبان قطعی نہیں تھی اور نہ ہے۔ کشمیریوں کی زبانیں کشمیری، ڈوگری اور لداخی وغیرہ ہیں۔ حکومت کے اس فیصلے کو جب شدت پسند مسلم سیاست نے بہ خوشی قبول کر لیا تو فطری طور پر عوام الناس کے ذہنوں میں اس غیر منطقی خیال کو مزید تقویت ملی کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ نتیجتاً پورے شمالی ہند بالخصوص اتر پردیش میں اردو پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد میں نمایاں کمی اس لیے آئی کیوں کہ حکومت نے اسکول کی سطح پر اردو تعلیم کا نظام مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تشکیلِ جدید کی وجہ سے ہریانہ، پنجاب مدھیہ پردیش اور اتر پردیش میں اردو نہ صرف سرکاری سرپرستی سے محروم ہوتی گئی بلکہ زندگی کی زبان جس کے لیے انگریزی میں functional language کا فقرہ استعمال کیا جا سکتا ہے، کے طور پر اس کا دامن سمٹتا ہی چلا گیا اور وہ مذہب اور ادب بلکہ یوں کہیں کہ ادب کے نام پر بھی اردو صرف شعر وشاعری کی زبان بن کر رہ گئی۔ ریاستوں کی تنظیمِ نو کے بعد پنجاب، ہریانہ اور ہماچل پردیش میں اردو کی جگہ پنجابی اور ہندی پڑھائی جانے لگیں۔ یہاں اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیلِ جدید سے قبل بھی اردو کو کشمیر کی شاہی ریاست میں ایک ذیلی سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی مگر اس میں بھی عوامی خواہشات کا کوئی رول نہیں تھا۔ اس وقت بھی اردو کشمیر کے عوام پر تھوپی ہوئی زبان تھی۔ عوام تو اپنی ہی زبانیں بولتے اور لکھتے تھے۔

افراد کی لسانی شناخت اور اردو:

بعض تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ تمام مذہبی مقاصد کے لیے اردو ہندوستانی مسلمانوں کی واحد زبان بن چکی ہے۔ اِن کا خیال ہے کہ 1947ء کے بعد ہندوستان میں اردو صرف اور صرف مسلمانوں تک محدود ہو گئی ہے۔ اس لیے اس کی ترقی وترویج کی کوئی بھی کوشش مسلمانوں کو شریک کیے بغیر ممکن نہیں۔ اگر ہم اس نظریے کو تسلیم کر لیں تو شاید اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ اردو زبان اس حد تک مسلمانوں کی تہذیبی اور مذہبی شناخت میں پیوست ہو چکی ہے کہ اسے ان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مسئلے پر تاریخی، تہذیبی اور سیاسی سیاق میں غور کیا جائے۔ اِس ضمن میں دو نکتے خاص طور پر اہم ہیں۔ اوّل یہ کہ نسلی لسانیات (Ethno-linguistics) ہمیں یہ بتاتی ہے کہ زبان کی نسلی شناخت سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ دوئم یہ کہ ان میں سے ہر فرد کی مختلف شناخت ہے اور یہ شناخت زبان، مذہب، علاقائی ماحول، تہذیبی روایات اور پیشہ وارانہ وابستگی سے اخذ کی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض شناختیں مخلوط ہوتی ہیں۔ مثلاً اردو میری شناخت کا ایک اہم جُزو ہے، اس لیے نہیں کہ یہ میری مادری زبان ہے بلکہ اس حقیقت کی وجہ سے بھی کہ میں نے اس کے ذریعے اپنے مذہبی وتہذیبی ورثے کو اپنے وجود میں اتارا ہے۔ اس اعتراف کے باوجود ہم سب یہ بھی مانتے ہیں کہ مشترک لسانی شناخت مذہبی تفریق سے بالاتر ہوتی ہے۔

اردو تعلیم کو کارگر بنانے کے اقدام:

اردو تعلیم کی پسماندگی اور بدحالی کا تعلق سرکاری افسران کے تغافل اور خود ہماری غیر سنجیدگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اگر ایک جانب اردو کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے تو دوسری جانب اردو زوال پذیر نظر آتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہم ان الفاظ کے معنوی حدود کا تعین کیے بغیر اور ان کو سمجھے بغیر ان اصطلاحات کا استعمال کرتے ہیں۔ اگر کسی زبان کا مستقبل تابناک ہے تو وہ زوال پذیر نہیں ہوگی اور اگر زبان زوال پذیر ہے تو اس کا مستقبل تابناک نہیں ہوسکتا۔ کسی زبان کے مستقبل کی تابناکی کا دارومدار اس کے بولنے والوں کی شرح خواندگی پر ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اردو آبادی کی شرحِ خواندگی ہندوستان کی عام شرح خواندگی سے بہت کم ہے۔ مثال کے طور پر بہار کے ایک ضلع کشن گنج میں اردو آبادی کا تناسب 53.61 فی صد ہے اور یہ شرح خواندگی میں ہندوستان کا سب سے پچھڑا ہوا ضلع ہے کیوں کہ اس ضلع کی شرح خواندگی صرف 17.5 فی صد ہے۔ اردو کے مستقبل کی تابناکی اسکولی سطح کی اردو تعلیم، کم از کم پرائمری اور جونیر ہائی اسکول کی سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم سے وابستہ ہے۔ پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول تک اردو تعلیم کی ٹوٹی ہوئی کڑی کو جوڑنے کے لیے موثر اقدامات اور منظم پالیسی بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ پالیسی اتنی مستحکم ہونی چاہیے کہ یہ ان تمام عوامل کو پیش نظر رکھ سکے جو اردو تعلیم کی تنزلی کے ذمہ دار ہیں۔ ان پالیسیوں کو وضع کرتے وقت ہمیں ان وجوہات پر غور کرنا ہوگا جن کی وجہ سے اردو کی ترقی سے متعلق سرکاری پالیسیاں مسلسل ناکام ہوتی رہی ہیں۔ اردو تعلیم کو کارگر بنانے کے لیے ایسے اقدام بھی اٹھانے ہوں گے جن کے تحت اردو تعلیم کو بازار کی ضرورتوں سے جوڑا جاسکے اور تکنیکی اور انتظامی سطح پر

ان کی افادیت نمایاں کی جاسکے۔

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی سے متعلق سچّر کمیٹی کی سفارشات:

حال ہی میں حکومتِ ہند کی طرف سے قائم کی ہوئی سچر کمیٹی کی سفارشات بھی ان ضرورتوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس رپورٹ کے چند اہم نِکات مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ آئینِ ہند کی 93ویں ترمیم کے بعد 14 سال تک کے ہر بچّے کو یہ آئینی حق حاصل ہے کہ حکومت انہیں مادری زبان میں بنیادی تعلیم مہیا کرائے۔ (اس پس منظر میں ہم اردو والوں کو حکومت سے پرزور مطالبہ کرنا چاہیے کہ اردو آبادی والے علاقوں میں اردو ذریعہ تعلیم کا معقول نظم کرے۔) واضح ہو کے ۱۰ سال سے کم عمر کے گروپ کے بچوں میں مسلمانوں کی حصہ داری سب سے زیادہ ہے۔ اس دائرے میں بہ حیثیت مجموعی پورے ملک کے لیے 23.7% کے مقابلے میں مسلمانوں کا فیصد 27% ہے۔ تاہم ابتدائی سطح پر مسلمان بچوں میں اندراج اور اس کے بعد تعلیم جاری رکھنے کی شرح سب سے کم ہے یہ حقائق مسلم کمیونٹی کے لیے بالخصوص بنیادی تعلیم کو زیادہ اہم بناتے ہیں اور اس بات کو کہ 6 سے 14 سال کے تمام بچوں کے لیے جو مفت اور اعلیٰ معیار کی تعلیم تک رسائی کا حق رکھتے ہیں یقینی بنانے کی ضرورت ہے۔

2۔ اردو آبادی کے علاقوں میں Central Schools اور Jawahar Navodaya Vidyalaya کے طرز پر اردو میڈیم اسکول کھولے جائیں تاکہ اردو مادری زبان والے بچّے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں۔ اس سفارش

پر جلد از جلد عمل درآمد کرنے کا مطالبہ کرنا چاہیے۔

3۔حکومت ایک ایسے مرکز کی تشکیل کرے جہاں دینی مدارس کو اعلیٰ ثانوی بورڈ سے منسلک کر دیا جائے تا کہ وہ طلباء جو عصری تعلیم Main Stream Educational System میں شامل ہونا چاہتے ہوں انھیں آسانی ہو۔ دوسرے لفظوں میں مدارس سے فارغ التحصیل طلباء کو پیشہ ورانہ اور ووکیشنل کورسز میں داخلے کے لیے مواقع فراہم کیے جانے چاہیے۔ خاص طور سے ان کورسز کے لیے جن میں داخلہ انٹرنس ٹسٹ / مقابلہ جاتی امتحان کے ذریعہ ہوتا ہے۔ (اگر اردو والے سماجی معاشی اور تعلیمی سطح پر اپنے لیے کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اس کے لیے خود آگے بڑھ کر کام کرنا ہوگا اور عوامی سطح پر بیداری بھی پیدا کرنی ہوگی، صرف چند لوگوں کی کوششوں سے کامیابی مشکل ہے۔ان کوششوں میں لوگوں کی عملی حصہ داری نہایت ضروری ہے۔)

4۔مسابقاتی امتحان کے لیے دینی مدارس کی اسناد کو منظوری دی جانی چاہئے ۔تا کہ مدارس کے فارغین مقابلہ جاتی امتحانات جیسے سول سروسیز، بینک، ڈیفنس سروسیز اور دوسرے اس طرح کے امتحانات میں شرکت کے اہل ہوں۔

5۔ اسکولی نصاب کے مواد کا جائزہ لینے کے عمل کی طرف پیش قدمی کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ایک باقاعدہ ادارہ قائم کرنا چاہئے۔

6۔ UGC کو ایک ایسے نظام کی ابتدا کرنی چاہئے جس کے تحت کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مختلف لسانی گروہوں سے تعلق رکھنے والے طلباء کے لیے ایک حصّہ

مختص ہو۔

7۔خود مختار کالجوں اور عام یونیورسٹیوں میں تمام سماجی و مذہبی حلقوں میں سب سے زیادہ پس ماندہ طبقے کے داخلہ کو آسان بنانے کے لیے ایک متبادل اصول داخلہ وضع کیا جانا چاہئے۔

مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کے حق کا مطالبہ:

سچر کمیٹی کی سفارشات کی بنیاد محض مسلمانوں کی بدحالی اور خستہ حالی نہیں ہے بلکہ اس پس منظر میں حکومت ہند کا آئین بھی ہے ۔ چوں کہ ہندستان کا آئین تمام شہریوں کو ان کی تہذیبی شناخت کے ساتھ زندگی گزارنے کی ضمانت دیتا ہے اسی لیے زبان کے حوالے سے دستور ہند کی مختلف دفعات اور شقوں پر نظر ڈالنے سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ ہندوستان کے شہریوں کو اپنی مرضی کے مطابق ہر ریاست اور ریاست کے ہر بااختیار ادارے کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ لسانی اقلیت سے تعلق رکھنے والے بچّوں کو ان کی مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دینے کے لیے معقول سہولیات مہیا کرے۔

دستور کی دفعہ 350-A سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ریاستی یا مرکزی حکومت کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ عوام کی مرضی کے خلاف ذریعہ تعلیم کے طور پر کوئی بھی زبان استعمال کرے۔ باوجود اس کے زمینی حقیقت یہ ہے کہ ملک کے بیشتر صوبوں میں آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ذریعۂ تعلیم وہ نہیں جو شہریوں کا حق ہے۔ لہٰذا اس سمت میں بھی سیاسی سطح پر کوششوں کی ضرورت ہے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اقدام:

یہاں عجیب مضحکہ خیز صورت حال یہ ہے کہ یونیورسٹی کی سطح پر اردو تعلیم کا نظام تقریباً ہندستان کے ہر اردو آبادی والے خطے میں موجود ہے۔لیکن اسکولی سطح پر چند ریاستوں کو چھوڑ کر اردو ذریعہ تعلیم کا کوئی نظم ان خطوں میں دستیاب نہیں ہے۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اس مسئلے کی سنجیدگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور اس کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے دو ماڈل اسکول حیدرآباد اور دربھنگہ میں قائم کئے ہیں۔اور اس کے منصوبے میں اس نوع کے مزید اسکول اردو علاقوں میں قائم کرنا شامل ہے۔جو بہر حال ایک خوش آئند قدم ہے اور اس سلسلے میں ایک مثبت پیش رفت بھی ہے۔

اردو میں عصری علوم کی کتابیں:

اردو زبان کے مستقبل کی تابناکی کا مفہوم اردو رسائل، اخبارات اور کتابوں کی تعداد اور معیار کو مدّ نظر رکھ کر بھی پرکھنے کی کوشش کرنا چاہیے لیکن اردو میں شائع ہونے والی کتابوں کی صورتحال بہت خوش آئند نہیں۔حکومت ہند کی جانب سے جاری کردہ Statistics کے مطابق اردو کتابوں کی اشاعت میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ ہر سال صرف گنتی کی معیاری کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ہمیشہ کی طرح عصری علوم مثلاً سماجیات، لسانیات، سیاسیات، معاشیات، اور سائنس جیسے موضوعات اردو والوں کی بے توجہی کا شکار رہتے ہیں۔اردو یقیناً زوال پذیر نہیں ہے۔مسئلہ صرف اردو والوں کی بے حسی اور بے توجہی کا ہے۔ ہندوستان کے تقریباً 5.2 کروڑ اردو آبادی کے اگر صرف 5.2 فیصد

لوگ سالانہ ہزار روپے اردو کتابوں پر خرچ کریں تو ایک نئی صورتحال ہوگی۔لیکن کیا ہم واقعی ایسا کرتے ہیں؟

اردو اخبارات ورسائل پر ایک نظر:

اردو میں کوئی بھی قابل ذکر ہفتہ وار نہیں ہے جو اعلیٰ صحافتی معیار پر پورا اترتا ہو۔ جو چند ہیں ان میں سے اکثر محض مسلمانوں کا جذباتی استحصال کرنے یا کسی نہ کسی سیاسی جماعت کا پروپگنڈہ کرنے میں مصروف ہیں۔ اردو کے پندرہ روزہ اخبارات ورسائل بالعموم مسلمانوں کی زبوں حالی کی سرخیوں سے بھرے ہوتے ہیں۔اردو میں عام طور سے چار طرح کے رسائل شائع ہوتے ہیں ادبی، نیم ادبی، فلمی اور مذہبی۔آپ چاہیں تو ان میں خواتین کے رسالوں کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ان میں سے زیادہ تر کا سرکولیشن بہت محدود ہے۔سوال یہ ہے کہ آخر یہ بدحالی کیوں ہے؟ کیا ایسا صرف اس لیے ہے کہ اردو اخبارات ورسائل کے خریداروں کی تعداد میں کمی واقعی ہوئی ہے؟

جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ مسئلہ Readership سے زیادہ اخبار کے معیار اور مواد سے جڑا ہوا ہے۔اخبارات ورسائل کے معیار کا اچھا ہونا بہت بڑی شرط ہے۔ جہاں معیار اچھا ہے، مواد بھرپور ہے وہاں قاری کی کوئی کمی نہیں۔مثال کے طور پر ہندوستان کے جنوبی اور جنوب مغربی خطّوں کے اخبارات جیسے ''سیاست''، ''انقلاب'' اور ''منصف'' کو لیں۔ان اخبارات میں مواد بھرپور ہے اور قاری کو وہ تمام چیزیں مل جاتی ہیں جو وہ پڑھنا پسند کرتا ہے۔اس لیے ان اخبارات کو Readership کی نہ کمی

ہے اور نہ اشتہارات کے مسائل درپیش ہیں۔ بلکہ شمالی ہند میں ''راشٹریہ سہارا'' ایک بڑے اقتصادی گروپ سے تعلق رکھنے کے باوجود معیاری اخبار کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔لیکن ایک مضبوط مارکیٹنگ نیٹ ورک کے سبب یا یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس سے زیادہ معیاری اخبار کی کمی کے سبب وہ سب سے زیادہ فروخت ہونے والا اخبار ہے۔

اردو زبان کی بقا اور ترقی کے لیے تجاویز:

یوں تو اردو زبان کے مسائل بہت ہیں لیکن جدید دور میں دوسری زبانوں میں بھی مسئلوں کی کمی نہیں ہے۔ہمیں یہ بات ذہن نشیں رکھنا چاہیے کہ تمام زندہ زبانیں اپنی بقا کے لیے بدلتے ہوئے حالات کے اثرات کو قبول کرتی ہیں اور بدلتے ہوئے دھارے کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑتی ہیں تا کہ موجودہ دور کے تقاضوں کو پورا کرسکیں۔ آج کے دور میں وہی زبانیں زندہ رہیں گی جو اپنے آپ کو بدلتے ہوئے الکٹرونک اور ٹکنالوجکل منظرنامے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی سکت رکھتی ہوں۔کسی بھی زبان کی بقا اور ترقی کا انحصار اس کے بولنے والوں پر ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک اپنی زبان کو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرتے ہیں اور Compatible بناتے ہیں۔ابھی اکثر اردو پڑھنے والے کمپیوٹر کی سہولیات سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کر پاتے ہیں جب کہ یہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ اردو کو کمپیوٹر ٹکنالوجی اور انٹرنیٹ سے بھی جوڑا جائے۔کیونکہ آج کے تعلیمی نظام میں کمپیوٹر ایک اہم رول ادا کرتا ہے اور نئی نسل کے بچے بھی اپنی زبان اور تہذیب کو اسی کی مدد سے جلد سیکھ سکتے ہیں۔اس لیے

ضروت ہے کہ اردو سافٹ وئیر کے ڈیولپمنٹ کی سمت میں کام کیا جائے۔اور اب تک جو کچھ ہمارے پاس موجود ہے اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔اب تو اردو میں ایسے سوفٹ وئیر موجود ہیں جن کی مدد سے ہم اردو سیکھنے سکھانے کا کام کرسکتے ہیں۔ونڈوز 2003 نے بھی اپنے office system میں ایسی سہولت مہیا کرادی ہے کہ ہم براہ راست اردو میں میل اور Chatting کرسکتے ہیں۔لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے اس لیے ضروری ہے کہ اس سمت میں ایک بیداری لائی جائے اور اردو جاننے والوں کو اس سہولت کے حوالے سے بتایا جائے۔اس کے ساتھ ہی اس کی بھی ضروت ہے کہ سوفٹ وئیر ڈیولپ کرنے والوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ اردو والے بھی اس کا استعمال کرتے ہیں تا کہ دنیا کی اور زبانوں کی طرح اس زبان میں بھی نئے نئے سوفٹ وئیر ڈیولپ کیے جاسکیں۔ یہ دنیا تو بازار کی دنیا ہے اگر ہم اپنی ضرورت بتائیں گے تو اپنے اقتصادی فائدے کے لیے ہی سہی وہ اردو کو بھی اس ٹکنالوجی سے جوڑیں گے۔سوال صرف یہ ہے کہ اردو آبادی کو بھی ایک بڑا صارِف بننا پڑے گا۔

آج اچھی بات یہ ہے کہ اردو زبان بولنے والے بھی دوسری زبان بولنے والوں کی طرح بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میں ادب کے ساتھ دوسرے مضامین پر بھی توجہ دی جائے۔ادب کی اہمیت وافادیت بہرحال اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اس کے ساتھ اردو میں سائنسی مضامین، تراجم اور سائنسی علوم پر مبنی مضامین کے ذخیروں کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔

اردو اور نیا علمی اُفق:

یہ ایک کڑوا سچ ہے کہ اردو والے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں مسلسل دوسری اقوام سے پچھڑتے جارہے ہیں۔ بیسویں صدی میں انسانی وسائل کی جو عدیم المثال ترقی ہوئی ہے وہ جدید ٹکنالوجی کی رہین منت ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے یورپ اور امریکہ میں انسانی وسائل اور اقتصادی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ ایک روشن مثال ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں معلومات میں جو غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ اس کی مثال انسانی ترقی کی تاریخ میں ناپید ہے۔ ایک تخمینہ کے مطابق نئی انفارمیشن جو ادھر 35-30 برسوں میں دستیاب کرائی گئی ہیں وہ پچھلے پانچ ہزار برسوں میں بھی نہیں تھیں اس لیے اردو والوں کو بالخصوص جدید علوم اور انفارمیشن ٹکنالوجی پر خاطر خواہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

میں اپنی بات ان حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ختم کرنا چاہتا ہوں کہ اردو زبان اور تعلیم کی یہ لڑائی محض ایک زبان کی بقا کی لڑائی نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی جذباتی مسئلہ ہے بلکہ یہ تہذیبی شناخت کے تحفظ اور اس کی بقا کا مسئلہ ہے اور اس کے لیے ہم تمام اردو والوں کو خلوصِ نیت سے محنت اور لگن کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔

☆☆☆

جناب حسام الاسلام صدیقی

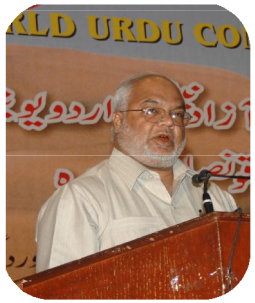

سید جمال اللہ قادری

جناب حسن عبدالکریم چوگلے

جناب ظفر علی نقوی

پروفیسر ایس۔ ایم۔ رحمت اللہ

تکنیک کے جدید دور میں اردو کا مستقبل

حسام الاسلام صدیقی
مدیر اعلیٰ ہفتہ وار جدید مرکز، لکھنو

آج دنیا میں سائنس نے قابل ذکر ترقی کر لی ہے۔ تکنیکی اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے میدان میں روز نئی نئی ایجادات سامنے آ رہی ہیں۔ ایسے میں یہ فکر کہ اس دور میں اور آنے والے دور میں اردو کا کیا مستقبل ہے یا ہوگا، لازمی اور فطری ہے۔ مجھ سے قبل کئی قابل احترام، ماہرین ادب وزبان اور محبان اردو نے یہاں اپنی باتیں کہیں۔ میں ان میں کچھ باتوں سے متفق بھی ہوں لیکن بیشتر باتوں سے میرا سخت اختلاف ہے۔ مثلاً کئی لوگوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ اردو کا مستقبل نہ صرف تاریک ہے بلکہ اردو زبان کا وجود تک ختم ہونے کا پورا پورا خطرہ ہے۔ میں بھی گزشتہ تیس برسوں سے صحافت وہ بھی اردو صحافت سیکھنے کے کام میں مصروف ہوں۔ مجھے تو ایسا خطرہ بالکل نظر نہیں آتا کہ آج کے جدید تکنیکی دور میں اردو کا مستقبل تاریک ہے یا اس کا وجود خطرے میں ہے۔ اردو کے روشن مستقبل کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ آج ہم اردو کے گہوارے سے ہزاروں میل دور عرب کی سرزمین کے تاریخی شہر جدہ میں اردو پر عالمی کانفرنس کر رہے ہیں جس میں کناڈا، امریکہ اور کئی یورپی ممالک کے نمائندے شامل ہیں۔ سامعین میں وہ لوگ بھی گزشتہ تین دنوں سے مشاعرے اور سمینار میں برابر شریک رہے ہیں جو عرب کی سرزمین

پر پیدا ہوئے اور جن کی مادری زبان عربی ہے۔ میں بھی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی بات سے پوری طرح متفق ہوں کہ اردو کا مستقبل کسی قسم کے خطرے سے دوچار نہیں ہے۔

کل اسی ڈائس سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کہا تھا کہ ''ہندوستان کی سب سے مضبوط زبان سنسکرت پر جب پنڈتوں نے پوری طرح قبضہ کرلیا تبھی سنسکرت ختم ہوگئی''۔ان کی بات کی بھرپور تائید کرتے ہوئے میں یہ بھی کہوں گا کہ سیکولرزم کو فروغ دینے والے ادب کا جتنا بڑا ذخیرہ سنسکرت اور اردو دو زبانوں کے پاس رہا ہے اتنا کسی بھی زبان کے لٹریچر میں موجود نہیں ہے۔ ہندوستان میں ہزاروں سال سے سیکولرزم اور باہمی پیار و محبت کے دشمنوں کی ایک مضبوط طاقت رہی ہے۔ سنسکرت کو جن طاقتوں نے ختم کیا میں انہیں ڈاکٹر نارنگ کی طرح صرف پنڈت لفظ سے مخاطب نہ کرکے یہ کہوں گا کہ چوں کہ سنسکرت اور اردو زبانوں کے ادب میں ہی سیکولرزم کا بے پناہ ذخیرہ تھا اور ہے اس لیے سیکولرزم مخالف طاقتوں نے پہلے سنسکرت کو ختم کیا اور اب وہی طاقتیں اردو کو ختم کرنے پر آمادہ ہیں۔اس میں الیٹ طبقہ کا بھی بڑا رول ہے جنہیں آج ڈاکٹر نارنگ اور ہم سنسکرت کے پنڈت کہہ رہے ہیں۔ وہ دراصل سماج کا الیٹ طبقہ بھی تھا۔اس لیے اردو کو الیٹ طبقہ تک محدود ہونے سے بچانے کی بھی سخت ضرورت ہے۔

ہم ایسی طاقتوں کو واضح طور پر بتانا چاہتے ہیں کہ وہ طاقتیں سنسکرت کو ختم کرنے میں اس لیے کامیاب ہوگئیں کہ اس وقت حالات دیگر تھے۔آج کی دنیا کے جو حالات ہیں ان میں اردو کو ختم کر پانا سیکولرزم مخالف طاقتوں کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔انفارمیشن ٹکنالوجی کی ترقی اور تجارتی اعتبار سے گلوبلائزیشن کے اس دور میں

دنیا سمٹ کر ایک گاؤں کی شکل اختیار کرچکی ہے۔ دنیا سمٹنے کا سلسلہ فی الحال تھمنے والا بھی نہیں ہے۔ جو لوگ آج دنیا کی تجارت پر قابض ہونا چاہتے ہیں ان کی پہلی ترجیح بھی بڑے بازاروں پر قبضہ کرکے منافع کمانا ہی ہے۔ یہ تجارت کو فروغ دینے اور منافع کمانے کی ہی غرض ہے کہ دہلی میں مہنگی تمباکو بنانے والی ایک کمپنی جس کا مالک اردو اور اردو والوں سے نفرت کرنے والوں میں شامل ہے، وہ بھی اپنی تمباکو پیکٹس پر اردو اور عربی دونوں زبانوں میں تمباکو کا نام اور اپنی کمپنی کا پتہ چھپوا رہا ہے۔اسے پتہ ہے کہ اس کا مارکیٹ کہاں ہے اور اس مارکیٹ میں لوگ کون سی زبان کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

یہاں ہمارے بہت سے نامور اور معزز ادباء و شعراء بیٹھے ہیں۔ایک بات میں بڑے ادب سے کہنا چاہتا ہوں کہ ادب زبان کی طاقت ہے، لیکن صرف ادب کے سہارے کوئی زبان رائج یا مقبول نہیں ہوتی جیسے انگریزی زبان آج دنیا کی مقبول ترین زبان ہے، لیکن کتنے لوگ ہیں جو انگریزی ادب سے بھی واقف ہیں؟ اردو غزل کی تمام تر مقبولیت کے باوجود جب تک زندگی کے ہر شعبے کی باتیں اردو زبان میں نہیں آئیں گی اس وقت تک اردو زبان کے محدود ہونے کا خطرہ بنا رہے گا۔ بہت مسرت ہوتی ہے بلکہ فخر محسوس ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اردو بھی کمپیوٹر کی زبان بن چکی ہے۔اس کے باوجود ابھی بھی بہت ساری سائنسی اور تجارتی اصطلاحات اردو کی اپنی نہیں ہیں۔محض ترجمے کے ذریعہ کام چلایا جارہا ہے۔اس سمت میں بھی کافی کام کیے جانے کی ضرورت ہے۔

کچھ لوگوں نے اردو کو مسلمانوں اور ان کے مذہب کی زبان بنانے کی

کوشش کی۔ ہندوستان کے مشہور عالم مولانا سعد صاحب نے بنگلہ دیش میں جا کر کہا تھا کہ ''اگر آپ کو دین سیکھنا ہے تو اردو سیکھنی پڑے گی۔'' اول تو ہمارا خیال ہے شاید مولانا سعد نے بنگلہ دیش میں یہ بات اس لیے کہی ہوگی کہ وہاں اردو کے خلاف زبردست تعصب کی فضا رہی ہے۔ قیام بنگلہ دیش کی جو چند بنیادی وجوہات رہی ہیں ان میں زبان کا جھگڑا اور اردو کی مخالفت بھی ایک بڑی وجہ تھی۔ دوسرے یہ کہ ہم مولانا کی اس دلیل سے متفق نہیں ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بنگلہ دیش تو دور ہمارے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں لوگوں نے اپنی آسانی کے لیے دین کی کتابیں اپنی اپنی علاقائی زبان میں تیار کر لی ہیں۔ قرآن شریف کا ترجمہ اور تفسیر ہو یا دین سے متعلق دیگر کتابیں اب تمل، ملیالی، بنگالی، ہندی، مراٹھی اور کنڑ جیسی زبانوں میں دستیاب ہیں۔ ہاں اردو مذہب کی زبان تھی لیکن پچاس ساٹھ سال پہلے تک تھی۔ جب اردو میں ہی گیتا بھی پڑھی جاتی تھی اور پنجاب کا سارا کاروبار ہی اردو زبان میں تھا۔ اب ایسا نہیں ہے اس لیے اردو کو مسلمانوں کے دین کی زبان کہنا مناسب نہیں ہے۔

اردو کا مستقبل روشن ہے اس کی دوسری وجہ میری نظر میں ٹیلی ویژن اور اس کا مسلسل بڑھتا ہوا دائرہ بھی ہے۔ ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور متحدہ عرب امارات کے ملکوں میں چوں کہ اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی کثیر تعداد ہے۔ ہاں اردو لکھنے اور پڑھنے والے ضرور کم ہیں۔ ان سبھی ملکوں میں جتنے بھی ٹی وی چینل خصوصاً خبر رساں چینل ہیں ان کے نیوز ریڈرز اور اینکرز میں آج کل زیادہ سے زیادہ اردو مقابلہ ہے۔ کئی

چینلوں کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ انہوں نے اپنے اینکرز اور نیوز ریڈرس کو اردو زبان سکھانے کے لیے باقاعدہ ٹیوٹرس رکھے ہوئے ہیں۔ یہ مقابلہ آخر کیا ثابت کرتا ہے؟ کیا یہ مقابلہ اس بات کا شاہد نہیں کہ اردو کا مستقبل روشن ہے۔ قابل غور بات یہ بھی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں اردو اخبارات کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں جدہ سے بھی ایک بہترین اردو اخبار شائع ہو رہا ہے۔

ایک اور بات وہ یہ کہ گزشتہ کوئی پندرہ برسوں سے ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی کسی گلوکار کی غزلوں کی سی ڈی بازار میں آتی ہے تو اس کی ریکارڈ فروخت ہوتی ہے۔ غلام محمد، جگجیت سنگھ، یا غزلوں کے دیگر گلوکار کا کوئی پروگرام ہوتا ہے تو ٹکٹ نہیں ملتے ہیں۔ ہر شو ہاؤس فل۔ کہیں مشاعرہ ہوتا ہے تو سامعین کی تعداد بیس پچیس ہزار اور کبھی کبھی تو اس سے بھی زیادہ۔ یہ باتیں کس طرف اشارہ کرتی ہیں؟ یقیناً اسی طرف کہ اردو کا مستقبل روشن ہے۔

آخر میں تھوڑی تلخ بات ضرورت ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ اردو کو اصل خطرہ تو انہیں سے ہے جنہیں اردو والا تصور کیا جاتا ہے۔ جو اردو کی روٹی کھاتے ہیں۔ یعنی سنسکرت کی طرح اردو کے 'پنڈتوں' سے۔ میں نام نہیں لینا چاہتا لیکن بخوبی واقف ہوں کہ ہمارے ملک کے درجنوں ایسے لوگ جنہوں نے ہمیشہ اردو کی روٹی کھائی، اردو اوڑھی اور بچھائی اور اردو کے ذریعہ ملک گیر پیمانے پر اور بیرون ملک تک میں شہرت حاصل کی انہوں نے اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم نہیں دی۔ کئی بڑے اردو اخبارات کے

مالکان و مدیران کے بچے اردو نہیں جانتے۔ ذمہ دار کون ہے؟ آخر آج ہمارے گھروں میں ہم اپنے بچوں سے اپنی مادری زبان اردو کے بجائے انگریزی میں بات کرنا اپنی شان کیوں سمجھنے لگے ہیں۔ بہانہ یہ کہ اردو روزگار سے جڑی نہیں ہے۔ یہ انتہائی بدنیتی کا بہانہ ہے۔ اردو روزگار سے جڑی نہیں ہے تو کون سی زبان روزگار سے جڑی ہے۔ پنجاب کے باہر گرمکھی کہیں بھی روزگار حاصل کرنے میں معاون نہیں ہے۔ اسکے باوجود کنیا کماری سے کشمیر تک اور دہلی سے کناڈا، یورپ اور امریکہ تک میں رہنے والے ہر سکھ کے بچے کو گرمکھی زبان بخوبی آتی ہے۔ ہبرو زبان سے اسرائیل کی سرحد کے پار ایک پیسے کا روزگار ملنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ امریکہ کی پوری معاشیات اور ڈیفنس پر یہودیوں کا قبضہ ہے جو باہر انگریزی لیکن اپنے گھروں میں ہبرو کا ہی استعمال کرتے ہیں۔ ایسی مثالیں دنیا کی دیگر کئی زبانوں کے لیے ملتی ہیں۔ پھر اردو والوں میں ہی یہ احساس کمتری کیوں کہ اردو روزگار سے جڑی زبان نہیں ہے۔ حقیقت میں کوئی بھی زبان صرف روزگار حاصل کرنے کے لیے نہ تو پڑھی جاتی ہے یا استعمال ہوتی ہے۔ زبان تو ہمیں اپنی تہذیب اور اپنے ماضی سے جوڑتی ہے۔ زبان آدمی کو نوکر نہیں انسان بنانے کے لیے ہوتی ہے۔ رہی بات روزگار کی تو روزگار کے سب سے زیادہ مواقع تو انگریزی زبان سے حاصل ہوتے ہیں وہ بھی ایسی انگریزی جس میں کوئی گرامر نہیں، کوئی روح نہیں، روزگار حاصل کرنے کے لیے آج دنیا بھر میں جس قسم کی انگریزی کا استعمال

ہو رہا ہے اگر برناڈ شا جیسا شخص زندہ ہوتا تو شاید خودکشی کر لیتا یا گوشہ نشینی اختیار کر لیتا۔ اس لیے اردو کے معاملے میں روزگار کا بہانہ قطعی نامناسب ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو کے پنڈتوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود اردو کا مستقبل روشن ہی ہے۔

☆☆☆

معاشرے میں اردو زبان کے رول کا جائزہ اور تجاویز

سید جمال اللہ قادری
صدر اردو اکیڈمی جدہ، جدہ سعودی عرب

اس مشہور شعر کو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ۔

جہاں میں اہل ''اردو'' صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے ' اُدھر ڈوبے ادھر نکلے

مشرقِ وسطی میں منعقد ہونے والی اس پہلی ''عالمی ادو کانفرنس'' کے سرزمین حجاز کے اس بابرکت شہر جدہ میں انعقاد۔ جسے باب الحرمین بھی کہا جاتا ہے یہ اعزاز حاصل ہے کہ دنیا کے دو مقدس ترین شہروں مکہ المکرّمہ اور مدینہ طیبہ کو جانے والے اسی راستے سے ہو کر جاتے ہیں۔ کوثر و تسنیم سے دُھلی اس پاک و منزّہ زبان اردو کا یہ سفر اس سرزمین سے اپنی راہیں متعین کرنے کے لیے شروع ہونا' بالیقین ایک نشاۃ ثانیہ ثابت ہوگا۔ کیوں کہ سرزمینِ حجاز کی یہ خصوصیت بتائی جاتی ہے کہ یہاں سے شروع ہونے والی تحریکیں اپنے دامن میں فیوض و برکات سے معمور ہو کر پھیل جاتی ہیں اور سارے عالم کو منوّر کر دیتی ہیں۔ آج سے ۱۵۰۰ سال قبل بھی اسی حجاز مقدس سے امن و سلامتی کا جو پیغام ''اسلام'' کے نام سے پھیلا وہ ساری دنیا کو اپنا گرویدہ بنالیا اور آج تک اسی رفتار سے پھیلتا چلا جا رہا

ہے۔ اردو زبان جو اپنی تہذیب' ثقافت اور پاکیزگی کے لیے ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہے وہ بھی انشاءاللہ یہاں کی سرزمین کے فیوض و برکات کو خود میں سموئے ہوئے جب پھیلنا شروع ہوگی تو اس کی خوشبو سے سارا عالم مہک اٹھے گا اور اس کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگے گا۔ جسے غوث خواہ مخواہ نے اپنے ان اشعار میں یوں کہا کہ :

آیئے سلجھائیں ہم گیسوئے اردو بار بار
تا کہ مہکائے فضا کو اس کی خوشبو بار بار
خواہ مخواہ جب اس کا جادو سر پہ چڑھتا ہے کبھی
بولتا ہے دشمنِ اردو بھی ' اردو بار بار

اس تمہید کے بعد میں آج کے مقالے کی طرف آتا ہوں جس کا عنوان ہے ''کسی بھی معاشرے میں اردو زبان کے رول کا جائزہ اور تجاویز'' یہ ایک عام سی بات ہے کہ کوئی بھی زبان ہو یا معاشرہ اس کے ارتقاء کی منزل جاننا ہو تو کہا جاتا ہے کہ اس زبان کی کتابیں دیکھی جائیں تو اس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ زبان یا معاشرہ بلندی کی طرف مائل ہے یا پستی کی جانب۔ ان حقائق کی روشنی میں جب ہم اردو زبان کی اہمیت و افادیت پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس زبان میں نرالی اور اچھوتی خصوصیت یہ ہے کہ یہ قومی وحدت کا ایک دلکش نمونہ ہے جس میں مختلف قوموں' تہذیبوں' زبانوں اور معاشروں کا اتحاد ہے۔ اس کے خمیر میں ہندوستانی اور غیر ہندوستانی عناصر کا حسین امتزاج ہے۔ مشاعرے ہوں یا غزل کی محافل ہر جگہ یہ امتیاز واضح نظر آئے گا۔ اردو کے دامن میں جذباتی ہم آہنگی اور سیکولر روایات کے علاوہ قومی' ملی اور وطنی جذبات کی

تہذیب وثقافت جگہ جگہ نظر آئے گی جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس پس منظر میں کسی بھی معاشرے میں اردو زبان کا رول واضح نظر آتا ہے کہ جہاں بھی اور جس کسی بھی معاشرے میں جاتی ہے اس میں اپنا نمایاں مقام بنا لیتی ہے۔

موجودہ دور میں ایک معاشرہ انٹرنیٹ کا بھی ہے جو آج کے ٹکنالوجی کے دور میں انتہائی عروج پر ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ترقی یافتہ دور کے الکٹرانک میڈیا میں اردو کو ابھی بہت منزلیں طئے کرنی ہیں۔ بلکہ انٹرنیٹ کے اس معاشرے میں جو گذشتہ دو تین دہائیوں سے مقبول پذیر ہے اس میں اردو زبان کے رول کا جائزہ لیں تو اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ اردو زبان کا انفارمیشن ٹکنالوجی میں جو رول ہے وہ دوسری زبانوں کے مقابلے میں نہایت محدود ہے۔ ہزارہا ویب سائیٹس میں اردو کی اب تک قابل لحاظ ویب سائیٹس بھی وجود میں نہ آسکیں۔ اس سلسلے میں جو بھی کام ہوا وہ زیادہ تر انفرادی طور پر یا چند ایک تنظیموں کی جانب سے بنائی گئیں چیدہ چیدہ ویب سائیٹس سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'' کے مصداق اس میدان میں اردو کو ابھی بہت سی منزلیں طئے کرنی ہیں۔ انفارمیشن ٹکنالوجی میں اردو کے رول کو موثر بنانے کے لیے نئی نسل میں بطور خاص مادری زبان اردو رکھنے والی نسل پر خاص توجہ دینی ہوگی۔ جس کے لیے تمام اردو داں حضرات کو جو دنیا کے کسی بھی خطے میں رہتے ہوں کمر کسنے کی شدید ضرورت ہوگی۔ انہیں خود سب سے پہلے اپنی مادری زبان کی توقیر کو اپنے دلوں میں جاگزیں کرنا ہوگا اور پھر اپنے اور اپنی نسلوں کے ذہن سے یہ بات نکالنی ہوگی کہ اردو ایک معمولی یا حقیر زبان ہے۔ اپنے آپ

کو اس بے ہودہ رجحان سے پاک کرنا ہوگا۔ اور جس طرح ماں کی عظمت کا جذبہ اپنے بچوں کے دل و دماغ میں بچپن سے ہی بٹھایا جاتا ہے اسی طرح مادری زبان کی قدر و منزلت کا جذبہ بھی بچپن سے ہی پروان چڑھایا جانا چاہیئے۔

اس کے بعد جب اردو مادری زبان والی یہ نسل اپنا تعلیمی سفر طئے کرے گی تو ان کے ذہنوں میں اپنی زبان کو موجودہ ترقی یافتہ دور کی ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے کی جستجو رہے گی۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کی ایسی نسل سے ہم امید کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی زبان پر فخر کرنے کے لیے معاشرے کے تمام میدانوں میں خصوص کر انٹرنیٹ کے میدان میں اس کی ترویج واشاعت کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کرے گی۔

کیا بات ہے کہ اردو کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی کی خبریں آئے دن اخباروں کی زینت بنتی رہتی ہیں ؟ حالانکہ یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہم اردو والے اردو کی نشر واشاعت اور اس کے فروغ میں اتنا کام نہیں کرتے جتنا تنقید وتبصروں پر کرتے ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری اردو زبان انٹرنیٹ پر' ایرپورٹ پر' سرکاری محکموں کے سائن بورڈوں پر غرض کہ ہر جگہ نظر آتی رہے۔ اور اس کے لیے بڑی شدومد کے ساتھ احتجاج' اخباروں میں رسائل اور دوسرے ذریعوں سے اس کے چرچے آئے دن دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ بقول علامہ اقبالؔ :

چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم

لیکن اس تلخ حقیقت کی طرف توجہ دینے کی کوئی کوشش نہیں ہوتی کہ اگر ہماری زبان عام ہو جائے گی اور حکومت واداروں کو اس کی مقبولیت کا ادراک واحساس ہو جائے گا تو وہ

خود اس کے استعمال کے لیے مجبور ہو جائیں گے۔ دوسری زبانوں میں انٹرنیٹ اور دیگر مقامات پر اشتہارات یا ای میل وغیرہ کی سہولت صرف اس لیے ہے کہ اس کے ذمہ داروں کو معلوم ہے کہ اس زبان والے لوگ اپنی زبان سے ہٹ کر دوسری زبان میں کوئی بات پڑھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ زبانیں سیکھنا اور ان کا پڑھنا یقیناً بہترین عمل ہے لیکن اپنی مادری زبان کو پسِ پشت ڈال کر ایسا کرنا کوئی اچھا عمل تو نہیں۔ ہم عام محافل میں بھی یہ بتانے سے اجتناب کرتے ہیں کہ ہماری مادری زبان اردو ہے۔ ہم لوگ اپنے بچوں اور دوسروں سے فخریہ انداز میں انگریزی میں بات کرتے ہیں۔ کیا یہ بات ذمہ داروں کو نہیں معلوم کہ اردو دانوں کا ایک بڑا طبقہ اردو جانتے ہوئے بھی اردو میں بات کرنے اور لکھنے پڑھنے کو مستحسن نہیں سمجھتا پھر بھلا وہ کیونکر اردو میں اشتہارات یا انٹرنیٹ پر اردو زبان کی سہولت فراہم کرے گا۔ بات وہی ہے جو علامہ اقبال نے اپنے شعر کے دوسرے مصرعے میں بیان کی کہ :

پہلے پیدا تو کرے تم میں کوئی قلبِ سلیم

اپنی بات کو موضوع کی طرف لے جاتے ہوئے عرب معاشرے میں اردو کے رول کے بارے میں عرض کرنا چاہوں گا۔ اردو سے غیر ملکیوں اور عربوں کی دلچسپی نئی نہیں۔

اگر ہم ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو بخوبی اندازہ ہوگا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے بعد سے ہی انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اردو میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے بعض تجارتی اور سیاسی مقاصد کے تحت اس زبان کو

سیکھتے تھے جب کہ ان کی ایک بڑی تعداد محض علمی مقاصد کے تحت اس زبان کو سیکھتی تھی۔ تاریخ اس بات کی بھی شاہد ہے کہ بعض مستشرقین کو اس زبان میں اتنی کشش اور جاذبیت نظر آئی کہ انہوں نے زبان کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی دلچسپی لی اور شعر و ادب کے ذریعہ ہندوستانی تہذیب و تمدن اور ہندوستانی مزاج کی رنگا رنگی کا گہرا مطالعہ کیا۔

عربوں میں بھی اردو گزشتہ نصف صدی سے غیر معمولی مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ اردو زبان عربوں میں تجارتی مقاصد کے لیے تو صدیوں سے بولی اور سمجھی جاتی رہی لیکن اس کی اسکرپٹ اور اردو میں عربی زبان کے الفاظ کی موجودگی نے عربوں کو اس زبان سے اور بھی قریب کیا۔ عرب ممالک سے اب بیشتر طلباء ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک کو اعلیٰ تعلیم کے لیے جانے لگے ہیں اور ہند و پاک سے تعلیم کے حصول کے بعد واپسی پر وہ اچھی خاصی اردو بولنے اور سمجھنے لگے ہیں۔ عرب ممالک کے معاشرے میں اردو زبان کے فروغ کی کوششوں کو اردو داں طبقہ میں جو یہاں ملازمت کی غرض سے مقیم لاکھوں کی تعداد میں ہیں تیز تر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اردو بول چال میں تو ٹھیک ہیں لیکن لکھنے پڑھنے سے نابلد ہیں۔ ان پر تھوڑی سی محنت کی جائے تو اردو داں حضرات کا ایک بہت بڑا طبقہ بن سکتا ہے۔

اس کے لیے پہلا آسان کام اردو داں طبقے میں اردو لکھنے پڑھنے کی ترغیب و تربیت ہے جس کے لیے اردو پڑھانے کا مواد اور سامانِ تعلیم اور ترغیب کے اشکال پر غور کرنا ہوگا۔ اردو پڑھانے کے لیے قاعدے اور کتب مختلف اردو کے بورڈس اداروں کی جانب سے جاری تو ہوتے ہیں لیکن ان کا استعمال صرف سنجیدگی سے اردو سیکھنے والے لوگ ہی کرتے ہیں۔ زبان کی ساخت' صوتیاتی نظام' آوازوں کی درجہ بندی اور تحریری علامتوں کو اگر جدید ٹکنالوجی کی مدد سے آسان اور عام فہم بنا کر پیش کیا جائے تو

یقین ہے کہ اس سے نا صرف بڑی عمر کے لکھنے پڑھنے سے ناواقف لوگ استفادہ کر پائیں گے بلکہ نئی نسل تو اس سے بہت ہی کم وقت میں فیض یاب ہو سکے گی۔ ابھی کچھ دن قبل حیدرآباد یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر مظفر شہ میری سے ان کے آفس میں بہت تفصیلی ملاقات رہی جس میں انہوں نے یہ خوشخبری سنائی کہ وہ اردو کو میڈیا کہ ذریعہ آسان طریقہ سے سیکھانے کے ایک پروجکٹ پر کام کر رہے جس کی لاگت تقریبا ایک کروڑ ہوئی ہے جو ای ٹی وی اردو کے مالک راموجی راؤ اور آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے مالی اشتراک سے زیر تکمیل ہے۔ اس پروگرام کے جملہ ۲۷ اپی سوڈس ہیں اور اس کا نام انہوں نے ''آؤ اردو سیکھیں'' رکھا ہے۔ تقریبا ۱۳۰ اپی سوڈس تیار ہو چکے ہیں اور اس کی کچھ جھلکیاں بھی انہوں نے مجھے اپنے کمپیوٹر پر دکھائیں۔ یہ واقعی نہایت اچھا پروگرام ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ جو اس پروگرام کے ۲۷ اپی سوڈس کو بغور دیکھے گا اور اس کی تعلیمات کے مطابق مشق کرے گا وہ اردو بآسانی لکھ اور پڑھ سکے گا۔ میری خواہش پر انہوں نے اس کا کچھ مواد سی ڈی کی شکل میں روانہ کرنے کا وعدہ کیا ہے تا کہ ہم جدہ اردو اکیڈمی کے ذریعہ انہیں اردو داں حضرات تک پہنچا سکیں۔

عرب ممالک میں مقیم اردو داں حضرات کو اردو سیکھنے کی جانب ترغیب دینا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ قونصلیٹ اور سفارت خانے کے علاوہ دیگر تنظیموں کی جانب سے مشاعرے، محافل غزل اور سیمینارز وغیرہ کے وقتاً فوقتاً انعقاد سے یقیناً اردو کے فروغ میں کافی مدد ملتی ہے اور یہ اس میں نہایت اہم رول بھی ادا کر رہے ہیں لیکن اردو میں خطوط نویسی، ای میل، ادبی ثقافتی اور مذہبی اردو کتابوں کے مطالعہ کے لیے لوگوں میں اردو کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے جہد مسلسل کی اشد ضرورت ہے۔ جدہ اردو اکیڈمی اور بعض دوسری تنظیمیں لوگوں کو راغب

کرنے کے لیے مشاعروں اور غزل کی محفلوں کے علاوہ طنز و مزاح کی محافل، محفل لطیفہ گوئی، اردو کوئز مقابلوں وغیرہ کا اہتمام تو کرتی رہتی ہیں لیکن اس میں جگہ کی عدم دستیابی اور قبل ازیں اجازت ناموں کے حصول وغیرہ جیسی چیزیں مانع بن جاتی ہیں۔ انڈین اسکول کے ذمہ داران اور قونصلیٹ اور سفارت خانے اس سلسلے میں اگر کچھ آسانیاں فراہم کریں تو یہ تنظیمیں فروغ اردو میں اپنا اچھا خاصہ رول ادا کر سکتی ہیں۔ ہندوستان کی قومی کونسل برائے فروغ اردو کی جانب سے اگر اردو کے اخبارات، رسائل اور کتب کی ترسیل کے علاوہ اگر اردو کے ماہرین تعلیم اور شعراء کو سال میں دو تین بار بھی بھیجنے کا انتظام کر پا سکے تو عرب ممالک میں اردو کے فروغ کے کام میں مزید تقویت بخشی جا سکتی ہے۔ جناب خواہ مخواہ کے ان دو اشعار پر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ

زمانے بھر میں اک تہذیب کی پہچان ہے اردو
ہماری آن ہے اردو ہماری شان ہے اردو
ہمارے حق میں یہ تو خواہ مخواہ مانند شہ رگ ہے
ہمارا جسم اردو ہے ہماری جان ہے اردو

☆☆☆

جناب زاہد علی خاں عالمی اُردو کانفرنس کے ایک اجلاس میں اپنا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے

کانفرنس کے شرکاء کے ساتھ پروفیسر اے۔ایم۔پٹھان پروفیسر گوپی چند نارنگ جناب چندر بھان خیال ڈاکٹر سید تقی عابدی اور دوسرے

مشرقِ وسطی کے اسکولوں میں اردو تعلیم

حسن عبدالکریم چوگلے (دوحہ قطر)

آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ جدہ میں ہونے والی اس اردو کانفرنس میں مقالہ پڑھنے والے سبھی حضرات اردو کے ڈاکٹرس ہیں۔ اور میں اکیلا اردو کا مریض ۔ میں مریض ہوں اردو کے فروغ کا، میں مریض ہوں اردو کی ترویج وترقی کا۔

کل چندر بھان خیال نے کہا تھا اردو کا اعلیٰ درجہ کا کام تو ہو رہا ہے توجہ طلب ہے کیوں کہ اب اعلیٰ درجہ کے کام کے لیے ہمارے پاس مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی جیسا موثر و مستحکم ادارہ موجود ہے ضرورت ہر سطح پر بنیادی کام کی ہے دوحہ قطر میں ہم بنیادی کام ہی انجام دے رہے ہیں۔

جیسے میں نے کہا نہ ہی اردو کا ادیب ہوں نہ شاعر بلکہ اردو کا ایک ادنیٰ سا خادم ۔ میں عملی کام پسند بھی کرتا ہوں اور کرتا بھی ہوں جسے اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔

تقدیر سے ممکن ہے نہ تحریر سے ممکن
وہ کام جو انسان کا کردار کرے ہے

عام طور پر میں نے یہ دیکھا ہے کہ تقریروں میں یا تو کیا ہو رہا ہے اس پر نکتہ چینی کی جاتی ہے یا کیا ہونا چاہیے اسے بطور ہدایات پیش کیا جاتا ہے۔

خواتین وحضرات نکتہ چینی اور ہدایات سب سے آسان کام ہے۔ ہونا یہ چاہیے

ہم وہ بیان کریں جو ہم عملی طور پر کہتے ہیں۔ یا کرنے کے لیے عملی طریقے Practical solutions پیش کرنے چاہیے۔

میری تقریر علم و اسکولوں کی ہمت، زبان کی اہمیت کہ دوحہ قطر میں اردو کے فروغ، ترویج و ترقی کے لیے کیا کیا جارہا ہے اس پر مبنی ہے۔

خواتین و حضرات! قوموں کے تشخص کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے لسانی، ثقافتی و علمی ورثوں کو پوری توجہ اور دیانت داری کے ساتھ آنے والی نسلوں کو سونپنے کا کام جاری رکھیں۔ اقوامِ عالم کی تاریخ گواہ ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جن قوموں نے اس کام کو جاری رکھنے والے اسکولوں اور اداروں سے بے توجہی یا بے تعلقی برتی اور ان کے معیار کو پست و کمتر درجہ پر رکھا تو وہ یا تو رفتہ رفتہ اپنا وجود کھو بیٹھیں یا پھر اس طرح کے کاموں کو جاری رکھنے والی دوسری مخالف قوموں میں جذب (مدغم) ہوجانے پر مجبور ہوگئیں اور اپنا وجود کھو بیٹھیں۔

سر سید احمد خاں نے علم کو ایک بہترین اور مجرب نسخہ قرار دیا ہے۔ ہمارا مذہب بھی علم کی فضیلت پر اصرار کرتا ہے، کیوں کہ علم جائز و ناجائز کو پہچاننے کی علامت ہے، وحشت میں جی بہلانے والا سفر کا ساتھی، تنہائی میں ایک مونس، خوشی اور رنج میں دلیل، دشمنوں پر ہتھیار اور عمل کا امام ہے۔ علم دلوں کی روشنی اور آنکھوں کا نور ہے اسی سے خیر و شر، حلال و حرام کی تمیز ہوتی ہے۔

تعلیم و زبان کا رشتہ جسم و جان کا ہوتا ہے اس لیے شاید ماں کی گود کو پہلا مدرسہ کہا جاتا ہے، ساری دنیا میں متفقہ طور پر ہر انسان اپنی مادری زبان سے پہچانا جاتا ہے۔

مجھے فخر ہے کہ میں ہندوستانی ہوں میری مادری زبان مراٹھی ہے تو اردو میری پسندیدہ زبان ہے، میرا تعلق مہاراشٹرا کے علاقے کوکن سے ہے،۔ اردو سے محبت اور اردو کا چلن یہاں کے خمیر میں رچا بسا ہے۔ الحمدللہ کوکن میں (۱۱۰) اردو ہائی اسکولس اور (۳۵) جونیر کالج ہیں۔

میرا قائم کردہ ادارہ آئیڈیل فاؤنڈیشن ان تمام اسکولوں اور کالجوں کے مابین ایک رابطہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے ذریعہ ادبی مباحثے (ڈبیٹ) تعلیمی مقابلے، کوئز کانٹسٹ (معلوماتی مقابلے) بیسٹ ٹیچر اور بیسٹ اسٹوڈنٹ ایوارڈ سالانہ منعقد کیے جاتے ہیں اور دیئے جاتے ہیں۔ جس سے اردو اساتذہ اور طلباء و منتظمین میں اردو کے فروغ کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔

خواتین و حضرات! زبان کتابوں سے زندہ رہتی ہے، کتاب ایک ایسا دائمی اور دیرپا طریقہ کار ہے کہ عہد نابود ہوجائیں، تہذیبیں مٹ جائیں، لیکن کسی ادیب، کسی شاعر، کسی انقلابی، کسی بے لوث خدمت گار کی لکھی ہوئی یا پھر اس پر لکھی ہوئی ایک کتاب بھی بچ جائے تو وہ شخص صدیوں زندہ رہ سکتا ہے۔ اس خیال کو تقویت پہچانے کے لیے آئیڈیل فاونڈیشن نے کئی کتابیں شائع کرنے کا اہتمام کیا، تین کتابیں شخصیات و خدمات پر (۱) کیپٹن فقیر محمد مستری کی حیات و خدمات (۲) نباضِ قوم (سوانح حیات ڈاکٹر عبدالکریم نائک) (۳) اظہر من الشّمس (سوانحی خاکہ جناب علی ایم شمسی) تین شعری مجموعے (۱) مہک، محمود الحسن ماہرؔ (۲) زخمہ، قاضی فراز احمد (۳) شاکرؔ سوپاروی لمحوں کی آگ، اور دو تحقیقی کتابیں (۱) کوکن میں تخلیقِ ادب (۲) شعرائے کوکن ایک

جائزہ (یعقوب راہی) اور علاوہ ازیں شمیم حیدر کے افسانوں کا مجموعہ (پڑاؤ) قابلِ ذکر ہیں۔ دوحہ قطر میں سات ہندوستانی اسکولس ہیں جن میں آئیڈیل انڈین اسکول قائم کردہ ۱۹۸۴ء کا میں بنیادی ممبر ہوں نیز دہلی پبلک اسکول کی برانچ ماڈرن انڈین اسکول قائم کردہ ۲۰۰۰ء کا بنیادی صدر ہوں۔ محبانِ اردو کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ دوحہ کے ساتوں اسکولوں میں اردو زبان شامل ہے۔ سبھی اسکول انگریزی میڈیم کے ہیں مگر تین اسکولوں میں اردو کو دوسری زبان (Second Language) کا درجہ حاصل ہے اور بقیہ میں طلبہ کی تعداد کی مجبوری کی بناء پر تیسری زبان (Third Language) کا درجہ حاصل ہے۔

جہاں تک مشرقِ وسطی کے اسکولوں میں اردو کے فروغ کا کام ہے تو اس کے اہم پہلو پر روشنی ڈالنا میں اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہوں۔ اردو کو بحیثیت زبان اختیار کرنے میں عمل دخل بچوں کا نہیں بلکہ سرپرستوں کا ہوتا ہے۔ لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو بحیثیت مضمون اختیار کرنے کے لیے ہمیں بچوں میں مختلف قسم کے مقابلوں کے انعقاد سے اردو کا ذوق وشوق پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ایک باقاعدہ مہم کے ذریعہ زبان کی اہمیت کی طرف سرپرستوں کو متوجہ کرانا ہوگا۔ تاکہ اسکولوں میں اردو زبان کو بطورِ مضمون اختیار کرنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو سکے۔

اردو زبان کے رجحان کو بڑھانے کے لیے ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ اردو سمینار، کانفرنس اور مشاعروں کا گاہے گاہے اہتمام کیا جائے۔ اردو شاعری کو دنیا کی ساری زبانوں میں برتری حاصل ہے، جس کو ہر زبان والا اشتیاق سے سنتا ہے اور دل

چسپی لیتا ہے۔ اردو کے پرستاروں کو جمع کرنے کے لیے مشاعروں کا ہی نعرہ دیا جاتا ہے۔ مشاعرہ اردو کی معمولی شد بد رکھنے والوں کو بھی اپنی جانب کھینچتا ہے۔ مشاعرہ اردو خدمات کی وہ ابتدائی درسگاہ ہے جو اردو کے رجحان کو بڑھاتا ہے۔ اور اردو میں دل چسپی پیدا کرتا ہے۔ دوحہ قطر میں گذشتہ ۲۵ سالوں میں، بزم اردو قطر، انڈو قطر اردو مرکز مجلسِ فروغِ اردو ادب، انجمن شعرائے اردو ہند اور انجمن محبانِ اردو قطر کے باعث درجنوں سمینار اور سینکڑوں عالمی مشاعروں کا انعقاد کیا جاتا رہا ہے، جس سے اردو کی فضاء بنی رہی ہے اور راستہ ہموار ہوتا رہا ہے۔

نہ ایک فرد کی نہ ایک مذہب کی ہے
اردو وراثتِ انسانیت ہے ہم سب کی ہے

اردو والوں کو چاہیے کہ اپنے اغراض ومقاصد میں سرفہرست اور فرضِ اولین سمجھ کر اس بات کی کوشش کریں کہ اپنے اپنے شہر میں ایک اچھی اور معیاری ادبی لائبریری کا قیام کریں جو طالب علموں سے لے کر ادیبوں تک کی ادبی تشنگی کی سیرابی کا سامان فراہم کرے۔

خلیجِ عرب میں چوں کہ صرف بارہویں کلاس یا ہائر سیکنڈری تک ہونے کی وجہ سے خصوصاً طالبات کے لیے جو کئی وجوہات کی بناء پر اپنی تعلیم کا سلسلہ اپنے وطن جا کر جاری رکھنے سے قاصر ہیں یا ان کے والدین انہیں وطن نہیں بھیج سکتے۔ اور وہ لوگ جو اپنی تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر تلاشِ معاش میں گلف کا رخ کر چکے ہیں۔ ان کے حصولِ علم کے جذبہ کو پورا کرنے کے لیے ہم نے دوحہ قطر میں ۱۹۹۰ء میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے

اس وقت کے وائس چانسلر پروفیسر مسعود حسن خان کی موجودگی میں مراکزِ امتحانات قائم تھا۔جس کا میں بانی مہتمم تھا جو ۲۰۰۰ء تک چلتا رہا۔اب انشاءاللہ ۲۰۰۹ء میں وعدے کے مطابق مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر پٹھان صاحب خود دوحہ قطر کے مرکز امتحانات کا قیام عمل میں لائیں گے۔

خواتین وحضرات! اردو ایک میٹھی زبان ہے جو برصغیر کی سب سے پسندیدہ اور مقبول زبان ہے اب مشرقِ وسطی میں بھی وہی درجہ اور وہی مقام حاصل کر چکی ہے جس کی وہ حقدار ہے، چند جملے اردو کے تعلق سے کہ اردو کیا ہے۔

میں اردو ہوں میں بڑی آزاد مزاج اور ملنسار واقع ہوئی ہوں، اس لیے جو مجھے اپنانا چاہتا ہے میں اسی کی ہو کر رہ جاتی ہوں۔ جو مجھے پناہ دیتا ہے اس سے محبت کرنے لگتی ہوں، جو مجھے پڑھتا ہے میں اس کو آگاہی بخشتی ہوں، جو مجھے سمجھتا ہے میں اسے رازِ حیات بتاتی ہوں، میرا کہیں قیام نہیں، میری کوئی حد نہیں، ہر قوم وملت سے میری دوستی ہے۔ ہر زبان سے میرا رشتہ ہے، انسانیت میرا مذہب ہے۔ مٹھاس میری سرشت ہے، اتحاد میرا نعرہ ہے یگانگت میری کوشش ہے۔

ایک نوجوان دانش عامری نے کیا خوب کہا ہے کہ

وہ اردو کا مسافر ہے یہی پہچان ہے اس کی
جہاں سے بھی گذرتا ہے سلیقہ چھوڑ جاتا ہے

اردو کی بدقسمتی یہ بھی رہی کہ اسے ہر زمانہ میں دبانے کی کوشش کی گئی مگر اس میں اتنی لچک ہے کہ ابھرتی ہی رہی اور انشاءاللہ رہتی دنیا تک برقرار رہے گی۔

آخر میں مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے اس قابلِ قدر اقدام کی ستائش کرتا ہوں کہ جنہوں نے مشرقِ وسطی کے ایک اہم ملک سعودی عرب میں ایک عالمی کانفرنس منعقد کر کے ایک مثبت اور مستحکم قدم اٹھایا ہے میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس کوشش کو کامیابی عطا کرے اور یقین دلاتا ہوں کہ دوحہ قطر کے محبانِ اردو آپ کے ساتھ ہیں اور ہر طرح کے تعاون کے لیے تیار ہیں۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

☆☆☆

اردو زبان: موجودہ صورتِ حال، مسائل اور ان کا حل

ظفر علی نقوی
صدر نشین ین یم سی ای

اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوئی، پلی بڑھی اور پروان چڑھی۔ اپنی گوناگوں خصوصیات کے سبب اردو بلا تفریق مذہب وملت ہندوستانی عوام کے دل میں اپنا گھر بناتی رہی اور وسیع پیمانے پر ہندوستان میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان کی حیثیت سے منفرد مقام کی حامل ہوئی۔ یہ ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان کی آٹھ سو سالوں کی عظیم وراثت کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے پہلے تک اردو ہندوستان میں پھولتی پھلتی رہی مگر بعد ازاں فرقہ پرست قوتوں کے مسموم لائحہ عمل کے نتیجے میں تنگ نظر سیاست کا شکار ہوئی اور تنزلی سے دوچار ہوئی۔

اردو زبان کی واضح تنزلی کی صورتِ حال تب سامنے آئی جب ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ ہندوستان نے سرکاری کاموں کی انجام دہی کے لیے ہندی زبان کا انتخاب کیا جب کہ پاکستان نے اردو زبان کا۔ فرقہ وارانہ جذبات سے مغلوب سرپھروں نے تقسیم ہند کا الزام اردو کے سر ڈالا اور کہا کہ اردو زبان وثقافت کے لیے علیحدہ خطہ بطور پاکستان مختص ہو چکا، لہذا ہندوستان میں اردو کے لیے کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ دراصل اردو کو مسلمانوں سے جوڑ کر دیکھنے کا سلسلہ ۱۹ویں صدی سے ہی شروع

کیا تھا۔ چوں کہ انگریزوں کو یہ مطلق پسند نہ تھا کہ اردو زبان ہندوستانی سیاست میں میل جول کا ایک طاقتور ذریعہ بن کر اُبھرے۔ اس لیے انھوں نے اپنی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے عین مطابق فارسی رسم الخط میں لکھی جانے والی اردو کو مسلمانوں کی زبان اور دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی کو ہندوؤں کی زبان کے طور پر پروجکٹ کرنے کی مہم شروع کردی اور اس طرح اردو ہندی کے درمیان اختلافات کی چنگاری کو ہوا دے کر شعلوں میں تبدیل کردیا۔ انگریزوں کی یہی وہ شر انگیزیاں تھیں جنہوں نے یہ یقینی بنادیا کہ مستقبل کے ہندوستان میں اردو کو مسائل سے نبرد آزما ہوتے رہنا پڑے گا۔ لہذا ۱۹۴۷ء تک آتے آتے اردو کے روشن وجود کو گہن لگنا شروع ہوگیا۔

اردو کی صورت حال میں دوسری بڑی ابتری تب آئی جب ۱۹۵۶ء میں لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تنظیم نو عمل میں آئی۔ اس وقت دستورِ ہند کے جدول آٹھ میں شامل تقریباً سبھی زبانوں کو (بجز سنسکرت، سندھی، اور اردو کے) اپنے بولنے والوں کی اکثریت کے علاقوں میں سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ تنظیم نو کے نتیجے میں اتر پردیش، آندھرا پردیش، پنجاب اور ہریانہ میں، جو اردو کے گہوارے تھے، اردو بے گھر ہوگئی اور اس کی جگہ ہندی اور ریاستی زبانوں نے لی۔ جموں وکشمیر سے قطع نظر، اردو بڑی ریاستوں کی سرپرستی سے محروم ہوگئی۔ آج بھی یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔ مگر کوئی بھی ریاست ایسی نہیں جہاں اکثریت اردو بولنے والوں کی ہو۔ مثال کے طور پر اتر پردیش میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۱۹۹۱ء کی

مردم شماری رپورٹ کے حساب سے ۱۷۵،۶۷،۰۷،۱ ہے جو واقعی ایک نا قابل نظر انداز تعداد ہے لیکن پوری ریاست کے تناظر میں یہ کل آبادی کا محض گیارہ فیصد ہی ہے اردو والوں کی بکھری ہوئی آبادی اردو تعلیم و تدریس اور فروغ و اشاعت میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

اگر چہ آزادی سے پہلے ہندوستان میں زبان کی سیاست سرگرم رہی اور اردو زبان کو بلی کا بکرا بننا پڑا لیکن بعد میں دھیرے دھیرے حالات میں بہتری پیدا ہوئی۔ موجودہ دور میں اردو کی صورت حال نسبتاً بہتر ہوئی ہے۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق چوں کہ ۲۰۰۱ کی مردم شماری کی رپورٹ ابھی تک دستیاب نہیں ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد تقریباً ۴۴ بلین ہے جس میں سب سے زیادہ اردو بولنے والوں کی تعداد اتر پردیش میں ہے اور اس کے بعد بتدریج بہار، آندھرا پردیش، مہاراشٹر اکرناٹک، مدھیہ پردیش اور راجستھان میں ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے تقریباً تمام خطوں میں اردو بولنے والوں کی کچھ نہ کچھ تعداد ضرور موجود ہے اور اس طرح اردو زبان کو ہندوستان کی سطح پر رابطے کی زبان (Lingua Franka) کی حیثیت حاصل ہے۔

سرکاری سطح پر ہندوستان کے مختلف خطوں میں اردو بولنے والوں کی کثیر آبادی اور ان کے جذبۂ حُب اللسانی کے مدِ نظر مرکزی سرکار اور مختلف ریاستی سرکاروں نے اردو کی نمایاں حیثیت کا اعتراف کیا۔ اردو کو ہندوستانی زبان کی حیثیت سے دستورِ ہند کے نفاذ کے ساتھ ہی آٹھویں جدول میں شامل کرلیا گیا۔ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے مرکزی

سرکار نے ۱۹۶۹ء میں ترقی اردو بورڈ اور ترقی اردو بیورو قائم کیے۔ حکومتِ ہند نے ۱۹۷۲ء میں ملک گیر سطح پر اردو کی صورتِ حال کا جائزہ لینے اور اردو کی ترقی کی غرض سے اقدامات کرنے کے لیے جناب اندر کمار گجرال کی صدارت میں ایک اعلیٰ اختیاری کمیٹی تشکیل دی جس کی تفصیلی رپورٹ مع ۲۲۰ سفارشات، ۱۹۷۵ء میں پیش کی گئی۔ حالاں کہ یہ سفارشات نافذ نہ ہوسکیں مگر اس نے اردو زبان کی بقاو ترقی پر مباحث کے دروازے ضرور وا کردیے۔ اردو اساتذہ کی تربیت اور پیشہ ورانہ فروغ کے لیے مرکز نے سی۔آئی۔آئی۔ایل۔ کی سرپرستی میں لکھنؤ اور ہماچل پردیش میں ادارے قائم کیے۔ اردو طلبہ کی نصابی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے قومی کمیشن برائے تعلیم نے تحتانوی سطح سے لے کر اعلیٰ ثانوی سطح تک اردو زبان میں کتابیں شائع کیں۔ حکومت نے ۱۹۵۶ء میں ترقی اردو بورڈ کی ''قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان'' کے نام سے ایک خود مختار ادارہ کے بطور تشکیلِ نو کی تا کہ حکومتِ ہند کے ذریعہ اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے چلائی جارہی پالیسوں کی عمل آوری کو یقینی بنایا جاسکے۔

آج ہندوستان کی مختلف ریاستوں خصوصاً مہاراشٹرا، آندھرا پردیش، جموں و کشمیر، بہار، کرناٹک، مدھیہ پردیش اور مغربی بنگال وغیرہ میں بڑی تعداد میں اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکول چلائے جارہے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے دیگر حصوں میں بہت سے اسکولوں میں اردو کو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائے جانے کا نظم ہے۔ ملک کی تقریباً پچاس سے زائد یونیورسٹیوں میں پوسٹ گریجویٹ سطح پر اردو درس و تدریس اور تحقیق کی سہولت دستیاب ہے۔ اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے آج ملک

میں تقریباً ۱۵ اردو اکاڈمیاں کام کر رہی ہیں۔ ان کے علاوہ بڑی تعداد میں دیگر ادارے مثلاً ادارہ ادبیاتِ اردو، انجمن ترقی اردو ہند، غالب اکاڈمی، غالب انسٹیٹیوٹ وغیرہ بھی کام کر رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا قیام بھی خصوصاً اردو زبان و تعلیم کے فروغ کے مقصد سے عمل میں آیا ہے۔ یہاں تمام علوم وفنون بشمول تکنیکی و پیشہ وارانہ مضامین کی تدریس کامیابی کے ساتھ اردو میڈیم کے ذریعہ کی جارہی ہے۔ ملک میں تقریباً تین سو اردو اخبارات اور رسائل و جرائد شائع ہو رہے ہیں۔ ملک کے اخبارات کے لیے خبر رساں ایجنسی کے طور پر یو۔این۔آئی اردو سروس کی خدمت دستیاب ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشن اردو میں خبریں اور متنوع پروگرام نشر کر رہے ہیں۔ ای۔ٹی۔وی اردو اور دوردرشن نے اردو کے لیے خصوصی چینل شروع کر رکھے ہیں۔ فلموں اور ٹیلی ویژن کی دنیا میں شروع سے آج تک اردو کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔

ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی اردو بولنے والوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔ کراچی اور حیدرآباد جیسے شہروں اور سندھ کے جنوبی سرحدی علاقوں کی عوام کی مادری زبان اردو ہے۔ حالانکہ پاکستان میں پنجابی بولنے والوں کی اکثریت ہے مگر اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے اور یہی زبان رابطے کی زبان بھی ہے۔ پاکستان کے اسکولی نظام میں اردو کی تعلیم لازمی طور پر شامل ہے۔ آج بنگلہ دیش اور نیپال میں بھی ایک خاص طبقے کا اردو کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے۔ اردو جنوبی ایشیا کی ایک بڑی زبان کی حیثیت سے آج بھی نمایاں ہے جو ملک سے باہر رہنے والے جنوبی ایشیائی لوگوں خصوصاً مسلمانوں کے درمیان رابطے کی اہم کڑی ہے۔ مشرقی ایشیاء مشرقِ وسطیٰ ،

افریقہ، یورپ، کینڈا، امریکہ ہر جگہ اردو کسی نہ کسی سطح پر موجود ہے۔ وہاں بھی اردو کے شیدائی اردو اخبارات و رسائل نکال رہے ہیں، ادبی و تعلیمی ادارے چلا رہے ہیں اور شعروادب کی محفلیں سجا رہے ہیں۔

ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اردو زبان بطور دوسری سرکاری زبان اپنا مقام بنا رہی ہے۔ جموں وکشمیر میں تو اردو کو آزادی کے فوراً بعد ہی سرکاری زبان بنا دیا گیا تھا۔ واضح ہو کہ یہاں ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی اردو کا استعمال سرکاری کاموں میں ایک معاون زبان کی حیثیت سے ہوتا رہا تھا۔ ریاست بہار نے ۱۹۸۱ء میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جب کہ اتر پردیش میں اردو کو ۱۹۸۹ء میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملا۔ آندھرا پردیش نے ۴/ جولائی ۱۹۷۷ء کو آندھرا پردیش سرکاری زبان قانون ۱۹۶۶ء میں سیکشن سات کا اضافہ کر کے سرکاری کاموں میں اردو کے استعمال کے لیے راستے استوار کیے۔ کرناٹک نے ۲۴/ نومبر ۱۹۸۲ء کو سرکاری حکم نامہ جاری کرتے ہوئے کہا کہ ریاست میں جہاں ۱۵ فیصد یا اس سے زیادہ اردو بولنے والے موجود ہیں، سرکاری حکم نامے اردو میں بھی جاری کیے جائیں گے۔ اسی طرح مغربی بنگال سرکار نے ۳/ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو ایک حکم نامہ (No.203227 (100) /CA) جاری کیا اور کہا کہ کلکتہ، آسنسول اور اسلام پور اضلاع کے اردو بولنے والوں کے مفاد میں اردو کو سبھی سرکاری کاموں کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔

اردو زبان کی صورتِ حال کا عمومی جائزہ لینے پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑی تعداد میں اردو چاہنے والوں کی آبادی موجود ہونے کے باوجود بھی سرکاری بے توجہی اور

عمائدینِ اردو کی تساہلی اور بے عملی کے سبب اردو اپنے اس مقام کا عشرِ عشیر بھی نہیں پاس کی ہے جس کی کہ وہ مستحق ہے۔ اردو کی صورتِ حال کو بہتر بنانے کے سلسلے میں اکثر اخبارات و رسائل میں مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں اور محبانِ اردو سیمیناروں اور مذکرات میں اردو کی بقاء وترقی کے لیے تجاویز پیش کرتے رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو زبان کی صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے اردو کے شیدائیوں کو اپنی کاہلی وتساہلی ترک کرنی ہوگی اور اردو کے فروغ کے لیے ایسے مختلف اقدامات کرنے ہوں گے جو قابلِ عمل اور نتیجہ خیز ہوں۔ اس کے لیے انھیں دور رخہ لائحہ عمل اپنانا ہوگا تا کہ مادری زبان کی حیثیت سے ہندوستان کے تعلیمی نظام میں اردو کو اس کا حصہ مل سکے اور سرکاری دفاتر و ادارہ جات میں قبولیت حاصل ہو سکے۔ دوسری جانب اردو زبان کے چاہنے والوں کو مستحکم عزم کرنا ہوگا کہ وہ فروغِ اردو کے لیے اپنے بل بوتے پر وہ سارے اقدامات کریں گے جن کی توقع وہ سرکار سے کرتے ہیں مگر انھیں اکثر نا اُمیدی ہاتھ لگتی ہے۔

ہندوستان میں اردو زبان کی بقاء کا واحد راستہ اسکول کی سطح پر اردو کی تعلیم و تدریس کا لازمی انتظام ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جب تک اسکول کی سطح پر اردو کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں ہوگا تب تک اردو زبان کا فروغ قطعی ممکن نہیں اور اس صورتِ حال میں نہ ادب کا فروغ ممکن ہے نہ صحافت کا، نہ ہی ہم اردو کے بڑے بڑے ادارے اور یونیورسٹیاں قائم کر سکتے ہیں کیوں کہ اردو پڑھنے لکھنے والے عنقا ہوں گے۔ لہذا ہم اردو زبان کے سوکھتے درخت کو پھر سے سرسبز کرنے کے لیے اس کے شاخوں اور پتیوں پر پانی دینے کے بجائے جڑ میں پانی دینا سیکھیں اور اسکول کی سطح پر اردو کی تعلیم و تدریس

کے نظم کے لیے یقینِ محکم کے ساتھ عملِ پیہم میں مصروف ہو جائیں۔ ایک طرف تو ہم سرکار سے اپنے بچوں کے لیے اردو میڈیم میں تعلیم کے حق کا مطالبہ کریں اور سرکاری اسکولوں میں اردو تعلیم کا نظم کروائیں۔ دوسری طرف یہ بھی اشد ضروری ہے کہ اردو معاشرہ اپنی اکثریت کے علاقوں میں خود بھی ایسے اسکول قائم کرے جہاں اردو تعلیم کا بہتر انتظام ہو۔ ایسے اسکول اردو کو بحیثیت ذریعہء تعلیم اختیار کر سکتے ہیں اور ساتھ میں انگریزی، ہندی یا علاقائی زبانیں بھی شامل کر سکتے ہیں تا کہ طلبہ کو مستقبل میں کسی قسم کی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ اردو کو بطور مضمون پڑھنے کے خواہش مند طلبہ کے لیے بھی اردو تعلیم کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو کے فروغ کے لیے اپنی جدوجہد کی بنیاد پر خلوص وصدق دلی اور محنت ولگن سے اردو کی بقاء وترقی کے لیے کیے جانے والے کام ہی حقیقی معنوں میں بارآور ثابت ہو سکتے ہیں۔

قابلِ ذکر ہے کہ ہندوستان کی کئی ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ تو حاصل ہے مگر وہاں بھی اردو تعلیم کی صورتِ حال ناگفتہ بہ ہے۔ واضح ہو کہ دفعہ ۳۴۷ کے تحت دوسری سرکاری زبان کو سرکاری دفتروں میں صرف مخصوص مقاصد کے لیے Official Language Act میں ترمیم کر کے استعمال کیا جاتا ہے مگر اس کا کوئی بلاواسطہ تعلق اس زبان کی تعلیم وتدریس کے نظم سے نہیں ہے۔ لہذا اردو کے فروغ کے لیے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہو جانا ہی کافی نہیں ہے۔ سرکار سے ہماری اصل مانگ اسکولوں کی سطح پر اردو تعلیم کا انتظام وانصرام ہونا چاہیے۔ ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے اردو زبان سے وابستہ مسائل کے حل کے لیے مطلوبہ مطالبے کے علاوہ

دوسرے گوناگوں مطالبے بھی سرکار سے کیے جاسکتے ہیں جو اردو زبان کے فروغ میں نمایاں رول ادا کرسکتے ہیں۔

مثلاً ہم حکومت پر دباؤ ڈالیں کہ

1. اردو داں طبقے کی کثیر آبادی والے علاقوں میں اسکول اور کالج قائم کیے جائیں جو ہر طرح کی جدید سہولیات سے آراستہ ہوں۔ یہ کوشش کی جائے کہ جہاں کہیں بھی ممکن ہو رہائشی سہولیات بھی ضرور دستیاب کرائی جائیں۔
2. یہ یقینی بنایا جائے کہ اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکول میں ہر مضمون کو پڑھانے والے قابل اساتذہ موجود ہوں جن کو اپنے مضمون میں تخصیص حاصل ہو، ساتھ ہی دوسرے مضامین کی بھی شُد بُد رکھتے ہوں۔

☆☆☆

اردو زبان کے عصری تقاضے، مسائل اور حل

پروفیسر ایس۔ ایم۔ رحمت اللہ
ڈین، اسکول برائے فنون وسماجی علوم
صدر، شعبۂ علم سیاسیات ونظم ونسق عامہ
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

کسی بھی زبان کا وجود انسان کی ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے عمل میں آتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر زبان کو پاسبانوں کا ساتھ اور سرکاری سرپرستی حاصل ہوجائے تو وہ مخالفین کی لاکھ کوششوں کے باوجود بھی نشو ونما پاتی اور قوم کی تعمیر وترقی میں اہم رول ادا کرتی رہتی ہیں۔ زبان اردو کی داستان بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ عہد وسطیٰ میں ہند اور آریائی زبانوں کی آمیزش کی بدولت ہندوستان میں ایک لشکری زبان نے جنم لیا جس کو دنیا میں آج اردو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس طرح اردو زبان جو سرزمین ہند پر پیدا ہوئی رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے مغلیہ دور میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی اور ملک کے مختلف علاقوں میں ذریعہ تعلیم کا شرف حاصل کرنے کے علاوہ حیدرآباد دکن میں سرکاری زبان بننے کا اعزاز بھی حاصل کی۔ حیدرآباد دکن میں میڈیسن کی تعلیم بھی زبان اردو میں ہوا کرتی تھی۔ نیز اس زبان نے بتدریج علاقائی سرحدوں کو پار کرتے ہوئے دنیا کے بیشتر ملکوں میں بھی اپنی پہچان بنائی۔ تاریخی اعتبار سے دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد ہندوستان میں اردو زبان وادب کے گہوارے تصور کیے جاتے ہیں۔ تاہم شمالی ہند میں

ہندی کے غلبہ کی وجہ سے اردو تعلیمی میدان میں تقریباً ختم ہو چکی ہے اور اگر دینی مدارس نہ ہوتے تو غالباً اس کی شمع گل ہو ہی جاتی۔ نیز جنوبی ہند میں بھی اس کی جڑیں کمزور ہوتی جارہی ہیں۔ مزید یہ کہ ہندوستان کی بعض ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا گیا لیکن اس ضمن میں کوئی ٹھوس کارروائی نہیں کی گئی۔ اس پس منظر میں اردو کی ترقی وترویج کو یقینی بنانے کے لیے ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہے۔

فروغِ اردو سے متعلق منعقد کیے جانے والے سمیناروں اور مذاکروں میں عموماً اردو ادب کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بات کی جاتی ہے اردو زبان کے تقاضوں اور مسائل کی جانب توجہ نہیں دی جاتی۔ اردو زبان کے مسائل کی یکسوئی میں ہی اردو ادب کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ لہٰذا اس مقالہ میں فروغِ اردو کے لیے اردو زبان کے عصری تقاضوں، مسائل اور حل پر بحث کی گئی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی زبان کو زندہ رکھنے اور اُسکی ترقی کو یقینی بنانے کے لیے اس زبان کا بحیثیت ذریعۂ تعلیم برقرار رہنا نہایت ہی ضروری ہے۔ مزید یہ کہ اگر کوئی زبان ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے ترقی پاتی ہے تو وہ لازماً ایک نہ ایک دن سرکاری زبان یا دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ تاہم ذریعہ تعلیم اور سرکاری زبان کی حیثیت سے برقرار رہنے کے لیے کسی بھی زبان کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا پڑتا ہے اور کوئی بھی زبان عصری تقاضوں سے اسی وقت ہم آہنگ ہوتی ہے جب کہ اس کے مسائل کی نشاندہی کی جا کر ان کو حل کیا جاتا ہے۔

ہم اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ ہندوستان کے اکثر علاقوں میں اردو زبان

کو ذریعہ تعلیم اور ہندوستان کی بعض ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان کا موقف حاصل ہے۔ نیز اردو کشمیر میں سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا اُس کے عصری تقاضوں کا تعلق بھی اردو بحیثیت ذریعہ تعلیم اور اردو بحیثیت سرکاری زبان سے ہے۔ اردو زبان کی ترقی وترویج کے لیے اس کے عصری تقاضوں کی تکمیل کرنا اور اِس کا رعظیم کے لیے اُن سے جڑے ہوئے مسائل کو حل کرنا اشد ضروری ہے۔ مزید یہ کہ چوں کہ اردو کی بقاء کے لیے اردو رسم الخط کا تحفظ لازمی ہے اور اردو کی ترقی وترویج کی ذمہ داری غیروں سے زیادہ اپنوں پر ہی رہتی ہے لہٰذا ان پہلوؤں کو بھی اردو زبان کے عصری تقاضوں میں شامل کرتے ہوئے مضمون کے آخری حصہ میں اِن تقاضوں سے متعلق مسائل اور اُن کے حل پر بھی بحث کی گئی ہے۔

مذکورہ حقیقت کے پیشِ نظر، زیرِ نظر مضمون میں اردو کے عصری تقاضوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کی تکمیل کے لیے جن عملی اقدامات کی ضرورت لاحق ہے اُن کو کچھ اس طرح سے پیش کیا گیا ہے کہ اس سے اردو زبان کے مسائل اور ان کے حل بھی واضح ہو جاتے ہیں۔

اب ہم اردو کے اُن عصری تقاضوں کی طرف توجہ مبذول کریں گے جو کہ ''اردو بحیثیت ذریعۂ تعلیم'' سے جڑے ہیں۔ اردو کو بحیثیت ذریعہ تعلیم زندہ رکھنا، اُس کو ترقی دینا، اُس کے معیار کو یقینی بنانا اور اردو کو روزگار وتحقیق سے جوڑنا اردو زبان کے ایسے عصری تقاضے ہیں جن کا تعلق اردو بحیثیت ذریعہ تعلیم سے ہے۔ ان تقاضوں کی تکمیل کے لیے حکومتوں کی جانب سے حسب ذیل عملی اقدامات ناگزیر ہیں۔

☆ اردو طبقہ کے علاقوں میں اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس اور کالجوں کا قیام عمل میں لائیں اور قابل اساتذہ کا تقرر کریں کیونکہ اردو کے فروغ کے لیے اردو زبان کی تدریس کا معقول بندوبست ہونا اور اساتذۂ اردو سچی لگن اور محنت سے اپنے فرائض انجام دینا نہایت ہی ضروری ہے۔ واضح رہے کہ سچر کمیٹی نے بھی مسلمانوں کی تعلیمی پستی کا انکشاف کرتے ہوئے مسلم علاقوں میں زیادہ سے زیادہ تعلیمی ادارے قائم کرنے کی پرزور وکالت کی ہے۔

☆ فروغِ اردو کے لیے ہر ریاست میں اردو ذریعۂ تعلیم کے زیادہ سے زیادہ رہائشی مدارس قائم کیے جائیں۔ یہ مدارس یقیناً اردو ذریعہ تعلیم کی ترقی و ترویج میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔

☆ اردو مدارس اور کالجوں میں مستقل بنیاد پر ہر مضمون کے اساتذہ اور لکچروں کا تقرر عمل میں لائیں۔ واضح رہے کہ غیر مستقل بنیاد پر اساتذہ کے تقررات کی صورت میں تعلیمی سرگرمیاں مؤثر طور پر انجام نہیں پاتیں۔

☆ مقامی و انگریزی ذریعہ تعلیم کے تمام خانگی، امدادی و سرکاری مدارس اور کالجوں میں اردو کو بطورِ اختیاری مضمون رائج کیا جائے تاکہ اردو مادری زبان کے طالب علموں کو بھی اردو پڑھنے و سیکھنے کا موقع ملے۔ اس کی بدولت اردو ذریعہ تعلیم کی ترقی کے اسباب پیدا ہو سکتے ہیں۔

☆ اردو ذریعہ تعلیم کے فروغ کے لیے طلبا اور طالبات کو مختلف نوعیت کی ترغیبی مراعات اور اس کا لرشپس فراہم کیے جائیں

☆ اردو ذریعہ تعلیم کے ٹیچروں اور لکچروں کو متعلقہ مضامین کی جدید معلومات سے آراستہ کرنے اور درس و تدریس کے جدید طریقہ ہائے کار سے واقف کرانے اور ان کے ذریعہ اردو ذریعہ تعلیم کے معیار کو بلند اور مؤثر بنانے کے لیے وقتاً فوقتاً Orientation and Refresher Courses کے انعقاد کا پابندی سے اہتمام کیا جائے اور تمام اساتذہ کے لیے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی سہولت مہیا کی جائے۔

☆ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد اور دیگر ادارہ جات کے زیرِ اہتمام منعقد کیے جانے والے اردو فاضل، اردو کامل اور دیگر کورسوں میں معیار کو یقینی بنانے کے اقدامات کیے جائیں اور ان کورسوں کو ان کے نصاب کے پیش نظر انٹرمیڈیٹ اور گریجویشن کے مماثل کا درجہ عطا کیا جائے۔ یہ اقدام اردو کو تعلیمی میدان میں بحیثیت ذریعہ تعلیم زندہ رکھنے کے لیے ثمر آور ثابت ہوگا۔

☆ مقررہ تعداد میں طلبا کی عدم دستیابی کی وجہ سے اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس، جونیئر و ڈگری کالجوں کو معدوم ہونے سے روکنے کے لیے ان مدارس و کالجوں کو طلبا کی قلیل ترین تعداد کے لزوم سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ اردو ذریعہ تعلیم کی بقاء کے لیے یہ اقدام نہایت ہی ضروری ہے۔

☆ مخلوعہ سرکاری جائیدادوں کو پُر کرنے کے لیے پبلک سرویس کمیشن اور دیگر ادارہ جات کی جانب سے منعقد کیے جانے والے امتحانات کے پرچہ جات اردو میں بھی تیار کیے جائیں اور ان امتحانات میں شریک ہونے والے اردو ذریعہ تعلیم کے امیدواروں کو بطورِ ترغیب کچھ خصوصی رعایتیں دی جائیں۔ اس کی بدولت اردو کی ترقی و

ترویج کے لیے نئی راہیں ہموار ہوں گی۔

☆ بذریعہ اردو اعلیٰ تعلیم کے کورسوں میں داخلہ کے لیے بنیادی اہلیت کے امتحان میں نشانات یا نمبرات کی کوئی حد مقرر نہ کی جائے۔اس کی بدولت نہ صرف تعلیم سے محروم اقلیتوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع دستیاب ہوتے ہیں بلکہ اردو ذریعہ تعلیم کی ترقی اور فروغ کے لیے بھی اسباب پیدا ہوتے ہیں۔

☆ اردو ذریعہ تعلیم کی ترقی کے لیے اردو کو روزگار سے جوڑنا اشد ضروری ہے۔لہذا اردو ذریعہ تعلیم کے دائرے میں روزگار سے مربوط فنی و پیشہ ورانہ کورسوں کا انتظام بھی کیا جائے۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی بدولت اردو ذریعہ تعلیم سے فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کے تحت اردو کی ترقی اور ترویج میں کافی مدد مل رہی ہے۔ یہ یونیورسٹی چند فنی و پیشہ ورانہ کورسوں کو بھی اردو ذریعہ تعلیم سے فراہم کر رہی ہے۔اس یونیورسٹی سے فنی تعلیم کے متعدد کورسوں کی اردو ذریعہ تعلیم سے فراہمی ہونی چاہیے تاکہ اس یونیورسٹی سے تحریک پاکر، دیگر تعلیمی ادارہ جات بھی اردو ذریعہ تعلیم سے فنی تعلیم فراہم کرنے کے لیے آمادہ ہوجائیں۔اردو ذریعہ تعلیم میں روزگار سے مربوط مختلف کورسوں کی عدم موجودگی کی بدولت اردو داں طبقہ انگریزی ذریعہ تعلیم کی جانب مائل ہو رہا ہے۔لہٰذا اردو کو روزگار سے جوڑنے کی صورت میں طلباء و طالبات اور اولیائے طلباء میں اردو ذریعہ تعلیم سے متعلق رغبت پیدا ہوگی اور اردو ذریعہ تعلیم کی ترقی و ترویج کے لیے جدید اسباب پیدا ہونگے۔

☆ اردو ذریعہ تعلیم کی ترقی و ترویج کے لیے اردو میں تمام مضامین کی اصطلاحات کا

پایا جانا نہایت ہی ضروری ہے۔لہٰذا جلد از جلد اردو میں تمام مضامین کے اصطلاحات تیار کیے جائیں۔

☆ اردو ذریعہ تعلیم کے فروغ اور اردو ذریعہ تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لیے اردو میں تمام مضامین کی معیاری کتابوں کا پیایا جانا نہایت ہی ضروری ہے۔ ہندوستان میں قومی سطح پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اس کار عظیم کو ممکنہ حد تک انجام دے رہے ہیں۔ ریاستی سطح پر اس غرض کی تکمیل کے لیے اردو اکاڈمی کے مقام پر مقتدر ادارہ برائے فروغ اردو (Urdu Development Authority) کے قیام کو عمل میں لاتے ہوئے فرائض کی انجام دہی کے لیے اس ادارے کو خود مختار موقف عطا کرنا اور اس کے دائرے کار میں ادبی، نصابی، تخلیقی اور تحقیقی کتب کی اشاعت و ترجمہ کی ذمہ داری کو شامل کرنا مناسب رہے گا۔

☆ اردو ذریعہ تعلیم کی ترقی و ترویج کے لیے اردو کو تحقیق سے جوڑنا اشد ضروری ہے۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں اس خدمت کو بحسن خوبی انجام دیا جارہا ہے۔ اس درس گاہ کے علاوہ دیگر یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں کی سطح پر بذریعہ اردو اعلیٰ تعلیم سے جڑے ہوئے تمام اہل لکچرر صاحبین کو اپنے اپنے مضامین میں تحقیقی پروگراموں کی نگرانی کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

توقع کی جاسکتی ہے کہ اردو کے مسائل کی یکسوئی سے متعلق مذکورہ سفارشات پر حکومت کی جانب سے عمل آوری ''اردو بحیثیت ذریعہ تعلیم'' کے عصری تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے اردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے برقرار رکھنے، اس کو مزید ترقی دینے اردو

ذریعہ تعلیم کے معیار کو یقینی بنانے اور اردو کو روزگار و تحقیق سے جوڑنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

اب ہم اردو کے ایسے عصری تقاضوں اور ان سے جڑے ہوئے مسائل و حل کی جانب متوجہ ہوں گے جن کا تعلق ''اردو بحیثیت دوسری سرکاری زبان'' سے ہے۔ یہ ایک حقیقت اور فطری عمل ہے کہ عوامی امور عوامی زبان میں ہی انجام دئے جائیں تا کہ عوام اور نظم و نسق کے مابین بہتر رابطہ قائم رہے۔ ہندوستان میں مرکزی سطح پر ہندی اور ریاستی سطح پر ریاستی زبان کو اسی اساس پر سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے۔ ریاست آندھرا پردیش، بہار، اتر پردیش، دہلی وغیرہ میں جہاں پر اردو کا غلبہ پایا جاتا ہے اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا گیا ہے اور کشمیر میں اردو سرکاری زبان کا موقف رکھتی ہے۔ واضح رہے کہ محض احکامات کی اجرائی سے مطلوبہ مقاصد برآمد نہیں ہوتے۔ اس کے لیے سنجیدہ اقدامات کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اردو کو مختلف ریاستوں میں بحیثیت دوسری سرکاری زبان رائج کرنا اور اردو کے اس موقف کو حقیقی معنوں میں برقرار رکھنا ''اردو بحیثیت دوسری سرکاری زبان'' سے جڑے ہوئے اردو کے عصری تقاضے قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ ان تقاضوں کی تکمیل کے لیے ان سے منسلک مسائل کو حل کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا متعلقہ حکومتوں کو چاہیے کہ اردو کے مذکورہ تقاضوں کی تکمیل کے لیے ان سے منسلک مسائل کو حل کریں اور اس غرض کے لیے حسب ذیل ٹھوس قدم اٹھائیں۔

☆ سرکاری دفاتر میں اردو میں پیش کی جانے والی درخواستوں کی یکسوئی کے لیے ان کا ترجمہ ریاستی یا انگریزی زبان میں کرنا نہایت ہی ضروری ہے ورنہ اردو سے ناواقف

عملہ اور عہدیداران مجاز ان درخواستوں پر ضروری اقدام کرنے سے قاصر رہیں گے۔ لہٰذا ہر سرکاری دفتر میں مترجم کا تقرر عمل میں لایا جائے۔

☆ اردو داں طبقہ بالخصوص مسلمانوں کے لیے ان کی پسماندگی کے پیش نظر تحفظات کو یقینی بنائیں۔ اس کی بدولت سرکاری دفاتر میں اردو ذریعہ تعلیم اور اردو مادری زبان کے افراد کا تقرر عمل میں آتا رہیگا اور ایسے افراد اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کرنے میں مددگار ثابت ہوتے رہیں گے۔

☆ سرکاری دفاتر میں اردو کے چلن کو عام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اردو میں دفتری اصطلاحات کی لغات موجود رہیں۔ ہندوستان کے شہر حیدرآباد میں اردو کی عظیم جامعہ ''مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی'' اردو ذریعہ تعلیم کو پروان چڑھاتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس جامعہ میں شعبہ ترجمہ اور شعبہ علم سیاسیات و نظم و نسق عامہ بھی موجود ہیں۔ یہ جامعہ اردو میں دفتری اصطلاحات کی لغات کو تیار کرنے کا کام بحسن خوبی انجام دے سکتی ہے۔

☆ سرکاری سواریوں، بسوں اور دفاتر و سرکاری ادارہ جات کے سائن بورڈس وغیرہ پر تفصیلات اردو زبان میں بھی لکھے جائیں۔ اس اقدام سے اردو زبان کو عوامی مقبولیت حاصل ہوگی۔

☆ انتظامی امور میں اردو کی ترقی و ترویج کے لیے اردو زبان میں دفتری فارمس، رجسٹرس، رسائد، سرکاری اشتہارات اور احکامات وغیرہ کی اجرائی کا انتظام کیا جائے۔

☆ سرکاری دفاتر میں اردو کمپیوٹر اور کمپیوٹر آپریٹر کی سہولت مہیا کی جائے۔

☆ اردو میں دفتری مراسلت کو عام کرنے کی خاطر اردو درخواستوں کا تصفیہ بروقت کرنے کے لیے عہدیداروں کو سختی سے پابند کیا جائے۔

☆ دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کے نفاذ کا وقتاً فوقتاً جائزہ لینے حالات کے لحاظ سے متبادل لائحہ عمل کو متعین کرنے اور ان سے متعلق عملی اقدامات کرنے کی ذمہ داری ہر ریاست میں مجوزہ مقتدر ادارہ برائے فروغ اردو (Urdu Development Authority) پر ہی عائد کی جائے اور ہر ضلع میں اس مقتدر ادارہ کی ضلع واری شاخ کا قیام عمل میں لاتے ہوئے ضلعی سطح پر انتظامی امور میں اردو کے استعمال کو یقینی بنانے کا کام اس شاخ کو تفویض کیا جائے۔

واضح رہے کہ اردو زبان کے مسائل کی یکسوئی کے لیے اس وقت ہندوستان میں موافق سیاسی حالات موجود ہیں۔ کئی ریاستوں کے وزیر اعلیٰ مسلم مسائل کی یکسوئی میں دلچسپی رکھتے ہیں، مرکزی مجلس وزراء میں وزارت اقلیتی بہبود موجود ہے، وزیر اعظم کے پندرہ نکاتی پروگراموں کے تحت اقلیتوں کی ترقی کی خاطر بہت کچھ کرنے کے لیے آمادہ ہیں اور مرکزی حکومت مسلمانوں کی سماجی، تعلیمی اور معاشی پستی کے ازالے کی خاطر سچر کمیٹی سفارشات کو نافذ کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ لہٰذا ایسے سازگار حالات میں اگر ذی اثر و بارسوخ اردو داں احباب اس بات کو محسوس کرتے ہوئے کہ حاکموں کے علاوہ اردو داں طبقہ بھی اردو کی تنزلی کے لیے قصوروار ہے اور اردو کی ترقی و ترویج کے لیے اس کے تقاضوں کی تکمیل کی ذمہ داری غیروں سے زیادہ اپنوں پر ہی ہے، متحرک ہو جائیں تو مذکورہ سفارشات سے متعلق متعلقہ حکومتوں کی منظوری حاصل کر سکتے ہیں۔

ان سفارشات پر عمل آوری اردو کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے اُن سے منسلک مسائل کو حل کرنے میں کارآمد ثابت ہوتے ہوئے اردو ذریعہ تعلیم کو فروغ دینے، اس کے معیار کو بلند کرنے، اردو کو روزگار سے مربوط کرنے اردو کو تحقیقی پروگراموں سے جوڑنے اور دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کی ترقی و ترویج کو یقینی بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

مزید یہ کہ اردو زبان کے عصری تقاضوں میں ایک اہم سوال اردو رسم الخط کا تحفظ بھی ہے۔ اردو زبان کا اردو رسم الخط سے اٹوٹ رشتہ ہے۔ اردو رسم الخط کی بدولت اردو زبان کو انفرادی موقف حاصل ہے۔ تاہم آج کل متعصب لوگوں کی اردو دشمنی کی بدولت اردو زبان کے لیے اردو رسم لخط کو ترک کرتے ہوئے دیوناگری رسم الخط کو اختیار کرنے کی مہم چل رہی ہے۔ جس دن اردو زبان کا رشتہ اردو رسم الخط سے ٹوٹ جائے گا، اردو زبان کی انفرادیت ختم ہو جائے گی۔ لہٰذا اردو زبان کی پہچان کو بنائے رکھنے کے لیے اُس کو اُس کے اپنے رسم الخط سے جدا نہ کرنا اور جب کبھی بھی اردو کے لیے دیوناگری رسم الخط کو اختیار کرنے کی بات کی جائے گی اُس کی مخالفت کرنا اور ایسے مطالبات کا سدِ باب کرنا اشد ضروری ہے۔

علاوہ ازیں کوئی بھی زبان محض افسانوں اور شاعری سے مقبول و عام نہیں ہو سکتی۔ زبان کو عوامی مقبولیت حاصل ہونے پر ہی وہ ترقی کر سکتی ہے۔ لہٰذا زبان اردو کا ایک عصری تقاضہ یہ بھی ہے کہ اُس کے فروغ کے لیے اُس کے چلن کو عام کیا جائے۔ واضح رہے کہ یہ ذمہ داری غیروں سے زیادہ اردو داں طبقہ پر ہی رہتی ہے۔ لہٰذا

اردو والوں کو چاہیے کہ اس ذمہ داری کو محسوس کریں، اردو کی ترقی سے متعلق ہر چیز کے لیے حکومت پر تکیہ کرنا چھوڑ دیں اور اپنے اپنے علاقوں میں اپنی اپنی دانش کے لحاظ سے فروغِ اردو کے لیے ایڑھی چوٹی کا زور لگائیں۔

آخر میں راقم یہ کہتے ہوئے اپنی بات کو ختم کرنا چاہتا ہے کہ عصر حاضر کے اس پر آشوب دور اور نامساعد حالات میں جس میں گنگا جمنی تہذیب وثقافت کی حامل اردو زبان کی تنزلی کے اسباب پیدا کیے جا رہے ہیں، اردو کی بقاء، ترقی وترویج کی خاطر اُس کے تقاضوں پر سنجیدگی سے سوچنا اور اُن سے منسلک مسائل کی یکسوئی کے لیے مذکورہ تجاویز پر سچی لگن سے عمل پیرا ہونا اشد ضروری ہے۔

☆☆☆

محترمہ سمیرہ عزیز

جناب مہتاب قدر

جناب نعیم جاوید

محترمہ عذرا نقوی

ڈاکٹر قمر سلطانہ

اردو طریقہ تعلیم کو بہتر اور جدید بنانے کے لیے تجاویز

سمیرہ عزیز (جدہ سعودی عرب)

یہ کانفرنس دنیا کی تیسری عالمی زبان اردو سے متعلق ہے۔ برصغیر اور مملکتِ انسانی سعودی عرب کے مابین جو تاریخی، ادبی، علمی، فکری اور تجارتی تعلقات رہے، ان تاریخی تعلقات کے پس منظر میں آج کی یہ کانفرنس بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ عربی زبان جس کی ابتداء ونشو ونما اسی مملکت انسانیت میں ہوئی، اس کا اردو زبان سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں ہندوستانی سفارت خانے اور قونصل جنرل اوصاف سعید اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد دکن کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کارِ خیر کی ابتداء کی۔ مجھے خوشی ہے کہ آج مجھے سعودی عرب سے اردو کے فروغ کے لیے کچھ سوچنے اور اپنی بات پہنچانے کا موقع ملا۔

میرا موضوع، اردو طریقہ تعلیم کو بہتر اور جدید بنانے کے لیے تجاویز، شاید اردو کے فروغ کے لیے وہ قطرہ ثابت ہو، جو دریا میں شامل ہو کر گلستانِ اردو کو سیراب کرنے کا باعث بنے۔ میرا تعلق بھی دور جدید کی نسل سے ہے تو اس حساب سے میں اپنا یہ فرض سمجھتی ہوں کہ اپنی زبان اردو کے طریقہ تعلیم کو بہتر اور جدید بنانے کی کچھ جستجو وکاوش کروں۔ کیوں کہ نئی نسل ہی اردو اور اس کی تعلیم کو اپنے نئے دور سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کچھ کر سکتی ہے۔

صحافی ہونے کی حیثیت سے میرا ناطہ مشاہداتی علم سے گہرا ہے۔اسی لیے میری گفتگو کی بنیاد ان عوامل پر ہوگی، جن کے مشاہدے نے مجھے نتائج اخذ کرنے اور تجاویز متعین کرنے میں مدد دی۔

اردو نے عربی، سنسکرت اور فارسی کے بطن سے جنم لیا۔اردو زبان انگریزی اور دوسری علاقائی زبانوں کی صحبت میں کھیل کود کر جوان ہوئی اور ابھی عالمِ شباب پر تھی کہ اس کی شوخی اور جولانی سے گھبرا کر وقت کے حاکموں اور حاسدوں نے اس کو پسِ دیوارِ زنداں دھکیل دیا۔عذر یہ تراشا گیا کہ یہ جدید دنیا کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔خود اردو بولنے والے اس سحر کا شکار ہوئے اور آج تک اس سے باہر نہیں آسکے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ماہرینِ اردو اس زبان کو جدید دنیا کے بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ اردو اور فارسی دفتری زبان ہوا کرتی تھی۔منشی فاضل اور ادیب فاضل کی سندیں نوکری کی ضمانت سمجھی جاتی تھیں۔اب یہ حال ہے کہ اردو اگر فلموں میں بھی بولی جاتی ہے تو اسے ہندی کا نام دیا جاتا ہے۔بڑے بڑے نامی گرامی شاعر اور ادیب بھی جو ان فلموں کی کہانی اور گیت لکھتے ہیں، اسے ہندی سے تعبیر کرتے ہیں۔ شناخت کا ایک خوف ہے جو ہر ایک پر طاری ہے۔اس سے زیادہ ظلم کسی بھی زبان کے ساتھ کیا ہوسکتا ہے۔اردو کی پرورش میں جتنا ہاتھ مسلمانوں کا ہے، اگر زیادہ نہیں تو کم و بیش اتنا ہی ہاتھ غیر مسلموں کا بھی ہے۔اردو ایک ایسی لڑی تھی جس نے مختلف رنگ و نسل اور مذہب کے ماننے والوں کو جوڑ کر رکھا ہوا تھا۔ میں داد دیتی ہوں، اس وقت کے

حاکموں کی دور اندیشی کو، جنھوں نے اس اہم نکتے کو سمجھتے ہوئے سب سے پہلی ضرب اس زبان پر لگائی۔اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان میں یہ زبان کس طرح آخری سانسیں لے رہی ہے۔ ہندوستان میں تو دیوناگری رسم الخط کی ترویج نے اس زبان کے لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد محدود کر کے رکھ دی ہے۔ پاکستان میں جہاں لکھنے پڑھنے کی حد تک یہ زبان زندہ ہے، عام بول چال میں انگریزی زبان کی بے جا ملاوٹ نے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

ماہرین کے مطابق زبانوں کی حفاظت دو وجوہات کے باعث ممکن ہے۔ یا تو اس زبان میں عظیم الشان علمی ورثہ ہو جیسے لاطینی یا ہسپانوی زبانیں جن سے آج تک استفادہ کیا جارہا ہے۔یا رزق کے حصول کا ذریعہ ہو۔ یہ دونوں تاریخی نظریات اپنی جگہ لیکن زبان کا ایک تعلق مادری زبان سے عشق بھی ہے۔اس عشق کو ماں کی گود میں دی جانے والی لوری اور دادی اور نانی کی زبان سے لفظوں کی برکھا میں بھیگی ہوئی دلچسپ قدیم کہانیاں زندہ و پائندہ رکھتی ہیں۔ماں اپنے بچے سے جس زبان، اسلوب، اور طرز میں گفتگو کرتی ہے، وہ بچے کے لیے زندگی کا سب سے خوبصورت، سنہری اور نا قابلِ فراموش عہد ہوتا ہے۔ مائیں اس عہد سے ہی ان کے کانوں میں اردو کا رس گھولیں۔وہ ساری زندگی اس کی مٹھاس کو فراموش نہیں کرسکیں گے۔

اردو پر ظلم سب سے زیادہ خود اردو والے کر رہے ہیں۔۔ماہرینِ اردو کی ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو ادبی نشستوں میں اردو کی ترویج و ترقی کے اوپر پُر مغز اور مدلل تقاریر کرتے نہیں تھکتے مگر خود اپنے گھر میں اپنی نئی نسل کو انگریزی بولنے کی ترغیب

دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ادبی تنظیمیں سالانہ مشاعرے اور سمینار کروا کر یہ سمجھ لیتی ہیں کہ اردو کا حق ادا ہو گیا۔اُن کے اِن ادبی سرگرمیوں کا شریک 40 اور 50 کی اوسط عمر کا ہوتا ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ یہ اوسط عمر بڑھتی ہی جا رہی ہے، کم نہیں ہو رہی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے اس قیمتی اساسے کو اپنی نئی نسل کو منتقل نہیں کر رہے۔اب جب کہ بڑی حد تک مرض کی تشخیص ہو گئی ہے تو اس کے علاج کا اہتمام کرنا سہل ہو جائے گا۔

۱۔دنیا کی تمام فعال اردو تنظیموں کو مل جل کر ایک ایسی حکمتِ عملی وضع کرنی ہوگی جو اردو کے فروغ کا باعث بنے۔

۲۔اردو ماہرینِ تعلیم کی مدد سے ایک ایسا نصاب تیار کرنا ہوگا جو جدید دنیا کی ضرورتوں کے عین مطابق ہو۔ جہاں میرؔ، غالبؔ اور داغؔ کا کلام اس میں شامل ہو، وہیں دورِ جدید کے اردو شعراء کے کلام کے علاوہ دوسری زبانوں کے جدید شعراء کے کلام کے ترجمے بھی اس میں شامل ہوں۔یہی معاملہ نثری ادب پاروں کے ساتھ بھی روا رکھنا چاہیے۔

۳۔مدرسوں کی تربیت بھی انھیں خطوط پر کرنے کی ضرورت ہے۔

۴۔چوں کہ آج کل تعلیم میں کمپیوٹر ناگزیر ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میں جدید سافٹ ویئرز تیار کیے جائیں اور ان کی ترویج بھی کی جائے۔تاکہ اردو زبان کا طالبِ علم اپنے آپ کو کسی سے کمتر نہ سمجھے۔

۵۔اسکولوں میں اردو کے مضمون کو کمپیوٹر پر پڑھانے کا اہتمام کریں۔طلباء و طالبات کا ہوم ورک اور نوٹس کاپیوں کے بجائے کمپیوٹر پر منتقل کریں۔اس سلسلے میں فی الوقت

موجود قدرے بہتر سافٹ ویئر، ان پیج، استعمال کیا جا سکتا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ عموماً انگریزی میں کمپوز کر لیتے ہیں، وہ اردو میں کمپوز کرنے کو مشکل سمجھتے ہیں یا کنی کتراتے ہیں۔یہ رویہ بدلنا ہوگا۔

۶۔آج کے دور کے اساتذہ کو سب سے پہلے خود اردو طریقہ تعلیم کو بہتر اور جدید بنانے کے لیے دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھالنا ہوگا۔اردو سافٹ ویئرز انہیں سیکھنے ہوں گے۔اردو طریقہ تعلیم کو جدید و بہتر بنانے کے لیے ایسے اساتذہ کی تعیناتی اس مقصد میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، جو اردو سے متعلق جدید ترین ٹکنالوجی سے آگاہ ہوں۔

۷۔اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اردو تنظیموں کی ایک نمائندہ کمیٹی تشکیل دی جائے جو سرکاری اور غیر سرکاری الکٹرانک میڈیا پر دباؤ ڈالے کہ وہ اپنے پروگراموں میں انگریزی الفاظ کی ملاوٹ سے پرہیز کریں۔

۸۔اردو کے فروغ کے لیے ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور انھیں وہ عزت اور مقام دیا جائے جو ان کے ہم عصر مغربی ادیبوں اور شاعروں کو حاصل ہے۔

۹۔ادیبوں اور شعراء کو ادب حاضر سے ہم آہنگ رکھنے کے لیے ورکشاپس اور سمینار منعقد کیے جائیں۔

۱۰۔بچوں میں اردو کا شوق پیدا کرنے کے لیے عمر کے لحاظ سے بچوں کا ادب تخلیق کیا جائے اور جہاں ضرورت ہو، وہاں اسے جدید گرافکس سے آراستہ کیا جائے۔

۱۱۔کھلونے اور ذہنی مشق کے کھیل تیار کرنے والی کمپنیوں کو اس بات کے لیے تیار کیا

جائے کہ وہ اور زبانوں کی طرح اردو کو بھی اپنی تخلیقات میں مناسب حصہ دیں۔

۱۲۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پروگرام لکھنے والوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ بچوں کے لیے اردو میں دلچسپ پروگرام تخلیق کریں۔

۱۳۔ نوجوانوں اور بڑوں کو خطاطی سکھانے کے مراکز قائم کیے جائیں۔

۱۴۔ اسکول کا نصاب ترتیب دینے والی کمیٹیوں پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ نصاب میں اردو تعلیم کو لازمی مضمون قرار دیں اور تدریس کے لیے ایسی کتابوں کو شامل کریں، جو عصرِ جدید کے تقاضوں کے مطابق لکھی گئی ہوں۔

۱۵۔ اردو زبان کی لائبریریوں کا قیام بہت ضروری ہے۔

۱۶۔ زیادہ سے زیادہ اردو ویب سائٹوں اور اردو سرچ ایجنسیوں کا اجراء کیا جائے۔

۱۷۔ اردو کے تحقیقی شعبوں میں دیگر زبانوں سے جدید ترین موضوعات پر ترجموں کا اہتمام کیا جائے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک خواب محسوس ہو رہا ہو، مگر یاد رکھیے کہ دنیا کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے جو ایک خواب سے شروع ہوئے اور ایک دن حقیقت کے روپ میں سامنے آئے۔ آج ہم نے اگر اردو کی ناموس کو محفوظ کرنے کی کوشش نہیں کی تو آنے والا وقت ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔

آیئے، اردو کی بقاء کی اس جدوجہد میں قدم سے قدم ملا کر چلیں۔ اس کی ابتداء اپنے اپنے گھروں سے کریں اور اپنے بچوں سے اردو میں بات کرنے کا اہتمام کریں۔ ان کو اردو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ روزانہ ان کو اردو کی کوئی اچھی کتاب یا کہانی پڑھ کر

سنائیں۔ اردو کی سنہری تاریخ سے انھیں آگاہ کریں۔ یہی اردو کی بقا، کے سفر کا پہلا قدم ہے۔

میں اپنی بات کا اختتام جناب نعیم بازید پوری کے ان اشعار سے کرتی ہوں کہ

درسِ اردو کے تقاضے پورے کرنے کے لیے
لازمی ہے روحِ اردو کا بھی کچھ ادراک ہو
عصرِ نو کے سارے درسی قاعدوں کے ساتھ ساتھ
طالب و استاد کا بھی دیدہ دل چاک ہو

☆☆☆

ہندوستان اور بیرونِ ہند
اردو کے فروغ میں میڈیا کا کردار

مہتاب قدر (جدہ سعودہ عرب)

ہندوستان اور بیرونِ ہند اردو کے فروغ میں میڈیا کا کردار، یہ ایک ایسا وسیع اور عریض موضوع ہے کہ اس کے لیے ایک آدھ مقالہ یا سمینار کافی نہیں۔ظاہر ہے اس موضوع کے ساتھ انصاف کرنا ہو تو صرف اشاروں کنایوں میں بات کی جاسکتی ہے یا پھر چند بنیادی نقطوں پر روشنی ڈال کر صرف اردو کے فروغ میں میڈیا کے کردار پر گفتگو کی جاسکتی ہے چہ جائیکہ اس موضوع کا بھی احاطہ اس مختصر سے وقت میں جس کی مجھے اجازت دی گئی ہے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

ہندوستان میں فروغِ اردو زبان میں صحافت کا کردار یقیناً بہت اہم رہا ہے لیکن صحافت کے کردار سے پہلے تاریخِ صحافت پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے چلیں۔تاریخ صحافت بالعموم انسانی تہذیب وتمدن کی تاریخ کی طرح قدیم ہے۔صحافت کا میدان کافی وسیع ہے۔ پہلے اس میں ماہنامے، پندرہ روزہ ہفت وار، اور روزناموں کے علاوہ اسی قسم کی دوسری تحریریں شامل تھیں لیکن آج کے ارتقائی دور میں صحافت کے حدود میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کے ذرائع ابلاغ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ صحافت ہر دور میں اپنے سماج اور زمانے کی بھرپور عکاسی کرتی رہی ہے اور انسانی زندگی

سے اس کا تہذیبی رشتہ ہمیشہ مضبوط رہا ہے۔مطبوعہ صحافت سے قبل مختلف طرز کے نشریاتی ذرائع اور پھر قلمی خبر نامے مروج رہے۔ چین وہ پہلا ملک ہے جس نے چودھویں صدی عیسوی میں سب سے پہلا اخبار نکال کر مطبوعہ صحافتی تاریخ کا سنگِ بنیاد رکھا، جب کہ ہندوستان میں صحافت کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی میں ہوا۔ بنگال گزٹ، انڈین گزٹ اور بمبئی ہیرالڈ اسی دور میں معرضِ وجود میں آچکے تھے۔ فارسی کے بعد اردو میں بھی صحافت کا آغاز ہوا اور بہت جلد اس نے ادب کی ایک مستقل اور اہم صنف کی شکل اختیار کر لی۔ بقولِ ڈاکٹر تنویر علوی "علم کے دوسرے شعبوں سے قطع نظر اخبارات اور خاص طور پر اردو اخبارات کا مطالعہ زبان کی تہذیبی اہمیت کو سمجھنے اور اس کی ادبی تاریخ مرتب کرنے کے لیے غیر معمولی اہم ہے، اردو نثر کے مراحل تمام تر نہیں تو بہت کچھ اخبارات کی خاموش خدمت کے وسیلے سے طئے ہوے ہیں" تحقیق کے مطابق اردو صحافت کا آغاز 1822 عیسوی میں جام ِ جہاں نما کی اشاعت سے ہوا اور ڈاکٹر شہناز انجم کے خیال میں "اردو نثر فورٹ ولیم کالج کی منصوبہ بند کوشش کے باوجود تصنع اور تکلف کا پردہ چاک نہ کر سکی لیکن پریس کی ترقی اور اخبارات کی اشاعت کے ذریعے سادگی اور مقصدیت کی طرف مائل ہوگئی اور اس میں معیاری لب ولہجہ کا عکس اور نئی زندگی کی آہٹیں سنائی دینے لگیں"

1835ء میں جب اردو کو سرکاری اور عدالتی حیثیت حاصل ہوگئی تو اردو کا دوسرا اخبار اخبارِ دہلی جو آگے چل کر دہلی اردو اخبار اور پھر اخبار الظفر ہو گیا شائع ہوا جس کا سن اشاعت بعض حوالوں سے 1837ء بھی بتایا جاتا ہے اس تاریخی اخبار کے

ناشر مولوی محمد حسین آزاد کے والدِ بزرگوار مولوی محمد باقر تھے۔اس کے علاوہ دہلی سے شائع ہونے والے دیگر ہفت روزہ اخبارات سیدالاخبار اور فوائد الشائقین کے ساتھ بنارس سے بنارس گزٹ اور آگرہ سے 1846ء میں صدر الاخبار بھی شائع ہوئے۔بہرحال جامِ جہاں نما سے قومی آواز،انقلاب،منصف،سیاست اور اعتماد تک مطبوعہ اردو صحافت کی طویل ترین فہرست ہے جس کا احاطہ مقصود ہے نہ ممکن،لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ صحافت نے ہندوستان اور بیرون ہند،اردو کے فروغ کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں چاہے وہ ذرائع ابلاغ ریشمی رومال پر لکھے گئے پیغامات کی صورت میں ہو،الہلال،البلاغ کے اثاثوں کی شکل میں یا چاہے دیگر جرائد ورسائل کی یا ریڈیو،ٹی وی چینلز اور انٹرنیٹ کی شکل میں۔یہاں یہ نقطہ واضح کرتا چلوں کہ صحافت کو اگر زبان وادب کی خدمت کرنا ہو تو سیاست سے الگ رہنا ہوگا ورنہ سیاست کی عاشقی میں صحافت کی سیادت وعزت کے بھی لالے پڑ سکتے ہیں۔یہاں کسی اخبار کا نام لینا مقصود نہیں بلکہ یہ کہنا تھا کہ نظریات اور پھر سیاسی نظریات کا لیبل چسپاں کر کے اردو کے فروغ میں حصہ لینا نتائج کے گراف کو زوال کی طرف لے جا سکتا ہے تاہم اس حقیقت کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ حیدرآباد کے روزنامہ سیاست نے اردو کے فروغ اور تحقیق و تالیف کے باب میں ہندوستان بھر میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

بیرون ہند اردو کے فروغ میں میڈیا نے کیا کردار ادا کیا ہے اس کا جائزہ لینا ہو تو اپنے پڑوسی ملک پاکستان کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا،جہاں حکومتی سطح پر اردو کی سرپرستی ہوئی اور پاکستان میں اردو کو ملک کی سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا،اس کا ہرگز یہ

مطلب نہیں کہ اردو کسی خطہ،ملک یا کسی قوم کی زبان ہے،اردو کا مادرِ وطن ہندوستان ہے، اور پھر اردو نے جب باہر قدم رکھا تو پھلتی پھولتی ہی رہی،پاکستان میں اردو کے فروغ کے لیے جتنا کچھ کام ہوا ہے،اس میں یقیناً اردو کے شعراء وادباء کا کردار کلیدی رہا ،جنھوں نے اردو صحافت کے ذریعے زبان وادب کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔اردو کے جرائد ورسائل جس قدر پاکستان سے شائع ہوتے ہیں ان کا شمار بھی مشکل ہے،اردو تحقیق وتالیف اس وقت میرا موضوع نہیں ہے تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے فروغ میں تحقیق وتالیف کا جو کام وہاں ہوا وہ یقیناً قابلِ ستائش ہے۔اردو کے فروغ میں اشاعتی صحافت یعنی 'پرنٹ میڈیا' کے علاوہ ریڈیو،ٹی وی اور انٹرنیٹ کے ذرائع ابلاغ نے بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔اردو کی نئی بستیوں میں وہ تمام علاقے شامل ہیں ، جہاں برِصغیر سے تعلق رکھنے والے اردو داں افراد تلاش معاش یا تعلیمی سلسلوں کے سبب رہائش پذیر ہوئے،اردو نے ان بستیوں میں اپنے ڈیرے ڈال دیئے اور پھر یورپ اور امریکہ سے اردو کے جرائد ورسائل کی اشاعت ہوئی اور ان بستیوں میں بھی اردو کو اپنے قاری مل گئے۔اردو سمیناروں اور عالمی کانفرنسوں نے بھی ان علاقوں میں صحافت کو مزید حوصلے بخشے۔چناں چہ آئے دن بڑے پیمانوں پر اردو کی محافل سجائی جانے لگیں۔نہ صرف یہ بلکہ وہاں کی یونیورسٹیوں میں بھی اردو پڑھائی جانے لگی اور اردو چیئرز کا قیام عمل میں آیا۔ان ہی کوششوں کے حوالے سے شمال مشرقی یورپ کے ایک شہر کوپن ہیگن سے 'ہمعصر' نامی جریدے کا اجراء بھی ہوا اور اس کے مدیر اعلیٰ نصر ملک نے ڈینش ادب کو اردو میں منتقل کرنے کا بیڑا اُٹھالیا،چناں چہ ہمعصر ڈاٹ کوم کے نام سے ہی

ویب سائیٹ کا اجرا بھی ہوا، جس پر آپ ڈینش ادب کے اردو تراجم سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ وائس آف امریکہ اردو سروس اور بی بی سی اردو سروس کے علاوہ انٹرنیٹ کی سب سے بڑی اور اولین ویب سائٹ ''اردوستان ڈاٹ کوم'' کا آغاز بھی 1997ء میں امریکہ کے ایک شہر سے ہی ہوا جس کو اردو کے ایک ہندوستانی عاشق کاشف ہدانے لانچ کیا۔ اردوستان ڈاٹ کام اردو میڈیا کا ایک ایسا ذریعہ ثابت ہوئی کہ ابتداء میں جن لوگوں نے اردوستان کو اپنا ذریعہ ابلاغ بنایا، آگے چل کر ان میں سے اکثر لوگوں نے دیگر نئی ویب سائٹس کا آغاز کر کے انٹرنیٹ میڈیا کو مزید تقویت بخشی۔ یقیناً انٹرنیٹ اردو میڈیا میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے، جس نے اردو کے فروغ میں وہ کام کیا جو کسی ادارے کے بس کا نہیں تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی ابتداء رومن اردو رسم الخط سے ہوئی لیکن رفتہ رفتہ ان پیج اور پھر یونی کوڈ کی سہولت نے اس کی یہ مشکل بھی دور کر دی اور اب اردو کی اکثر ویب سائٹس یونیکوڈ کا استعمال کر کے اردو کے فروغ میں ناقابل فراموش کردار ادا کر رہی ہیں۔

اردو کی عرب بستیوں نے بھی کسی کو پیچھے نہیں چھوڑا، ابتداء میں اردو جرائد و رسائل ہندوستان اور پاکستان ہی سے منگوائے جاتے تھے، لیکن قارئین کا سروے کرنے کے بعد یہاں کے اشاعتی اداروں نے فیصلہ کیا کہ اردو زبان میں بھی ان ہی ملکوں سے جرائد نکالے جائیں تا کہ اردو قاری کو ملکی معاملات اور قوانین سمجھنے میں بھی سہولت ہو اور ان کا ذوق زبان و ادب بھی تسکین پاس کے، چناں چہ خلیج سے بھی اردو اخبارات کا اجرا ہوا اور پھر سعودی عرب نے بھی پہلے اردو اخبار یعنی انگریزی اخبار عرب نیوز کی ذیلی

اشاعت کے طور پر اردو نیوز کے اجرا کا اعلان کیا۔ اردو نیوز سے پہلے بھی اردو اخبار ایام حج میں شائع ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن ان کا عرصہ اشاعت ایام حج تک ہی محدود تھا، اس وقت تک ریڈیو میڈیا کے طور پر سعودی ریڈیو کی اردو سروس اہل اردو میں کافی مقبول ہو چکی تھی، جس پر کلاسیکی اردو ادب، مشاعرے، حج اور دیگر ذرائع سے سعودی عرب آنے والی نامور شخصیتوں کے انٹرویو اور اردو میں مذہبی پروگرام کے ساتھ ہی تازہ خبریں بھی پیش کی جاتی تھیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ڈش انٹینا کے رواج پاتے ہی عرب ملکوں میں اردو چینلز کے شائقین کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہوا، اچھے اور بُرے اثرات سے قطع نظر ٹی وی چینلز نے بھی اردو کے فروغ میں حصہ لیا اور اہل اردو کے علاوہ دیگر زبان و تہذیب سے تعلق رکھنے والوں کی زبانوں سے بھی اردو نغمے سنائی دینے لگے۔ سعودی عرب میں قیام کے دوران گذشتہ دو دہائی قبل جب مجھے مصر اور اردن جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں بھی نام نہاد ہندی فلموں جن کی زبان نہ شدھ ہندی ہوتی ہے نہ فصیح اردو، اردو ٹی وی کے شائقین کا اندازہ اس بات سے ہوا کہ کئی مقامی لوگوں نے مجھ سے امیتابھ بچن اور ہیما مالنی کے بارے میں دریافت کیا اور ان کی فلموں کے گانے بھی سنائے۔

اردو زبان و ادب انٹرنیٹ کے ذریعے سارے عالم میں فروغ پا رہا ہے، چاہے وہ اردو کی ویب سائٹس ہوں یا آن لائن جرائد و رسائل، سب ہی اردو کے فروغ میں اپنے حصے کی شمع جلا رہے ہیں۔ خلیجی ملکوں میں مقیم اردو کے شعراء و ادباء کا ایک بہت بڑا طبقہ اردو کی ان ہی ویب سائٹس سے وابستہ ہے، کہیں یاہو گروپس کی شکل میں، کہیں گوگل گروپس کے ساتھ، تو کہیں اپنی اپنی ادبی ویب سائٹس بنا کر اپنی نگارشات کو اردو کے قاری تک پہنچانے کے لیے انٹرنیٹ کو ذریعہ ابلاغ بنائے ہوئے ہیں۔ راقم الحروف نے اپنے

دیرینہ انٹرنیٹ دوست، سالم باشوار کے تعاون اور محترم عبداللہ ناظر کے مشورے سے خلیج میں مقیم شعراء وادباء کی نمائندگی کے لیے سعودی عرب سے پہلی اردو ویب سائٹ اردو گلبن ڈاٹ کوم، کا آغاز 27 اپریل 2006 کو کیا جسکے ذریعے نہ صرف خلیج میں مقیم قلم کاروں کا آپس میں تعارف ہوا بلکہ سعودی عرب کے چپہ چپہ میں مقیم اردو کے شائقین بھی ایک دوسرے سے مستفید ہونے لگے۔ نئے لکھنے والوں کو وہ حوصلے ملے کہ جن کا اندازہ ویب سائٹس کے آغاز سے پہلے کبھی نہیں تھا۔ گزشتہ سال 2007ء کے اواخر میں انگریزی جریدہ سعودی گزٹ کی انتظامیہ نے بھی ایک ہفت روزہ جریدہ 'آواز' کی اشاعت کا آغاز کیا، اور بہت کم عرصہ میں 'آواز' اردو حلقوں میں پسند کیا جانے لگا۔

اپنے موضوع کو سمیٹتے ہوئے آخر میں یہی عرض کروں گا کہ میڈیا نے چاہے وہ کسی شکل وصورت میں ہو اردو کے فروغ کے لیے ہندوستان اور بیرونِ ہند وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جس کی تاریخ سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس لیے کہ صحافت کارِ پیمبری ہے اور جب تک صحافت سچائی کے ساتھ حقائق کی پردہ پوشی نہ کرتے ہوئے اپنے اصولوں پر گامزن رہے گی، فروغ اردو کے ساتھ ساتھ قوموں کی فکری نشو ونما بھی کرتی رہے گی۔

☆☆☆

اردو کے مسائل اور امکانات

نعیم جاوید (ریاض سعودی عرب)

ڈاکٹر مسعود حسین نے کہا تھا کہ قوموں کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب سنگ وخشت سے زیادہ حرف وصوت کے تحفظ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایک اور قولِ فیصل سرسید مرحوم کا، جو وقت وفاصلے کی اکائیاں عبور کرتے ہوئے ہمارے درِدانش پر اب بھی دستک دیتا ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ ''مغربی قوموں کی ترقی کا راز اُن کے پڑھے لکھے افراد کے ایثار کا نتیجہ ہے۔''

آج کی مجلس میں ہم نئے امکانات کا در کھولنے کی ایک دیانت دارانہ سعی کرتے ہیں۔ جب کہ اپنے مضمون کی تہذیب وترتیب میں مذکورہ موضوع پر نکات سمیٹتے ہوئے دل کو نہ یہ زعم تھا کہ میں کوئی بلند تر اختصاصی پایہ رکھتا ہوں نہ کوئی بات دریافت کی سطح پر پہنچ کر کہنے کا ادعا ہے۔ ایک طرف عمومی طور پر اُردو والوں کی ذہنی ویرانیاں اور ان کی شکست خوردہ سرد منطق سے میری فکر بھی التباس کے کہرے میں گم ہو رہی تھی تب میں نے اپنے آتشِ یقین سے کام لینے کی سعی کی۔ اور دوسری طرف ہمارے اُردو والے جدید علوم کو اُردو میں منتقلی کے اعلان پر ایسے لرز اٹھتے ہیں جیسے ان کے ہاتھوں سے تجارتی منڈیوں کی گرفت چھوٹنے والی ہو۔ سراسیمگی کے حالت میں حواس باختہ ہو کر ایسا احتجاج بلند کرتے ہیں جیسے مارکٹ کی چھت پر کھڑے چلا رہے ہوں اور جیسے اُردو کے شیرز گرنے لگے ہوں۔ رئیل اسٹیٹ کی سرمایہ داری داؤ پر لگ چکی ہو۔

ایسے میں ہم سب کا یہ اجتماعی شرف ہے کہ اس عالمی کانفرنس کے وساطت سے اس زبان کے تحفظ پر اصرار کررہے ہیں جو ہماری روحوں کے سنگم پر بنی ہمارے وجود کی آخری چوکی ہے۔اُردو کی محبت میں ہمارا یہ حال ہے بقول شاعر ؎

ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پر بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مرجاتے ہیں

ارباب دانش خوب واقف ہیں کہ زبان کے بے جا مذہبی الحاق نے اس کو سائنسی کردار نبھانے سے دور رکھا اور جدید علوم کی جلوہ سامانی کی ثروت کو سمیٹنے میں یہ بہت پیچھے رہ گئی۔عقیدتوں سے پڑھی گئیں ہزاروں کتابیں حزن ویاس کے عبرت ناک فسانوں سے اٹ گئیں اور اُردو کے قاری کو بے یارومددگار چھوڑ دیا۔لیکن زبان کے کینوس میں یہ تصور سلامت رہا کہ جدید علوم کی بجلیوں کے کُوندوں کو لفظوں کی مٹھیوں میں بھینچ لینے کے امکانات اب بھی زبان میں باقی ہیں۔اس کے الفاظ کے توانا سانچوں میں علم وفن کے آبدار موتی چمک سکتے ہیں۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہمیں ایک قدم آگے بڑھ کر اپنی جنوں تاب شاعری سے بلند ہوکر اُردو کے سخن آشنا کانوں کو برکاتِ فرنگ سے محتاط کسب ہنر کا سلیقہ عطا کرنا ہوگا۔ جدید علوم کے ہوش مندانہ تال میل کو اپنی زبان میں رواج دینا ہوگا۔ ہر طرح کی کورانہ تقلید سے بچتے ہوئے نئے علوم کی راہیں استوار کرنی ہوگی۔تراجم کی مہماتی سرگرمیوں میں مزید وقت ضائع کیے بغیر پیشہ ورانہ علوم وفنون کی کتابوں کو جنگی خطوط پر عام کرنے کی داغ بیل ڈالنی ہوگی۔

اُردو کا جز معاش ومتوسط طبقہ صرف ایک فن ایک علم اور ایک ہی کام پر انحصار کرتا

ہے۔جیسے کسی نے Graphical سافٹ ویر کی ایک کتاب خریدی اور یہی ایک ہنر سیکھا اور باقی زندگی اسی میں گذاردی۔ہمیں اولین مرحلے پر اس گروپ کو منتخب کرنا ہوگا تا کہ ارباب دانش ان موضوعات کا ماہرانہ انتخاب کرتے ہوئے پیچیدہ اصطلاحات میں اپنی توانائیاں صرف کیے بغیر مرکزی موضوع کے سہل الحصول نہج پر اشاعتی منصوبوں پر عمل کرسکیں۔

نئی نسل کے حسن عمل کے خوش آثار گلابوں کو مٹی ہونے سے بچانے کے لیے ہمارے ابتدائی سفر کے ابہامات،صعوبتیں اور گمبھیر ہیجانات میں ہم اپنے یقین کی گرمی کو شامل کرتے رہیں ۔ ورنہ عمرانی گتھیوں اور سوالوں کے جواب اتنے سہل الحصول نہیں ہوتے۔یاد رہے کہ آج کا برقی وورقی اشاعتی سرمایہ اور ذرائع ابلاغ کا برقیاتی پھیلاؤ ہماری معاون قوت ہے۔راہ کی رکاوٹ ہرگز نہیں۔جو صنعتیں تراجم کی مدد سے کتابچوں کی صورت میں جواں عزم نسل تک منتقل ہوسکتی ہیں اُن میں فیشن انڈسٹری، غذائی صنعت،تعمیراتی تزئینی صنعت،فلمی وٹی وی سے متعلق عکس بندی وصدابندی،سیٹ ڈیزائینینگ اور کاسٹیوم ڈیزائنگ بھی شامل ہے۔ان دنوں F.M Radio سے اُردو اور انگریزی کی ملی جلی نشریات نئی اقتصادی بشارت سے کم نہیں جو نئے تخلیقی ذہنوں کی کھپت کا یقین دے رہی ہے۔اُردو کی خبر سازی کے مزدور جو صحافت کے پیشے سے جڑے ہوئے ہیں اپنے فن کی معقول قیمت وصول کرسکتے ہیں،اگر صحافت کو قومی امانت سمجھ کر اخبارات کے مالکان قدر شناسی کی راہ چنیں۔کیوں کہ اُردو کا ٹائپسٹ،صحافی یا قلم کار جو اپنی سوچ کے ستارے موضوع پر ٹانکتا ہے اور دوسری کمزور ترین زبانوں سے بھی حقیر ترین اجرت اپنے فن کی پاتا ہے۔اس کے علاوہ چھوٹی صنعتوں کے ابتدائی خیال سے تنفیذی مرحلے تک محیط کتابچوں کی اشاعت کرنی ہوگی۔ساتھ ساتھ ان کمپیوٹر پروگرامس کے تراجم کی اشاعت بھی اشد ضروری ہے جیسے

Auto Cam, Auto CAD, CISCO, اور بینکنگ، تجارتی و مالیاتی اداروں اور MNC میں استعمال ہونے والے سافٹ ویرس جیسے Supply chain program Tally, Peach tree, ADBMS ایسے پروگراموں پر قدرتِ تامہ پیدا کرنے والی کتابوں کی حقیقی ضرورت ہے جس کو پڑھتے ہوئے کتاب خواں زبان کی وساطت سے علم وفن کی گتھیوں کو حل کرے گا۔ اور مترجم کی گھڑی ہوئی ذہنی وادیوں اور لسانی پگڈنڈیوں میں اپنے روشن مستقبل کی راہیں کھوٹی ہونے نہیں دے گا۔

فلمی صنعت اور ٹی وی کی تمثیلی دنیا نے وسائل کا ایک نیا جہان تیار کیا ہے۔ اب ضرورت ہے ایسی کتابوں کی جو اس فن کو برتنا بھی سیکھا دے۔ جیسے مائم۔ پیانٹومائیم (جیسے فنون جو زبان کی باندھی ہوئی بارودی سرحدوں کو فن کار صرف اپنی علامتی اداکاری حرکات و سکنات کو موسیقی کے خوش کن آہنگ کے سہاروں پر چلتے ہوئے لفظ کے بغیر دلوں کی دنیا جیت لیتا ہے) ساتھ ساتھ ٹیبلو۔ بیالٹ اور ڈراموں کو تجارتی اساس پر فروغ دیا جائے۔ پچھلی چند دہائیوں سے اسٹیج ڈراموں کے پہلو میں ایک خوش گوار نئے آہنگ کا اضافہ ہوا جو برٹل بریخت کے ''نکڑ ناٹک'' بن کر ابھرا ہے۔ اس کو بھی تجرباتی سطح پر یہ روایتی ڈرامے سے جڑا رہے۔ اِن موضوعات پر بھی کتابوں کی ضرورت ہے۔

کبھی ذہن یہ سوال کرتا ہے کہ اُردو کے نگارخانے کا منظرنامہ جانے کتنے خرافاتی، اساطیری وطلسماتی اور پامال صنم خانے کی وحشت پیش کرتا ہے جہاں زندگی سے جڑے علم کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا۔ حضرات اب زبان کو زندگی کے سبھی رنگوں سے جوڑنا ہوگا۔ ہمارے ادبی رتجگے اپنی تمام تر آرزوؤں کے باوجود ہنگامی موضوعات سے ایک منزل آگے نہ جا سکے۔ اب یہ تہذیبی سرگرمیاں تعذیبی شاخسانوں پر تمام ہونے لگیں ہیں۔

مجھے یقین ہے اب بھی اُردو میں لاکھوں کی تعداد میں کتابیں فروخت ہوسکتی ہیں اگر باخبر قلم کار شخصیت سازی کے موضوعات پر خوش آہنگ تناسب کے ساتھ کتابیں لکھیں۔ Behavrorial Sciences کا یہ موضوع ہماری شخصیت کے بانکپن کی بازیافت کرے گا۔ گھرانوں کے بکھراؤ کو سمیٹے گا۔ بڑھتی ہوئی طلاق وخلع۔ اور ٹوٹتی ہوئی مشرقی قدروں کو تحفظ دے گا۔ علوم وفنون کی عملی تربیت کی پیش قدمی کے بعد کتاب خوانی کا مرحلہ آتا ہے۔ چھوٹی اور بڑے صنعتی رازوں پر منحصر کتاب اپنے قاری کو سنجیدگی سے وسائل کو سمیٹنے کی دھن میں غرق کر دیتی ہے۔ ایسے میں ان ہی کتابوں میں تجارتی اداروں اور بینکوں کے تعاون کی نشاندہی کر دی جائے تو بات مکمل ہوجاتی ہے۔ ورنہ ہماری صفوں میں ایسے پریشان حال دیوانوں کی کمی نہیں جو کریڈٹ کارڈ تو رکھتے ہیں لیکن اس کے استعمال اور اس کے جرمانوں کو زندگی بھر سمجھ نہیں سکتے۔ ان موضوعات پر ورکشاپس کی ضرورت ہے۔ تاکہ عملی طور پر ان کا تجارتی شعور جاگ اٹھے۔

اب جب کہ دلوں کی راجدھانی میں اجنبی زبانوں کے لفظ راج کرتے ہیں ایسے میں تراجم کو بقول یوسفی کے ''سیکل ریپرینگ'' کا منظوم ترجمہ نہیں ہونا چاہیے۔ دوسری انتہا کا منظرنامہ یہ ہے کہ اجنبی زبانوں میں ڈوب مرنے کا انجام دیکھیے کہ بقول شاعر

جاتی نہیں دماغ سے لکنت خیال کی
جب لوگ سوچتے ہیں پرائی زبان میں

کتابوں کی اشاعت میں املے کی بوالعجبیوں کا خاص خیال رکھا جائے اور اُردو الفاظ کو اس کے سرچشموں سے جوڑنے والی تحریکِ اصلاحات املا کا استقبال کرتے ہوئے اُردو کو ان غلو کیش لکھاریوں کی ہٹ دھرمیوں سے نجات دلائی جائے۔ بقول ضمیر جعفری کے ؎

ہائے یہ حسرتِ دیدار میری ہائے کو بھی
ہائے دو چشمی سے لکھتے ہیں کتابت والے

اُردو کو نئی نسل سے جوڑنے کے لیے اُردو اکیڈمیوں اداروں کو ہنگامی سرگرمیوں کے علاوہ سنجیدہ منصوبہ بند نتیجہ خیز امور کو اپنے اھداف میں شامل کرنا ہوگا۔ ورنہ یہ زبان اداروں کی فشاری سرگرمیوں کی وحشت خیزیوں میں تڑپتی رہے گی اور ان دانشوروں کے کہکشانوں کے ہالہءنور میں رہنے کے باوجود نئی نسل کا سورج ڈوب جائے گا۔ اور آخرش اُردو کے سبک دوش وظیفہ خوار پروفیسروں کی دانشورانہ ہاوہو سے بات آگے نہیں بڑھے گی جو اپنی پایانِ کار عمر میں شعری شغف سے خود کو دوچار کرتے ہیں اور جسے اُردو کی خدمت گردانتے ہیں۔

ہمیں اُردو زبان کو علم وفن کے تجارتی منفعت کے اصولوں کو ہر ممکن تخلیقی ہنروری سے برتنا ہوگا۔ ہماری تخلیقی فعالیت ہمارے یقین کی اساس ہوگی۔ اقبال کا ایک فارسی شعر جس میں اقبال کی زلزلہ انگیز فکر جو قوم کے ٹھٹھرے ہوئے ذہنوں پر یوں قہر برساتی ہے۔ جس کا مطلب جو فرد و قوم تخلیقی صلاحیت سے محروم ہے وہ میرے نزدیک یقین سے محروم زندیق ہے۔

ہر کہ اور ا قوتِ تخلیق نیست
نزدِ ماجز ِ کافر و زندیق نیست

☆☆☆

شرکائے کانفرنس کا ایک منظر

پروفیسر اے۔ ایم۔ پٹھان کے ہمراہ ڈاکٹر اوصاف سعید اور ڈاکٹر سہیل اعجاز خان اپنی بیگمات کے ساتھ کانفرنس کے ایک اجلاس میں دیکھے جاسکتے ہیں

ریاض کے ہندوستانی اسکولوں میں اردو کی تعلیم

عذرا نقوی (ریاض سعودی عرب)

سعودی عرب میں تقریباً ڈیڑھ ملین ہندوستانی موجود ہیں۔ان میں سے بیشتر وہ ہیں جو تنہا محنت مزدوری کے لیے آتے ہیں۔لیکن ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اپنے خاندان کے ساتھ یہاں برسوں سے رہ رہے ہیں۔ان کے بچوں کی تعلیم کے لیے برسہا برس سے مملکت کے مختلف شہروں میں سفارت خانہ ہند کے زیرِ سرپرستی، اور حکومت سعودی عرب کی اجازت سے ہندستانی اسکول قائم ہیں جہاں ہندوستان کے سنٹرل بورڈ آف سکینڈری ایجوکیشن کے نصاب کے تحت تعلیم دی جاتی ہے۔انڈین انٹرنیشنل اسکول ریاض میں اس وقت تقریباً دس ہزار لڑکے اور لڑکیاں پڑھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ پچھلے دس برس میں کئی پرائیوٹ اسکول بھی کھل گئے ہیں جہاں سی بی ایس ای کے نصاب کے تحت تعلیم دی جاتی ہے۔انٹرنیشنل انڈین پبلک اسکول جو پہلے سیوا کہلاتا تھا اس میں پندرہ سو بچے پڑھتے ہیں۔دلی پبلک اسکول میں تیرہ سو پچاس۔اور مڈل ایسٹ اسکول میں دو ہزار اور یارا انٹرنیشنل اسکول میں دو ہزار تین سو بچے ہیں۔الجاسمین اسکول میں بھی تقریباً اتنے ہی طلباء ہیں۔یہ سب انگلش میڈیم اسکول ہیں اور ان تمام اسکولوں میں اردو تعلیم کا انتظام ہے۔تیسری کلاس سے آٹھویں جماعت تک اردو تیسری زبان کے طور پر اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔اس کے

علاوہ ملیالم، تلگو، عربی، فرنچ اور تامل زبانیں بھی اختیاری مضامین ہیں۔ نویں اور دسویں جماعت میں دوسری زبان کے طور پر بھی اردو لی جاسکتی ہے۔ مگر نفسیاتی طور پر نویں دسویں کلاس میں بچے اردو کو تیسری زبان سمجھ کر ہی پڑھتے ہیں۔

ان اسکولوں کے اردو اساتذہ اور طالب علموں اور والدین سے انٹرویو کے بعد جو صورت حال ابھر کر آئی وہ کچھ اس طرح ہے

جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے وہ تیسری زبان کے طور پر زیادہ تر اردو ہی منتخب کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ عربی یا فرنچ بھی منتخب کرتے ہیں۔ انڈین انٹرنیشنل اسکول میں اس سال دسویں کلاس کے بورڈ کے امتحان میں پانچ سو اٹھانوے طالب علم بیٹھے تھے ان میں سے 199 طالب علموں نے اردو کو دوسری زبان کے طور پر لیا تھا۔ 66 طالب علموں کے اردو میں اسی فیصد سے زیادہ نمبر آئے۔ ہمارے موجودہ تعلیمی نظام میں بچوں پر زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کا دباؤ بہت زیادہ ہے اس لیے وہ ایسے مضامین لینا چاہتے ہیں جن میں زیادہ نمبر حاصل کرسکیں۔ بچوں کی یہ شکایت سننے کو ملی کہ اردو میں اتنے نمبر نہیں ملتے جیسے ملیالم پڑھنے والے بچوں کو ملتے ہیں۔ ایک بچی شاکی تھی کہ بورڈ کے امتحان میں اس کے اردو میں صرف 80 فیصد نمبر آئے ہیں۔ اردو کے مقابلے ملیالم، فرنچ اور عربی زبان کا سلیبس آسان ہے اس لیے ان زبانوں کے امتحان میں بچے بہت اچھے نمبر لے آتے ہیں۔ ملیالم میں تو 99 فیصد نمبر بھی ملتے ہیں۔

والدین اردو کی تعلیم میں خاصی دلچسپی لیتے ہیں۔ ایک صاحب جن کی بیٹی نے اردو کے بجائے تیسری زبان کے طور پر عربی لی تھی لیکن ان کے دو چھوٹے بچے اب اردو

پڑھ رہے ہیں کیوں کہ انھیں احساس ہوا کہ اردو نہ پڑھنے کی وجہ سے ان کی بڑی بیٹی نہ صرف یہ کہ اچھی طرح کی اردو نہیں لکھ پڑھ سکتی بلکہ اردو کے ادبی سرمائے سے بے بہرہ رہ گئی ہے جو اس کی شخصیت کے نشوونما کے لیے ضروری ہے۔ زیادہ تر والدین اس سے متفق ہیں کہ عربی گھر پر مولانا صاحب پڑھا سکتے ہیں تاکہ بچے قرآن شریف پڑھ سکیں۔

اس اسکول کے اساتذہ اردو تعلیم کو مزید دلچسپ بنانے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ این سی آر ٹی کی اردو نصابی کتابوں میں بچوں کے لیے دلچسپی کے موضوعات ہیں لیکن ان کتابوں کی فراہمی کی بہت خراب صورتِ حال ہے۔ بعض کلاسوں کی کتاب اس سیریز میں دستیاب ہی نہیں ہوتی۔ اور اس سال تو اسکول میں بچوں کے پاس اردو کی نصابی کتابیں سرے سے ہیں ہی نہیں۔ کیوں کہ این سی آر ٹی کے پاس کتابوں کا اسٹاک ہی نہیں ہے۔ اسکول کے پرنسپل نے بتایا کہ یہ مسئلہ بہت پریشان کن ہے۔ این سی آر ٹی کیوں کہ ایک بار کافی تعداد میں کتابیں چھپوالیتی ہے۔ اور جب تک سب کتابیں ختم نہ ہوجائیں وہ مزید کتابیں نہیں چھپواتے۔ یہ مسئلہ یارا انٹرنیشنل اسکول میں درپیش ہے۔ مڈل ایسٹ اسکول نے اس پریشانی کے لیے دوسرے پبلشر کی کتابیں لے لیں لیکن وہ این سی آر ٹی کی کتابوں کی طرح دلچسپ اور معیاری نہیں ہیں۔

مڈل ایسٹ اسکول میں اس سال دسویں کلاس کے بورڈ کے امتحان میں کل 53 طالب علم بیٹھے تھے جن میں سے صرف تیرہ بچوں نے اردو دوسری زبان کے طور پر پڑھی تھی۔ ان میں سے بارہ بچوں کے اے گریڈ میں نمبر آئے ہیں۔ جس میں سے ایک بچی نے اردو میں 95.6 فیصد نمبر حاصل کیے ہیں۔

یارا انٹرنیشنل اسکول میں بھی سارے بچے جن کی مادری زبان اردو ہے اردو پڑھتے ہیں، ہر کلاس کے ایک سکشن میں صرف وہ طالب علم رکھے جاتے ہیں جو اردو تیسری زبان کے طور پر لیتے ہیں۔

دہلی پبلک اسکول چار سال پہلے ریاض میں شروع ہوا تھا اس کی نویں کلاس میں کل چونتیس طالب علم ہیں جن میں سے صرف سات اردو پڑھنے والے ہیں۔

نصابی کتابوں کے علاوہ اسکولوں میں بچوں کے لیے لائبریری میں اردو کی کتابوں اور رسالوں کی صورت حال بہت ابتر ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ کتابیں ہے ہی نہیں۔ حالانکہ اساتذہ سے گفتگو کے دوران اندازہ ہوا کہ وہ اردو کی تعلیم کو زیادہ دلچسپ بنانا چاہتے ہیں، بچوں کو اردو سیکھنے کی ترغیب دیتے ہیں اپنی مادری زبان باقاعدہ پڑھنے اور سیکھنے کی اہمیت والدین اور بچوں کو سمجھاتے ہیں۔ اس اسکول کی ایک استانی نے نویں دسویں کلاس کے لیے ایک گائڈ بھی لکھی ہے جو زیر طباعت ہے۔ انھوں نے اسکول انتظامیہ کے سامنے ایک اردو فیسٹول منانے کے بھی تجویز رکھی ہے۔

انڈین پبلک اسکول سیوا میں اردو کی تعلیم سے میرا قریبی تعلق ہے کیوں کہ میں اس اسکول کے بانیوں میں شامل تھی اور اردو کی تعلیم کے لیے کافی کاوشیں کی تھیں جواب بھی جاری ہیں۔ اب یہاں اردو پڑھانے کے لیے ہندوستان سے ایک استانی کو بلایا گیا ہے۔ اس سال دسویں کے امتحان میں اس اسکول کی ایک بچی کے اردو میں چھیانوے فیصد نمبر آئے ہیں۔ جب آٹھ سال پہلے یہاں اردو تیسری زبان کے طور پر شروع ہوئی تھی اس وقت کسی باقاعدہ استانی کا تقرر ممکن نہیں تھا میں اس وقت اسکول کی پرنسپل تھی

میں نے خود ہی اردو پڑھانے کی ذمہ داری لے لی تھی۔ میرے سامنے اُس وقت باتصویر رنگین دلچسپ کتابوں کی فراہمی سب سے بڑا مسئلہ تھی جو بچوں میں اردو سیکھنے کا شوق پیدا کرسکیں۔ ابتداء میں حروف تہجی سکھانے کے ساتھ ساتھ بچوں کو باتصویر کہانی کی کتابوں میں سے کہانیاں، پہلیاں، اور چھوٹی چھوٹی نظمیں سناتی تھی تاکہ بچوں کی دلچسپی کلاس میں برقرار رہے اور اردو کی مشکل لکھائی سیکھنے کے دباؤ میں اردو سے بدظن نہ ہوجائیں۔ ہندوستان اور پاکستان سے میں نے دوستوں کے توسط سے کتابیں منگوائی تھیں۔ جس کے نتیجہ میں بچوں میں اردو سیکھنے کا بہت شوق پیدا ہوگیا تھا۔ تب میں نے یہ تجربہ بھی کیا تھا کہ اردو لکھائی سکھانے کے لیے بچوں کو شروع میں سارے حروف تہجی نہ سکھائے جائیں۔ اس قسم کی ایک کتاب مجھے کسی نے پاکستان سے لاکر دی تھی۔ اردو کی اس پہلی کتاب میں ز، ذ، ص، ض، ط، ظ حروف شروع میں نہیں سکھائے گئے تھے۔ باقی حروف کی مدد سے دوحرفی اور سہ حرفی آسان الفاظ بچوں کو لکھنا اور پڑھنا سکھائے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ کلاس میں لیپ ٹاپ پر ان پیج پروگرام میں بچوں کو حروف جوڑ کر الفاظ بنا کر بھی دکھائے۔

اردو کے حوالے سے اسکولوں میں ہم نصابی سرگرمیوں کے لیے ریاض میں ہندوستانی بزمِ اردو پچھلے دس پندرہ برس سے بہت اہم رول ادا کررہی ہے۔ انڈین انٹرنیشنل اسکول اور مڈل اسکول میں باقاعدگی سے اردو میں مباحثہ، مضمون نویسی اور نظم خوانی کے مقابلے منعقد کراتی ہے اور جیتنے والے طلباء کو انعامات دیتی ہے۔ انڈین اسکول کے گرلز سکشن میں مباحثہ کے لیے قلی قطب شاہ ٹرافی اور بوائز سکشن میں مولانا ابوالکلام آزاد ٹرافی دی

جاتی ہے۔ مڈل ایسٹ اسکول میں میر تقی میرؔ ٹرافی دی جاتی ہے۔ ان مقابلوں میں بچے بہت ذوق وشوق سے حصہ لیتے ہیں اور اسکول کے اساتذہ اور والدین بھی پورے طور پر اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔

کمپیوٹر کے ذریعہ اردو پڑھانے سے متعلق جو کچھ مسائل ہیں ان کا ذکر یہاں ضروری سمجھتی ہوں ۔کل پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ذہنوں کی تربیت کے لیے Simulations کی بات کی اور دس اور ایک گیارہ لاکھ روپے ضائع ہونے کا ذکر کیا۔ٹرانسلیشن اور ٹرانسلٹریشن کی بات آئی۔

سوال یہ ہے کہ اس کی وجوہات کیا ہیں؟ کیا لوگ دیانت دار نہیں ہیں یا نا اہل ہیں ۔ دوسری بات قرین از قیاس ہے۔ دراصل اس قسم کا کام کرنے کے لیے مناسب افرادی قوت موجود نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ MCA and BCA کا سلیبس ہے۔اس کام کو کرنے کے لیے Natural language understanding, and computer simulation کا بنیادی علم ضروری ہے۔ اور یہ مضامین ان کورسز میں نہیں ہیں ۔لہذا میری تجویز یہ ہے کہ مطلوبہ افرادی قوت کو تیار کرنے کا نظام بنایا جائے۔ جناب چندر بھان خیال ،کونسل برائے فروغ اردو زبان ،وی سی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ،پروفیسر پٹھان اور جناب اوصاف سعید سے اپیل کرتی ہوں کہ ایک ایسا ریسرچ اور ٹریننگ سنٹر قائم کیا جائے جہاں اس طرح کی افراد سازی ہو سکے۔تب کوئی با معنی اور با مقصد کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ایسے ہی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے ہم نے ایک این جی او جس کا نام

Society of Muslim computer scientist and professionals قائم کیا ہے۔ پچھلے پندرہ سالوں سے ہماری سوسائٹی جن موضوعات پر ریسرچ کر رہی ہے اس کی کچھ مثالیں دیتی ہوں۔

Computer mediated Urdu translation

Urdu speech recognition

Urdu speech generation

Urdu text understanding and recognition

Online urdu handwriting recognition

Urdu digital document processing

Urdu programming language design

ہماری سوسائٹی نے ان موضوعات پر مسلسل پراجکٹ داخل کیے ہیں مگر ہمیں ہمت افزا جواب نہیں ملا۔ہم اپنی خدمات آپ کو پیش کرتے ہیں۔

☆☆☆

میڈل ایسٹ کے اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کے امکانات

ڈاکٹر قمر سلطانہ

انٹرنیشنل انڈین اسکول۔جدہ سعودی عرب

زبان اظہار کا وسیلہ اور رابطہ کا ذریعہ ہے۔ جب انسان اپنی بات دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے تو وہ کسی نہ کسی زبان کا ہی سہارا لیتا ہے۔

زبان قوم کا نشان ہے۔ اس کے ذریعہ سے بچہ اپنے جذبات، خیالات اور کیفیات کو ادا کرتا ہے۔ جس طرح سوسائٹی کے دوسرے افراد بچہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اُسی طرح زبان بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ بچہ سب سے پہلے زبان سیکھتا ہے۔ جس سے وہ اپنی ضرورتوں کو دوسروں سے بیان کر سکے اور انھیں پورا کر سکے۔

زبان فکر اور اس کے اظہار کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ یہ ترسیل فکر کا واسطہ ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ زبان کے بغیر منظّم فکر ممکن ہی نہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے اس بات کا تجربہ اور کوشش کی جائے کہ ذہن میں الفاظ کو لائے بغیر مظاہر قدرت کی ماہئیت اور اُن کا آپسی تعامل سمجھ میں آئے تو معلوم ہوگا کہ ایسا ممکن نہیں۔ جب تک کسی شئے کا تصور لفظ کا قالب نہ اختیار کر لے اس وقت تک اس پر منظّم طور سے غور کرنا ممکن نہیں۔ کیوں کہ ہر شئے دوسری اشیاء سے کسی نہ کسی رشتے میں منسلک ہے اور ان رشتوں کو جوڑنا یا الگ کرنا الفاظ کے بغیر کسی ذہن کے لیے ممکن نہیں۔ مادری زبان سے زیادہ

کوئی اور زبان ترسیلِ فکر کا بہترین ذریعہ نہیں ہوسکتی۔

زبان اپنے بولنے والوں کے بل پر زندہ رہتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ مادری زبان ہی ایسی زبان ہے جو بچے پر اچھی طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ بچہ اپنے جذبات کو غیر ملکی یا غیر معروف زبان میں ادا نہیں کر سکتا۔ اس کا دماغ دو مختلف حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ یعنی وہ اپنی مادری زبان میں سوچتا ہے اور پھر اس کو غیر ملکی زبان میں ادا کرتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بچہ کئی زبانیں نہیں سیکھ سکتا بلکہ وہ مہارت اُسی زبان میں حاصل کر سکتا ہے جو بچپن سے اُس کی ساتھی رہی ہے۔

اگر بغرضِ محال اس امکان کو تھوڑی دیر کے لیے فرض بھی کر لیا جائے تو کم از کم اس فکر کے اظہار یا ترسیل کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ چناں چہ ہم جانتے ہیں کہ اکثر جانور اشیاء کی ماہئیت اور اس کی افادیت یا ضرر رسانی کے بارے میں واقفیت رکھتے ہیں۔ اس پر غور بھی کرتے ہیں لیکن انسان کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس کو زبان اور قوتِ گویائی حاصل ہے۔ اس کی مدد سے وہ اپنے مشاہدات و تجربات کو محفوظ کر سکتا ہے اور اسے دوسروں تک پہنچا سکتا ہے۔

مشاہدات، تجربات اور زبان میں مثبت ربط باہم پایا جاتا ہے۔ اور سماج کے مشاہدہ اور تجربہ کے مجموعہ کو اس سماج کا عملی سرمایہ کہتے ہیں اور جس قدر یہ علمی سرمایہ وسیع ہوگا اُسی نسبت سے اس سماج کی زبان بھی ترقی یافتہ ہوگی۔ کسی معاشرے کے علمی دولت یا اس کی کم مائیگی کا اندازہ اُس معاشرے کی زبان سے لگایا جاسکتا ہے۔

اگر چہ کہ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی سماج اپنی علمی کاوشوں کے لیے وقتی طور سے مدتِ دراز تک بھی کسی دوسرے سماج کی زبان کو اپنے علم کا ذریعہ بنالے لیکن ایسا طریق غیر فطری ہوتا ہے اور بڑی حد تک کسی غیر زبان کی اثر پذیری سماج کے پورے طبقات تک نہیں پھیل سکتی۔ لیکن یہ ایک بالکل جُدا گانہ مسئلہ ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ زبان کے بغیر خیالات کی تشکیل اور ان کی ترسیل ناممکن العمل ہے۔

آج دنیا بھر میں تقریباً ڈھائی ہزار زبانیں اور بولیاں پائی جاتی ہیں۔ بعض زبانیں عالمی سطح پر زیادہ مقبول اور رائج ہوتی جارہی ہیں مثلاً انگریزی اور فرانسیسی۔

زبان کسی گروہ کا اِجارہ نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ ایک خاص ثقافت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ تعلیم فکر اور مشاہدات کو منظّم اور باضابطہ طریقے سے پیش کرنے کا نام ہے۔ ہر تعلیمی نظام بہ یک وقت نتائج بھی پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ ایک مسلسل تجربہ بھی ہے۔

ہر ایک کو اپنی زبان سے پیار ہوتا ہے اور اس کا بہی خواہ ہوتا ہے۔ یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ اردو نہ صرف ہندوستان کی ہے بلکہ جنوبی ایشیا کی ایسی زبان ہے جس میں دوسری زبانوں کو ضم کر لینے کی صلاحیت ہے۔ بے شک زبان ترسیل فکر کا ذریعہ ہے۔ اور مادری زبان کا سب سے فطری مظہر جس کا قریبی تعلق جذبات، تصورات، قلب و دماغ بلکہ روح سے ہوتا ہے۔ اس لیے مادری زبان سے عصبیت تقریباً ہر ثقافت میں نظر آتی ہے۔ بعد میں سیکھی ہوئی کوئی زبان اس کا نعم البدل نہیں بن سکتی۔

اپنی مادری زبان اور اس کے ادب سے طلباء کو طبعاً وہ والہانہ لگاؤ ہوتا ہے جو کسی زبان سے ہرگز نہیں ہوسکتا۔

جیسا کہ ہمارا آج کی بحث کا موضوع ہے ''اُردو کے موثر ذریعہ تعلیم ہونے کے امکانات اور میڈل ایسٹ کے اسکولوں میں اردو کی تعلیم'' انٹرنیٹ سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق اردو بولنے والے سعودی عرب میں، کویت، یو کے، نیپال، ساوتھ آفریقہ، موریشیس، عمان، بحرین، قطر، کنیڈا، اسپین، سویڈن، تھائی لینڈ۔ یو۔ اے۔ ای۔ میں بے شمار تعداد میں موجود ہیں۔ اور ان تمام ممالک میں جہاں جہاں انڈین اسکول ہیں وہاں وہاں اردو کو بہ حیثیت ایک مضمون ضرور پڑھایا جاتا ہے جیسے بحرین میں (۳) اسکول، کویت میں (۹) اسکول عمان میں (۱۵) اسکول، دوحہ قطر میں (۸) اور سعودی عرب میں (۵) اسکول ہیں۔ اس کے علاوہ کئی ایک خانگی مدارس ہیں جن میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ عرب امارات میں (۳۱) اسکول اور دبئی میں (۲۳) انڈین اسکول ہیں۔

ہمارے اپنے مدرسے میں تیسری سے آٹھویں جماعت تک اردو یا عربی ایک لازمی زبان کی حیثیت سے ہندی کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے۔ لیکن جماعت نویں سے وہ اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھتے ہیں۔ یا تو ہندی یا پھر اردو۔ دو میں سے ایک زبان طلباء کو لینی ہوتی ہے۔ اس وقت لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد جماعت نویں اور دسویں میں تقریباً (۵۰۰) ہے گیارھویں اور بارھویں جماعت میں تقریباً (۱۰۰) طلباء ہیں اور سرکاری امتحان میں طلباء کو (۱۰۰) میں سے (۹۷) ستیانوے تک نمبر الحمدللہ مل جاتے ہیں۔

مادری زبان ہی کو ذریعہ تعلیم قرار دینا چاہیے۔ لیکن ہر مادری زبان کے فارغ التحصیل نوجوانوں کے لیے زندگی کے تمام شعبوں مثلاً سرکاری ملازمتوں، صنعتوں اور

کاروبار میں مساوی حقوق اور مراعات کی ضمانت بھی لازمی ہے۔ بصورت دیگر مادری زبان میں تعلیم دلانا نوجوانوں کو زندگی کے میدان میں بیکار اور مفلوج کر دینے کے مترادف ہوگا۔

ہمیں پوری کوشش کرنی چاہیے کہ زبان اردو کے اسکولوں میں تعلیم باضابطہ دیں۔ کیونکہ شعور کے علاوہ تحت الشعور اور لاشعور پر بھی مادری زبان کا سب سے گہرا اثر ہوتا ہے۔ چناں چہ تقریباً ہر شخص اپنی مادری زبان ہی میں خواب دیکھتا ہے اور بیشتر مادری زبان ہی میں سوچتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ضرورتاً اور مصلحتاً اظہار کے لیے وہ کسی اور زبان کو ذریعہ بنائے۔

جس طرح شخصیت کی کردار سازی میں ابتدائی عادات واطوار کو اساسی اہمیت ہوتی ہے۔ اُسی طرح ترسیلِ فکر میں مادری زبان سے بڑھ کر کوئی اور ذریعہ موثر نہیں ہوسکتا۔

دنیا کے تمام ممالک پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ سوائے ان ممالک کے جو بیرونی اقتدار کے تحت نوآبادیات کی حیثیت رکھتے تھے۔ دیگر تمام ممالک میں مادری زبان کو ہی ذریعہ تعلیم رکھا گیا۔ کیوں کہ یہ بات فطرت کے عین مطابق ہے۔ چناں چہ یورپ کے چھوٹے ممالک میں بھی مادری زبان ہی ذریعہ تعلیم ہے۔

تعلیم کو موثر بنانے کے لیے اس کو گہرائی اور گیرائی عطا کرنے کے لیے بجائے اس سے گریز کرنے کے اس کی ترویج اور ترقی پر تمام وسائل اور توجہ کو مرکوز کرنا ترسیلِ فکر اور اکتساب علم کے لیے سب سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز پالیسی ہے۔

مولانا آزاد یونیورسٹی کی اردو سے دلچسپی کے باعث آج جدہ میں مختلف کورسیس کے امتحانات منعقد ہورہے ہیں۔ میری مودبانہ درخواست ہے کہ وائس چانسلر صاحب بی۔اے اور ایم۔اے کے ساتھ ساتھ بی۔ایڈ اور ایم۔ایڈ کورسیس کا انتظام کریں۔

اس کے علاوہ یونیورسٹی کی طرف سے میرٹ طلباء وطالبات کو ہر سال انعامات کا اعلان کریں تو زبان کو بڑھانے میں مدد مل سکتی ہے۔

میری درخواست ہے کہ امتحان منعقد کرنے کے ساتھ ساتھ اُسی متعلقہ کورس کی تیاری کے لیے کچھ سنٹرس قائم کردیں۔ تاکہ طالب علموں کو مزید استفادہ کا موقع مل سکے۔

☆☆☆

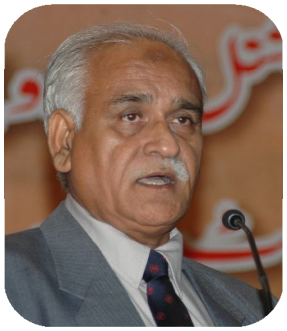

ڈاکٹر وسیم احمد صدیقی

جناب سراج وہاب

جناب علیم خاں فلکی

ڈاکٹر قاضی ضیاء اللہ

ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد

اردو زبان کی عصری صورت حال

ڈاکٹر وسیم احمد صدیقی (جدہ سعودی عرب)

اردو زبان کو مشترکہ تہذیب اور قوم کی علامت اور ترجمان کہنا میرے خیال سے درست ہے۔لیکن جہاں تک اردو زبان کی ابتداء کا سوال ہے ماہر لسانیات، دانشوروں اور عالموں کی آرا اور نظریات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ پھر بھی ان کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ اردو زبان کی داغ بیل یقینی طور پر دلّی اور اس کے نواح میں ہی ڈالی گئی تھی۔ اس زبان اردو کا نہ تو کوئی دھرم ہے نہ مذہب اور نہ ہی اس کی کوئی جغرافیائی حدیں ہی مقرر کی جاسکتی ہیں یہ اس طرح کی قید و بند سے آزاد ہے۔مختلف قوموں کی اختلاط اور بولیوں کے باہمی میل جول سے اس کا کالبُد تیار ہوا ہے اور شاید خلوص و محبت کے جذبات نے اس اردو زبان کی ابدیت کی روح پھونکی تھی۔اسی لیے یہ زبان اپنے چاہنے والوں کے دلوں کو مسخر کر کے، رگ و ریشے میں سرایت کر کے خون کی طرح گردش کرنے کے ہنر سے بھی واقف ہے۔اور دوسری زبان کے مقابلے میں اس زبان کا طرۂ امتیاز ہے۔آج ۶/جون بروز جمعہ اس ارض مقدس، عروس البلاد (جدّہ) میں اردو عالمی کانفرنس کا انتہائی کرّ و فر اور پروقار طریقہ سے انعقاد اور اسی آڈیٹوریم (Auditorium) میں اتنی کثیر تعداد میں شرکت کے لیے تشریف آوری اردو زبان کے ہر دلعزیز ہونے کا بیّن ثبوت ہی نہیں بلکہ اس کے درخشاں اور تابناک مستقبل کا نقیب بھی ہے۔

میرے خیال سے اردو ہندوستان کی سب سے زیادہ مقبول عام زبان ہے۔ اس کو ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سب کا پیار اور دلار ملا اور اسی زبان کی شیرینی، نرمی، حلاوت، شگفتگی، جادو بیانی کا ایک زمانہ قائل اور معترف ہے۔ اس لیے یہ بات بھی بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ اپنی ان خوبیوں کے اعتبار سے عدیم المثال ہے اور اپنا جواب خود یہ آپ ہی ہے۔ اس زبان کو کسی خاص قوم، مذہب یا طبقہ سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ یہ سب کی ہے اور اسی ملک ہندوستان میں پلی بڑھی اور پروان کی منزلیں طئے کیں۔ پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا جب اس زبان پر بڑے مشکل دن آئے۔ حضرات! ہندوستان کی تقسیم کو ثقافتی نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک قومی سانحہ ہے۔ جس کے نتیجے میں لوگ تو متاثر ہوئے ہی ان کے ساتھ اس زبان کے وجود کو بھی شدید جھٹکا لگا۔ یوں تو نشیب و فراز، زوال قوموں کا ازل سے مقدّر رہا ہے اور ان حالات میں مراعات، تحفظّات کی اپیل، رحم و کرم کے مطالبے ان قوموں کے حق میں اِکسیر نہیں سمِ قاتل ثابت ہوئے ہیں۔ اردو کے ساتھ مراعات اور اس کے فروغ کے وعدے کیے گئے یقین دہانیاں بھی کرائی جاتی رہیں۔ اس زبان کی زندگی میں ایک ایسا دور بھی آیا ہے جب اسے اپنے ہی گھر میں رہتے ہوئے اجنبیت اور جلاوطنی کے مصائب و شدائد اور بے اعتنائی کے کرب کو برداشت کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ اور ایسے جان لیوا حالات بھی آئے کہ اس زبان کا اپنا وجود ہی معرضِ خطر میں پڑ گیا تھا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ماضی بعید میں انہیں حالات سے دوچار ہو کر بہت سی زبانیں اپنا وجود ہی کھو بیٹھیں اور آج کی دنیا میں ان زبانوں کے پڑھنے، بولنے، لکھنے اور سمجھنے والے عنقا اور ناپید ہو چکے ہیں اور ان

زبانوں کے بیش بہا ادبی سرمایہ اور شاہکار کرم خوردہ ہو کر رہ گئے یا پھر آثارِ قدیمہ کے کسی کونے میں زینتِ طاق نسیاں ہو کے رہ گئے۔

لیکن اس سلسلے میں اردو زبان کا معاملہ کچھ الگ ہے اس کو اس زبان کی کرامت ہی کہیے اور اس کی سخت جانی اور زندہ دلی کا لوہا مانیے کہ اب اس زبان کو جدید علوم کے حصول کا ذریعہ بنائے جانے کے مسلسل تقاضے ہو رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی ضرورت بھی ہو۔ لیکن جو لوگ اس ضرورت کو اس زبان کی بقاء کے سوال سے خوفزدہ ہو کر محسوس کرتے ہیں میرے گمان میں وہ عین مایوسی کا شکار ہیں۔ اس سلسلے میں آج سے بہت پہلے نظام حیدرآباد نے پیشرفت کی تھی اور ایک ایسا ادارہ ''دارالترجمہ'' قائم کیے جانے کا حکم دیا تھا۔ اس اقدام کو حکومتِ وقت کی بصیرت، بلند نگاہی اور دور اندیشی کا ایک تاریخ ساز کارنامہ تسلیم کیا جانا چاہیے کیوں کہ اس ادارے میں دنیا بھر کے علوم پر نادر و نایاب، مفید اور کارآمد کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ اور ان میں موجود مشکل اصطلاحات بھی اردو میں وضع کی گئی تھیں۔ شومئی تقدیر کا کیا کریں کہ آج وہی تراجم، مخطوطات جن کی تکمیل بڑی دیدہ ریزی، جگرکاری، عرق ریزی اور کاوشوں کے بعد عمل میں آئی تھی۔ ناقدری اور زبوں حالی اور کرم خوردگی کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ تو ہے اربابِ اقتدار کی بے حسی اور بے توجہی کی صورت حال لیکن اس کے لیے ہم نام نہاد پرستاران اور محبان اردو بھی جواب دہ ہیں۔ اس رویّہ سے یہ یقین کرنے کو دل آمادہ ہوتا ہے کہ ہماری قوم انگریزی زبان اور مغربی تہذیب سے اتنی متاثر اور مرعوب ہے کہ اس کو اپنے ادبی ورثے کی حفاظت کرنے کی بھی سدھ نہیں۔ بلکہ اس کی پوری توجہ مغربی تہذیب کی

کورانہ تقلید میں ہے۔ جب کہ ہم سب یہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ چین، جاپان، کوریا، فرانس جرمنی اور دوسرے کئی ایسے ممالک ہیں جنھوں نے اپنی قومی اور مادری زبان کو ہی ذریعہ تعلیم بنا کر ترقی کی منازل کامیابی سے طئے کی ہیں اور کچھ ایسے ممالک بھی ہیں جہاں کے لوگ انگریزی زبان میں گفتگو اور تبادلۂ خیال کی بات تو دور رہی وہ اس زبان میں پوچھے گئے سوالوں کا جواب دینا بھی اپنی ہتکِ شان سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس اردو داں طبقے میں انگریزی گزیدہ حضرات کا یہ حال ہے کہ وہ ایسی کمتری کا شکار ہو چکے ہیں کہ اردو میں بات کرنے میں عار محسوس کرتے ہیں اور شائد اسی نفسیات کا شکار ہونے کے بعد وہ اپنی شناخت کو بھی دوسروں پر ظاہر کرنے سے احتیاط برت سکتے ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں اکثر آتا ہے کہ اردو زبان کا کتنا بھی بڑا عالم ہو جب بھی وہ کسی انگریزی داں سے ملتا ہے تو وہ اس قدر مرعوب ہو جاتا ہے اور پھر اس کے ایسے اوسان خطاء ہوتے ہیں کہ گِٹ پٹ کرنے والے اپنے مخاطب سے آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرنے سے گریز کرتا ہے۔ حضرات یہ ہے ہماری احساس کمتری اور انگریزی دانوں سے مرعوبیت کا عالم۔ شاید اسی احساس کمتری کے نتیجے میں ہمارے معاشرے میں یہ روش عام ہو چکی ہے کہ جب کبھی کسی اردو کے استاد یہاں تک کہ اس مضمون کے پروفیسر کا ذکر آیا لوگوں کے لبوں پر تمسخرانہ ہنسی آجاتی ہے اور بغیر صلاحیت، قابلیت، لیاقت اور علمیت کو پرکھے ہوئے ان اساتذہ پر جاہل ہونے کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔ یہ تو درست ہے کہ زبان انگریزی کو سکہء رائج الوقت کا درجہ حاصل ہے اسی طرح بہت سی دوسری مشرقی زبانوں میں بات کرنے والوں کی طرح اردو داں حضرات کا ایک بڑا حصّہ اور ان کی بڑی

تعداد محض اپنی ساکھ کو قائم رکھنے اور انگریزی کی جانکاری کا دکھاوا کرنے کے لیے اس زبان کو پستی اور بیساکھی کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور انھیں حضرات کے اس ردِّعمل کے طور پر ہمارے بچوں اور طالب علموں کے سرپرست اور والدین کی بڑی تعداد اردو میں تعلیم دلانا تو رہی دور کی بات وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ اختیاری مضمون کی حیثیت سے بھی ان کا بچہ اردو کی شُد بُد حاصل کر سکے۔ شائد ان کو یہ خوف لگا رہتا ہے کہ اردو کی تعلیم حاصل کرنے سے کہیں ان کے جگر گوشوں کا مستقبل تاریک اور ان کا کیریر ہی تباہ نہ ہو جائے۔

اردو کو روزی روٹی سے جوڑے جانے کی بات بے شک بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن آخر کب تک ہم اسی آس اور امید پر اپنے ثقافتی، تہذیبی اور علمی تشخص کا سمجھوتہ کریں گے۔ ضرورت تو اس کی ہے کہ ہم دوسرے علوم وفنون اور انگریزی زبان میں دستگاہ اور مہارت حاصل کریں اور اس طرح اپنی معاش اور یافت کا بہتر ذریعہ تلاش کریں اور اسی کے ساتھ اپنی مادری زبان کو سیکھیں اور سکھائیں بھی اپنے گھر والوں سے دوست احباب اور اپنے بچوں سے اپنی مادری زبان میں ہی گفتگو کرنے کا اہتمام کریں۔ رونا تو دراصل اسی بات کا ہے ہم اردو کو مادری زبان تسلیم کرنے کے باوجود اس کو برتنے اور بولنے، لکھنے، پڑھنے میں عار اور شرم کا احساس کرتے ہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اردو کی تعلیم حاصل کر کے اس کو روزی روٹی کا ذریعہ اور وسیلہ بنانے کا خیال درست نہیں ہے کیوں کہ محدود آسامیاں اور مواقع دستیاب ہونے کی وجہ ہر ایک کو روزگار ملنا ضروری نہیں ہے۔ اس لیے ہوسکتا ہے اور عین ممکن ہے کہ بیکاری اور بے روزگاری ہی ہاتھ

لگے۔ اس طرح ساری امیدوں پر اور ارمانوں پر اوس پڑتے دیکھ کر ہیجانی کیفیت اور مایوسی میں مبتلا ہونا ایک فطری امر ہوگا۔ اس وقت پر مجھے اپنے استاد محترم کی کہی ایک بات شدت سے یاد آرہی ہے اور یہاں میں اس کا ذکر بھی کرنا موزوں اور مناسب سمجھ رہا ہوں۔ یہ میری طالب علمی کے زمانے کی بات ہے ہوا یوں تھا کہ ملک میں خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک زور وشور سے چل رہی تھی اس ضمن میں استاد تبصرہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ حکومت کو اس سلسلے میں ترغیب، تحریص، دھر پکڑ، سختی اور دادا گیری کی کیا ضرورت آن پڑی ہے۔ چاہیے تو یہ کہ نوجوانوں کو اردو پڑھ کر بی۔اے اور ایم۔اے کرنے کی طرف حکومت ان کی دلچسپی پیدا کرے۔ اس طرح مسئلہ خود بخود حل ہوسکتا ہے۔ اس طرح کے ان سند یافتہ نوجوانوں کی کھپت کہاں ممکن ہوگی اس طرح پڑھے لکھے ان نوجوانوں کو تلاشِ معاش میں جوتیاں گھستے دیکھ کر کون پوچھے گا ایک پڑھے لکھے، خوبرو لیکن مفلوک الحال، فاقہ مست لیکن پڑھے لکھے، سند یافتہ نوجوان کو اپنی بیٹی کا ہاتھ کوئی دیوانہ ہی دے سکتا ہے۔ استاد کے ان جملوں میں جو لطیف طنزیہ اشارے تھے اس کو سمجھنے میں مجھے تھوڑی سی دیر لگی۔ اور جیسے ہی بات سمجھ میں آئی ارمانوں کا شیش محل بکھر گیا۔ لیکن اب تو بہت دیر ہوچکی تھی۔ لیکن شکر ہے کہ قسّام ازل نے میری تقدیر میں تنگی کے ساتھ ساتھ حسبِ وعدہ فراخی بھی رقم فرمادی تھی۔

اردو کے سلسلے میں ایک بات اور فضاء میں گونج رہی ہے اردو رسم الخط کو بدل دینے کی تحریک زوروں پر ہے اور اس کی تائید بھی کچھ لوگ کرنے لگے ہیں۔ تحریص اور ترغیب کے حربے بھی استعمال کیے جارہے ہیں اور اس سازش کے بہت سے اردو داں

حضرات بھی شکار ہوچکے ہیں۔ اس سلسلے میں دلیل یہ پیش کی جارہی ہے کہ اردو ہندی کی ہی ایک لپی (Script) ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت سب پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو کا رسم الخط ہمیشہ سے فارسی ہے جب کہ ہندی دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ اردو زبان نے فارسی، عربی، برج بھاشا، کھڑی بولی، اودھی، دکنی، اور دوسری زبانوں کے نرم نازک، شیریں لفظوں کو اپنے لفظوں کے ذخیرے میں اس طرح ضم کیا ہے کہ وہ اسی زبان کے ہوکر رہ گئے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس اخذ واختیار کی روش نے اردو زبان کو مقبولیت، ترقی اور روز افزوں ترقی عطاء کی ہے۔ یہی اردو زبان کی سخت جانی، جاودانی اور معجزاتی ہونے کا سبب بھی بنی اور جو اس کو ابدی اور آفاقی شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ بھی۔ جب کہ ہندی میں آج تک سنسکرت کے مشکل، ثقیل اور فراق صاحب کے بقول جبڑا چیر الفاظ موجود ہیں۔ دوسری زبانوں کے لیے ہندی نے اپنے دل کے دروازے بند کرلیے ہیں اور صرف سنسکرت کے الفاظ کو اختیار کرکے اور بھی مشکل، ناقابلِ فہم اور ادق بنانے کی مہم میں مصروف ہے۔

لیکن ان نامساعد حالات اور دل برداشتہ صورت حال سے مایوس ہوکر ہمت ہار جانا کم ہمتی ہے۔ لفظ اردو کے لغوی معنی سے ہم سب باخبر ہیں۔ ترکی زبان میں لشکر کے لیے اردو کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے اردو کو مٹانے کا خیال کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکے گا۔ اس زبان کا پودا ہندوستان کے دارالخلافہ میں نمودار ہوا، اس کی آبیاری سنتوں، صوفیوں، فقیروں، رشیوں، منیوں کے مقدس ہاتھوں نے کی تو راجوں، مہاراجوں، نوابوں، اور بادشاہوں، کے سایہء عاطفت میں برگ وبار برآمد ہوئے۔ اس کی

کتر بیونت کی ذمہ داری خسرو، قلی قطب شاہ ولی دکنی نے قبول کی۔اس کے بعد میر، غالب، سیم، انیس، داغ، اقبال، اکبر، چکبست، فراق، اور دوسرے انگنت ادیبوں، شاعروں ، ناقدین، محققین، نے اس میں ضرورت کے مطابق بھرپور تعاون کیا اور نگہداشت پوری نیک نیتی سے کی ۔آج بھی نالغبۂ روزگار زمانہ شناش لوگوں کی بڑی تعداد اپنی اس پیاری زبان کی بقاءاور حفاظت کرنے کے لیے مستعد تیار کھڑی ہے۔اب تو اردو ایک تناور درخت میں تبدیل ہوگئی ہے اور اس کی جڑیں ہندوستانی تہذیب کی زمین میں ایسی مضبوطی کے ساتھ پیوست ہوچکی ہیں کہ حسد، کینہ، عناد، اور تعصب کی بادِ صرصر وصمیم اس کے وجود کو کسی طرح کی گزند نہیں پہنچا سکتی ہیں۔اس پر مستزاد یہ کہ مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی حیدرآباد کا قیام ایک ایسے قلعہ کی مانند ہے جہاں اردو کا مستقبل مامون اور محفوظ محسوس ہوتا ہے۔یہ یونیورسٹی اردو والوں کے لیے ایک منارۂ نور کی مانند ہے۔جس کی ضیاء پاشیوں سے پوری دنیا بالخصوص اردو دنیا ضوّ رہوگی۔

☆☆☆

پروفیسر کے۔آر۔اقبال احمد کانفرنس کے ایک اجلاس میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے

شرکاء کانفرنس کا ایک منظر

اردو کی ترقی میں صحافت کا حصہ

سراج وہاب
عرب نیوز، جدہ سعودی عرب

صحافت ادب کا ایک حصہ ہے بلکہ اگر یہ کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ ایک اٹوٹ حصہ ہے اردو ادب زندگی کا آئینہ دار ہے لہذا کسی زبان کی ترقی کے لیے صحافت ادب کے برابر حصہ دار ہے۔اردو کوئی پُرانی زبان نہیں بلکہ اورنگ زیب کے زمانے سے یہ فارسی کے ساتھ ساتھ استعمال کی جانے لگی۔اس طرح اسے تین سو سال ہونے کو آئے اور اس کی صحافت اس کے بھی بعد میں وجود میں آئی۔محققین کے مطابق اردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے جاری ہوا دہلی سے ۱۸۳۶ء میں دہلی اخبار جاری ہوا اس طرح اُردو صحافت کی تاریخ بہت زیادہ طویل نہیں ہے۔اس کے مقابلے میں محققین کا کہنا ہے کہ ایک ہزار سال قبل مسیح میں سب سے پہلے چین میں اخبار کی اشاعت عمل میں آئی۔یورپ میں اخبار کی ابتداء پندرہویں صدی عیسوی سے ہوتی ہے جس میں جرمنی کا نام سر فہرست ہے۔اٹلی میں ۱۵۳۶ء میں پہلا اخبار جاری ہوا۔ برناڈ شاہ کہتے ہیں Great Literature is Journalism۔ بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ اردو کے چند بڑے ادیب اور شاعر اردو کے بڑے صحافی بھی ہیں مثلاً منشی پریم چند،فیض احمد فیض،عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت وغیرہ کرشن چندر اردو کے بڑے ادیب ہیں لیکن وہ اخباروں میں بھی کالم لکھتے تھے خواجہ حسن نظامی اور نیاز فتحپوری

نگار کے ایڈیٹر دونوں ہی اردو کے بہت بڑے ادیب تھے بلکہ صاحب طرز ادیب تھے لیکن دونوں ہی پہلے صحافی اور بعد میں ادیب ہیں زمیندار اور انقلاب پنجاب کے دو مشہور اخبار تھے ظفر علی خان اور عبدالمجید سالک اس کے مدیر تھے اور دونوں ہی اردو کے مایہ ناز ادیب اور شاعر ثابت ہوئے اس طرح دیوان سنگھ مفتون جو اخبار ریاست کے ایڈیٹر تھے وہ بھی صاحب طرز ادیب تھے ۔فیض احمد فیضؔ ،احمد ندیم قاسمؔی، چکبستؔ ،اقبالؔ، جوشؔ ،فراقؔ ،انتظار حسین بھی بیک وقت صاحب طرز ادیب اور شاعر بھی ہیں ۔غرض اردو ادب صحافت کو مالا مال کرنے میں اردو کے صحافیوں کا غیر معمولی کردار رہا ہے ۔صحافت کو مملکت کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے ۔نپولین اخبار کی اہمیت اور طاقت کے پیش نظر کہتا ہے کہ'' ایک ہزار بندوقوں کے مقابلے میں تین مقابل اخباروں سے زیادہ خوف کھانا چاہیے''۔اکبر کے زمانے میں کسی نے لکھا ہے'' چھوٹے حکمران شہنشاہ اکبر کی تلوار سے زیادہ ابوالفضل کے قلم سے خوف زدہ تھے'' اسی طرح انگریزوں کے دور میں محمد علی جوہرؔ نے کامریڈ میں جو اداریے لکھے اُن سے سلطنت برطانیہ کافی پریشان تھی ۔چناں چہ ان کا مشہور اداریہ انگریزوں کے حق میں بجلی بن کر گرا جسے انہوں نے مسلسل چوبیس گھنٹوں میں صرف کافی پیتے ہوئے مکمل کیا تھا۔اسی لیے تو اکبر الہ آبادی نے قوم کو مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

گاندھی جی نے اخبار کا ایک مقصد یہ بتایا ہے کہ عام آدمی کے احساسات وہ جذبات کو پوری طرح سمجھنا اور ان کو ظاہر کرنا ہے ۔دوسرا مقصد عام لوگوں میں ایسے جذبات و احساسات کو اُبھارنا ہے جس کی ملک وقوم کو ضرورت ہو۔اور تیسرا مقصد عام زندگی کی کمزوریوں کو اور برائیوں کو ظاہر کرنا ہے ۔ ہندوستان اور پاکستان سے شائع ہونے والے تمام نمایندہ اردو اخبارات اردو زبان وادب کی ترقی وترویج میں نمایاں رول ادا کر رہے ہیں ۔سعودی عرب سے نکلنے والے اخبار اور رسالے میں بھی اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے مثبت کوشیشیں کی جارہی ہیں ۔

اس طرح اردو زبان کا مایہ ناز ادبی رسالہ رابطہ ہے جو پاکستان سے نکلتا ہے لیکن پوری اردو دنیا میں اس کی دھوم ہے ۔اس طرح اخبارات ورسائل اردو کی ترقی میں اپنا بھرپور حصہ ادا کر رہے ہیں اسی لیے آپ سب ایک بار پھر اس شعر کو دہرانے کے لیے مجبور ہیں ۔

اُردو ہے جس کا نام سبھی جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم اُردو زبان کی ہے

☆☆☆

اردو ذریعہ تعلیم چند تجاویز

علیم خاں فلکی (جدہ سعودی عرب)

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کو بہتر اور جدید بنانے کے لیے اپنی تجاویز پیش کروں یقیناً یہاں کئی گرانقدر تجاویز آئیں گی یہاں اردو کے وہ مشاہر و مفکرین جمع ہیں جو ہندوستان میں رہ کر اردو کے لیے طوفانوں کا مقابلہ کر رہے ہیں جن کے سامنے ہماری حیثیت ساحل پر کھڑے تماش بین مبصرین کے کچھ نہیں۔ البتہ یہ میرا احساس ہے کہ جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے اردو کے لیے اٹھنے والی آوازوں کو دبا دیا جا رہا ہے ایسی کئی کانفرنسوں سمینارز اور کمیشن بشمول گجرال کمیشن اور مدن کمیشن کے تمام تجاویز کو سرد خانوں میں ڈال دیا جا رہا ہے اس لیے میں اپنے موضوع کو تھوڑا سا وسیع کرتے ہوئے یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ اردو ذریعہ تعلیم کو بہتر اور جدید بنانے کے لیے جتنی تجاویز پیش ہوں اُن کی عملی تعبیر کے امکانات کو کیسے جگایا جائے۔ یہ یاد رہے کہ اردو کی پسماندگی یا زوال کا سبب مکمل سیاسی ہے اس لیے اس کی نشاۃ ثانیہ کا ذریعہ بھی پہلے سیاسی ہی ہوسکتا ہے۔ اردو کا مسئلہ تنہا زبان کا مسئلہ نہیں ہے زبان چاہے جو بھی ہو جب تک اُسے بولنے والی قوم کے ہاتھوں میں سیاسی قوت نہ ہو اس زبان کی ترقی ناممکن ہے۔ آج جتنی زبانیں پہلی سرکاری زبان کا درجہ رکھتی ہیں ان کی بولنے والی قوموں نے ان زبانوں کو مکمل OWN کیا ہے جب کہ اردو مادری زبان رکھنے والی قوم کے افراد نے اِسے OWN کرنے

سے انکار کر دیا ورنہ ان کے بچوں کو آج اردو لکھنا اور پڑھنا آتا۔ اردو کے مقابلے میں کوئی دوسری زبان ایسی نہیں جس کے پاس اتنا عظیم تاریخی تہذیبی اور علمی ادبی ذخیرہ موجود ہو اس زبان کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہ خبر ان کی زور کہلاتی ہے لیکن اس کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کے ساتھ جوڑ دی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی سیاسی اخلاقی اور سماجی پستیوں کی سزا اردو کو بھگتنی پڑی ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ جس زبان کے بغیر نہ کوئی TV چل سکتا ہو نہ سیریل نہ کوئی تقریر ہوسکتی ہو نہ تحریک وہ زبان مصیبتوں اور فرقہ پرست سیاستدانوں کے ہاتھوں ناانصافی کا شکار ہو جائے۔

اردو کو ذریعہ تعلیم یعنی Medium of Education بنانا تو بہت بعد کا اسٹیج ہے گھر سجانے کا تصور اس کے لیے پہلا قدم یہ ہو کہ آپ کے ہمارے بچے جو کل ہماری جگہ سنبھالیں گے سیاست صحافت میڈیا بیوروکاروبار وغیرہ ان کے ہاتھوں میں ہوگا جن کی تعلیم پر ہم لاکھوں کی رقم خرچ کرتے ہیں ان اسکولوں اور کالجوں میں اردو کو کم از کم ایک مضمون کے طور پر رائج کرنے کی ایک تحریک چلائی جائے ایک طرف ان بے حس والدین کی عبرت کو جگایا جائے جو سہولت کے ہوتے ہوئے بھی اپنے بچوں کو اردو سے محروم رکھتے ہیں اور حکومت سے اردو کے ساتھ ناانصافیوں کی شکایت کر کے مگر مچھ کے آنسو بہاتے ہیں۔ دوسری طرف ایک ایسی تحریک چلائی جائے جس کے ذریعے ان تمام مدارس اور کالجس میں اردو کو بحیثیت مضمون لازم کیا جائے جہاں اردو مادری زبان رکھنے والے طلباء موجود ہیں۔ اردو ذریعہ تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ یاد رہے کہ وہ مسلم آبادی والے علاقے جہاں اردو میڈیم اسکول چلائے جا سکتے ہیں مسلم آبادی کے دس فیصد بھی نہیں باقی نوے فیصد اردو بولنے والے ان دیہاتوں اور اضلاع میں

رہتے ہیں جہاں پورے علاقے میں ان کے پندرہ بیس گھر ہی ہوتے ہیں اس لیے ان کا اردو ذریعہ تعلیم ہونا ممکن نہیں ہے اس لیے پہلے یہ کوشش ہو کہ ہندوستان بھر میں جہاں بھی اردو بولنے والی اقلیتیں ہیں وہاں اردو بحیثیت لازمی مضمون شامل ہو۔

ہندوستان ہی نہیں امریکہ کینڈا وغیرہ میں بھی کسی بھی اردو سے متعلق علمی یا ادبی اجتماع میں حاضرین کی اوسط عمر 45 یا اس سے زیادہ ہے نئی نسل دور دور تک نظر نہیں آتی۔

یہ کہنا غلط ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کا معاش سے رشتہ کاٹ دیا گیا۔ بیروزگاری کا الزام اردو ذریعہ تعلیم پر دینا ایک زیادتی ہے۔ ہر زبان کے بولنے والوں میں بیروزگاری کا تناسب برابر ہے البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کی ترقی میں حائل رکاوٹوں میں ایک بڑی رکاوٹ تحفظات یعنی Reservations ہیں جن پر پھر کبھی گفتگو ہو سکتی ہے۔

آخر میں میں اردو ذریعہ تعلیم کو بہتر بنانے کے ضمن میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کے آج مسلمانوں میں ایسی کئی تنظیمیں ہیں جو پورے خلوص کے ساتھ بے لوث خدمات انجام دے رہی ہیں خدمت خلق تعلیم مدارس اور روزگار کے سلسلے میں عوام کی اعانتوں کے ذریعہ کئی اہم کام کرنے کا شعور تو موجود ہے لیکن اِس شعور کی کمی ہے کہ ایک جمہوری ملک میں اپنے مسائل کی حکومت سے کیسے نمائندگی کی جائے۔ حکومت کی طرف سے دستیاب بے شمار سہولتوں اور Funds سے کس طرح عوام کو واقف کروایا جائے مسلمان سیاستدان اپنے ذاتی مفادات کی جنگ لڑ رہے ہیں اردو صحافت اخبار مالکان کو دانشور گردان کر اُن کے پیچھے چل رہی ہے دینی سماجی اور دیگر جماعتیں وہی حکومت دشمن سوچ رکھتی ہیں جو 1857ء کے جہاد کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی۔ اس لیے عوام اس بات کا

شعور نہیں رکھتے کہ حکومت سے اپنے مسائل کی نمائندگی کیسے کی جائے۔ میں مولانا آزاد یونیورسٹی کی مثال پیش کرنا چاہوں گا کہ کس طرح چند افراد کی کوششوں نے حکومت کو کئی کروڑ روپیے اردو یونیورسٹی کے لیے وقف کرنے پر رضامند کیا جس کے نتیجے میں چار پانچ سال کے عرصے میں ہی ہزاروں افراد اردو گریجویٹ اور پوسٹ گریجویشن کی ڈگریاں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اردو ذریعہ تعلیم کی ترقی اس بات میں مضمر ہے کہ پرائمری سکنڈری اور ہائی اسکول زیادہ سے زیادہ قائم ہوں اور غیر اردو اسکولوں کالجوں میں اردو کو بحیثیت مضمون لازمی پڑھایا جائے زیادہ سے زیادہ دارالترجموں کی ضرورت ہے اس کے لیے حکومت سے صحیح نمائندگی کرنے والی ان تنظیموں کی ضرورت ہے جو جمہوری و سیکولر دور کے صحیح اصولوں پر یقین رکھتی ہوں۔

میں جانتا ہوں کہ اردو ذریعہ تعلیم کی ترقی کے لیے میں کوئی ٹکنیکل طریقہ کار پیش نہ کرسکا البتہ جو تجاویز پیش کرسکا ہوں وہ بظاہر سطحی ہیں ان کی گہرائی میں نہ جانا وقت کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

☆☆☆

اردو شاعری میں عصری حسیت

ڈاکٹر قاضی ضیاء اللہ
ریجنل ڈائرکٹر، ریجنل سینٹر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، بنگلور

عصر کے لغوی معنی تھوڑی سی رعایت کے ساتھ زمانہ، وقت، عہد یا زمانے سے متعلق کے ہیں۔ عصر، حال سے عبارت ایک لمحہ بھی ہوسکتا ہے یا اس کا محور ایک دور بھی ہوسکتا ہے۔ عصری حسیت سے مراد وہ احساس ہوگا جس میں اپنے دور کی لمحہ لمحہ بنتی بگڑتی اور سجتی سنورتی زندگی کی مہک ہو۔ یہی احساس کا کرب اور حسنِ تخیل ہے جس کے بطن سے فنونِ لطیفہ کے شاخیں پھوٹتی ہیں۔ ادب بھی دراصل دیگر فنون کی طرح انسانی افکار و خیالات کے اظہار کا سرچشمہ ہے۔ ادب کو کبھی زندگی کی نقالی قرار دیا گیا تو کسی نے اسے زندگی کی ترجمانی سے تعبیر کیا ہے۔ ایک انگریزی مفکر Stopford A. Brooke کے مطابق

"Writing is not literature unless it gives to the reader a pleasure, which arises not only from the things said but from the way in which they are said."

الفاظِ دیگر ادب دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح حیاتِ انسانی کے متنوع حِسی و عملی تجربات کا لفظی اظہار ہے۔ ادب ماضی کی بازیافت، حال کا نقیب اور مستقبل کے

لیے مشعلِ راہ بن کر اپنے عہد کا آفریدہ و پروردہ ہوجاتا ہے۔ زندگی اور ادب کا یہ باہمی ارتباط اتنا گہرا ہوتا ہے کہ کسی مخصوص سماج یا تہذیب و تمدن کا زوال دراصل اس سے جڑے زبان و ادب کا انحطاط ہوگا۔ اگر ادب میں عصری تقاضوں اور اقدار کے ساتھ قدم ملانے کی سکت نہ ہو تو پھر یہ کچھ اور تو ہوسکتا ہے مگر ادب نہیں۔ بقول سید جلال الدین عمری۔

''جس خیال کی جڑیں انسان کی فطرت میں پیوست نہ ہوں،
کچھ دن بعد خود بخود اس پر مژمردگی چھا جاتی ہے''۔

چوں کہ ادب فعال، باشعور اور حساس فرد اور سوسائٹی کے خمیر سے بنتا ہے اس لیے اسے مخصوص فکر و جذباتی رشتوں کی پاسداری اور سماجی حدود کی پابندی کرنی پڑے گی۔ اس سیاق میں اردو زبان و ادب کے سرمایہ پر نظر ڈالیں تو محسوس ہوتا ہے کہ دیگر مشرقی علوم کی طرح اردو زبان و ادب بھی فکر و فنی ٹھاٹھ سے مالا مال ہے۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اردو زبان و ادب نے ہر دور میں اپنے تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے تازہ فکری اقدار کا کما حقہ ساتھ دیا ہے، چاہے وہ، سرسید اور ان کے رفقاء کی اصلاحی تحریک ہو، رومانی دور ہو، حقیقت پسندی سے عبارت انقلابی رجحانات یا اندرون ذات کی تلاش و جستجو پر نعرے بازی اور نظریہ سازی اردو ادب میں ان تمام عوامل کی کارفرمایاں ملتی ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ درباری زبان ہونے کے الزام سے بری ہوکر اردو ادب نے بین الاقوامی، قومی اور علاقائی ہر مسئلے کو اپنے دامن میں جگہ دی۔ 1857 کے انقلاب

کے علاوہ 1917ء کے انقلاب روس سے لے کر 1947ء تک جدوجہد آزادی سے وابستہ تمام اہم واقعات کو ادبی پیکر میں ڈھالا۔خصوصاً مارچ۔اپریل 1947ء کی ایشیائی کانفرنس نے جنوبی ایشیاء میں معاشی وسماجی سطح پر بیداری لانے کی جو مہم چلائی اردو زبان وادب نے اس کی تفہیم وتشہیر میں فعال رول ادا کرتے ہوئے بالخصوص برصغیر کے عوام میں محکوم ممالک کے معاشی استحکام کی اہمیت وافادیت کا احساس پیدا کیا۔

یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ملک کی آزادی کے موقع پر گاندھی جی نے اعلان کیا تھا کہ ہندوستان دراصل اس کے دیہاتوں میں بستا ہے اس لیے ہندوستان کی ترقی کے لیے دیہی ترقیاتی حکمت عملی ضروری ہے۔ اس کے برعکس جواہر لال نہرو نے نئے ہندوستان کو شہری آبادیوں سے تعبیر کرتے ہوئے صنعتوں اور Dams کو ''جدید ہندوستان کی عبادت گاہیں'' قرار دیا۔گاندھی جی کے خوابوں کا دیہی ہندوستان ہو یا سوشلسٹ اقدار اور صنعتی ترقی سے عبارت جواہر لال نہرو کا شہری ہندوستان، اردو ادباء وشعراء نے دونوں نظریات کو مختلف نثری وشعری اسالیب میں ڈھالا۔میری ناقص رائے میں، جواہر لال نہرو نے سوشلسٹ اصولوں کی بنیاد پر جس صنعتی نظام کی بنیاد رکھی تھی آخرِ کار 1991 کی معاشی روادارانہ پالیسی نے اسے سرمایہ دارانہ نظام کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔

ورلڈ آرڈر کے تحت برصغیر کو تیسری دنیا میں مقید کرکے، مابعد نو آبادیت(Post Colonialism)، LPGاور WTO کو جنوب ایشیائی ممالک پر مسلط کیا گیا۔جنوب ایشیائی ممالک کی معیشت پر قبضہ کرکے انہیں معاشی طور پر اپنا

دست نگر بنانے کی کوشش کی گئی۔گلوبلائزیشن اور نوآبادیاتی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے امریکی خارجہ پالیسی کے ایک ماہر Tucker نے تیسری دنیا کے ممالک کے حوالے سے کہا تھا:

> ''ہم انہیں اچھی طرح جانتے ہیں، کیوں کہ ہم نے ان پر حکومت کی ہے اور یہ ان کی اپنی حیثیت کچھ نہیں۔یہ صرف ہمارے نقال (mitators) ہیں۔اس لیے انہیں ہم جس طرح چاہیں گے چلالیں گے''۔

گلوبلائزیشن اور معاشی رواداری کا یہی نقطہ اتصال ہے جہاں سے کثیر قومی صنعتی کلچر نے تیسری دنیا کے سماجی، ثقافتی ومعاشی نظام پر اپنی گرفت مضبوط کرلی اور گلوبلائزیشن تھیوری نے دنیا کو عالمی دیہات میں بدل دیا۔ اس کے سبب جغرافیائی سرحدوں کی اہمیت گھٹ گئی ہے۔نئے نظام، نئے نظریات وتصورات نے تیسری دنیا خصوصاً برصغیر ہندو پاک میں بھلے ہی مالی واقتصادی ترقی کے لیے راہیں کھول دی ہوں لیکن اس کے پس منظر میں فسطائی قوتوں کو ابھرنے کا بھی موقع ملا۔اکثریتی۔اقلیتی تصور، ہندو مسلم تنازعات اور نسل پرستی کے گڑے مردوں کو پھر سے زندہ کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔یہ اور اس طرح کی کوششوں کے ذریعہ کبھی مشرقی ادبی اقدار پر بے مائیگی کا لیبل چسپاں کرکے اور کبھی نئی مغربی تھیوریوں کو ٹھونس کر تیسری دنیا کے ادبی وثقافتی سرمائے کو مصلوب کرنے کی ناکام کوشش کی جارہی ہے۔

تاہم یہ ایک حوصلہ افزاء بات ہے کہ اردو ادب فکری تشکیل نو کے نام پر

مغربی نظریات کی اندھی تقلید سے کسی حد تک پاک ہے۔ غالباً اسی لیے اردو ادب مغربی ادبی تھیوریوں کے لیے بہت بڑا چیلنج بن گیا ہے۔تجدیدی نظریات سے جزوی گریزیت کے باوجود اردو ادب کی بقاء قائم ودائم ہے۔اس کی ادبی سمت ورفتار کہیں بھی متاثر نظر نہیں آتی۔اردو ادب کا یہ احسن پہلو اس کے زندہ اور مستحکم ہونے کی علامت ہے۔

گلوبلائزیشن کے بطن سے جنم لینے والے اس کلچر نے ہمارے سماجی دھارے کو منتشر کر دیا ہے۔اکیسویں صدی کا فرد شہری زندگی میں کاسموپولیٹین کلچر کا عادی بن گیا ہے۔اس کی سوچ کسی ایک نکتہ پر مرکوز نہیں ہے۔شناخت اور بے شناختی کا بحران، مسابقت کی دوڑ نے فرد کو ایک Marketable Commidity بننے پر مجبور کر دیا ہے۔جس کے سبب فرد Demorlaize ہو گیا ہے۔اخلاقی، سماجی وثقافتی اقدار کی اہمیت گھٹتی جا رہی ہے۔نفسیاتی، سماجی اور انفرادی مسائل منہ کھولے کھڑے ہیں۔کردار سازی کے بجائے اسے مسابقت کے قابل بنانے کی خاطر ٹیم ورک کے حروفِ ابجد سیکھنے کے لیے Personality Development کے مراحل سے گذرنا پڑ رہا ہے۔

غالبؔ نے اپنے عہد میں انسان اور انسانیت کو تلاش کرتے ہوئے کہا تھا کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

لیکن عہد حاضر کی بحرانی کیفیت نے آدمیت کو بھی ختم کر دیا ہے بقول بشیر بدر

گھروں پہ نام تھے ناموں کے ساتھ عہدے تھے
بہت تلاش کیا کوئی آدمی نہ ملا

یہ اور اس طرح کی پیچیدہ سماجی صورتحال کا اثر دیگر زبانوں کی طرح اردو

زبان وادب پر بھی ہوا۔اس پس منظر میں اردو ادب کا اس کے شعری سرمایے کے حوالے سے جائزہ لیں تو محسوس ہوگا کہ معاصر اردو شاعری پچھلے ادوار کی طرح عہد حاضر میں بھی فرد کی اس کثیر الجہاتی زندگی کی مختلف زاویوں سے ترجمانی کر رہی ہے۔اردو ادب پر خصوصاً شعری سرمایے کی اس نامیاتی اور عصری حسی کیفیت کے باوجود پر عموماً تین اعتراضات کئے جاتے ہیں کہ

1 یہ کسی حد تک اسلامی اقدار ونظریات کا ترجمان بن گیا ہے۔

2 یہ نو بہ نو نئے فکری رجحانات کو قبول کرنے کا متحمل نہیں ہے۔

3 اردو جاننے والے تو سماجی ومعاشی طور پر ترقی کر رہے ہیں۔لیکن اردو زبان وادب اپنے روایتی محور میں گردش کر رہے ہیں۔

ممکن ہے کہ مغربی نظریات سے جزوی انحراف کے سبب اردو ادب پر یہ اعتراضات کئے جا رہے ہوں۔چوں کہ اردو ادبی سرمایہ ہمیشہ کریم النفسی اور تہذیبی شائستگی کا علمبردار رہا ہے۔اس لیے اردو ادب اندھی تقلید کی بجائے صالح اقدار کو قبول کرتا ہے۔خاص کر اردو شاعری نے فکری فنی اور اسلوبیاتی توسیع وتشکیل نو کی ایسی خوبیوں کو ضرور جذب کیا ہے جو اردو تہذیب اور اس کے تشخص کے لیے مفید ہوں۔ان پہلوؤں کو ہم معاصر شاعری کے ہر فارم میں دیکھ سکتے ہیں۔چناں چہ اردو کے اس محتاط رویے کو قدامت پسند قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

عموماً اردو جاننے والوں اور اردو شعر وادب پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ اردو جاننے والے تو سماجی، معاشی اور تعلیمی محاذ پر ترقی کی طرف گامزن ہیں لیکن اردو شعرو

ادب موجودہ سماجی وسیاسی صورتحال اور مارکیٹ پالیسی سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہے۔ جب کہ میری ناقص رائے میں حقیقت اس کے برعکس ہے۔ معاصر اردو شاعری کسی مجرد خیال یا فارمولا بند تصوریت سے چمٹے رہنے کی بجائے، عصری زندگی کے مختلف ومتنوع پہلوؤں کی معنی خیز تفہیم وترسیل کی سعی کررہی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مابعدِ جدیدیت کی توضیح وتشریح کرتے ہوئے کہا تھا کہ معاصر ادب دراصل:

''جدید معاشرے کی تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی حالت، نئے معاشرے کا مزاج، مسائل، ذہنی رویے یا معاشرتی وثقافتی فضا یا کلچر کی تبدیلی میں پیدا شدہ بحران کا اظہار ہے''۔

اردو شعری سرمائے میں معاشی و معاشرتی، سماجی وثقافتی تغیر پذیری سے رونما بحرانی کیفیت کا شکار فرد کے داخلی وخارجی جذبات کی کماحقہٗ ترجمانی ملتی ہے۔

پرانے اور نئے کلچر کا تصادم، ذہنی انتشار، احساسِ بے مائیگی ومحرومی، خود فراموشی، دوہری فطرت، کچھ پانے کی امنگ اور کچھ کھونے کا غم، یہ چند ایسی کیفیات ہیں جن سے اکیسویں صدی کا فرد دوچار ہے۔ یہ متفرق اشعار ملاحظہ کیجئے:

کہیں کچھ کھو گیا ہے
یاد اب کبھی بھی نہیں
ہمارا حافظہ
بے واقعہ لمحوں کا صحرا ہے
الف سے بے تلک

جتنے بھی ممکن لفظ بن پائیں
انہیں لفظوں میں
اپنی اپنی
گہری نیند سے پہلے
اسے
لکھیں
اسے
سوچیں
اسے
ڈھونڈیں
جو ہم نے کھو دیا ہے
جو ہم سے کھو گیا ہے

ندا فاضلی

ہر جسم اک الاؤ ہے ہر سانس اک تپش
انسان آج نرغہء برق و شرر میں ہے

مظہر محی الدین

کہیں دور سے
اک آواز آئی
دکھائی جو دیتے ہو تم
وہ نہیں ہو
تو میں نے یہ پوچھا
بتاؤ کہ کیا ہوں
تو آواز آئی
وہی جو نہیں ہو

ساجد حمید

عالمیت (Universiality) اور منظّم ذات (Unified self hood) کا تصور بھی عہد حاضر کا اشاریہ ہے۔ معاصر شاعری ان اقدار کی نہ صرف ترجمانی کر کے سماج پر مرتسم مضر اثرات کی ترجمانی کرتی ہے، بلکہ قاری کے لیے قدریں تعین کرنے کی راہیں بھی ہموار کرتی ہے۔ مہاجرت کے معنی بدل گئے ہیں۔آج کا انسان اپنے آپ کو ایک اجنبی زمینِ بے نفر میں محسوس کر رہا ہے جہاں انسانوں کی بھیڑ میں بھی وہ اکیلا ہے۔

ملکِ خدا میں ساری زمینیں ہیں ایک سی
اس دور کے نصیب میں ہجرت نہیں رہی

ندا فاضلی

امید و نا امیدی جس جگہ آپس میں ملتے ہیں
اسی بے نام سرحد پر
کھڑا ہے راستہ بھٹکا ہوا اک خانماں ویراں
وہ اپنے حال سے مجبور
جائے تو کہاں جائے
جہاں گردی کی دھن میں ایک دن
وہ گھر سے نکلا تھا
مگر اب سرزمینِ بے نفر میں جا گرفتہ ہے

منیب الرحمٰن

مری زندگی بھی مری نہیں، یہ ہزار خانوں میں بٹ گئی
مجھے ایک مٹھی زمین دے، یہ زمین کتنی سمٹ گئی

بشیر بدر

انہیں تلاش میں کر لوں تو چین آ جائے
مرے وجود میں جو ان گنت جزیرے ہیں

ساجد حمید

معاصر اردو شاعری دراصل خود کفیل کائنات کا درجہ رکھتی ہے۔ بے حسی، خود غرضی اور نفس پرستی عام ہے۔ اور اس کے اظہار کے لیے نئی حسیت نے ہمارے شعراء کو ذہنی سطح پر ایک دوسرے سے منسلک کر دیا ہے۔ ذیل کے متفرق اشعار میں ان فکری

انسلاکات کومحسوس کیا جاسکتا ہے جوعصری حسیت کے غماز ہیں۔

پھر شہر میں آئے ہیں ستم گر تو ہمیں کیا
سڑکوں پہ تباہی کا ہے لشکر تو ہمیں کیا
ہم نے تو دریچوں پہ سجار کھے ہیں پردے
باہر ہے قیامت کا جو منظر تو ہمیں کیا
دیوار ودر وبام ہمارے ہیں منقش
اس شہر کے شہری ہوئے بے گھر تو ہمیں کیا

مظہر امامؔ

کوئی کسی کا درد نہ جانے
سب کو اپنی اپنی پڑی ہے

بشیرؔ بدر

خون سے تر بہ تر کرکے ہر رہگذر تھک چکے جانور
لکڑیوں کی طرح پھر سے چولہے میں جل ، جو ہوا سو ہوا
جو مرا کیوں مرا، جو لٹا کیوں لٹا، جو جلا کیوں جلا
مدتوں سے ہیں گم ان سوالوں کے حل ،جوہوا سو ہوا

ندا فاضلیؔ

میڈیا اورانفارمیشن تکنالوجی نے فن کار کے سامنے موضوعات کا ڈھیر

لگادیا ہے۔تاہم اس کے انتخاب میں ہمارے فن کار محتاط نظر آتے ہیں۔

عہدِ حاضر ایسا جہاں ہے، جہاں نہ عرفانِ ذات کے لیے کوئی مہلت ہے اور نہ ہی اپنا تشخص برقرار رکھنے کی گنجائش۔نظریہ عالمگیریت نے تمام سرحدوں کو ختم کردیا ہے۔ انسانی اقدار کی جگہ انسانی حقوق کی پامالی کا نوحہ بنادیا ہے۔ جذبات کی کوئی وقعت نہیں ۔عہدِ حاضر کا فرد کسی بھی طرح کے سماجی اقدار کی پابندی کا متحمل نظر نہیں آتا۔وہ جس طرح چاہے جی لے،اس کے جینے کا ڈھنگ ہی اس کے سماجی اقدار ہوں گے۔گویا آج کا فرد Live and let live کی بجائے Live life king size پر یقین رکھتا ہے۔تیز رفتار زندگی اوراس کی ہنگامہ خیزی زندگی سے عبارت ہے۔ظفرؔ گورکھپوری، فرخ شاہدؔ اور ساجد حمیدؔ کی یہ نظمیں اس جدید زندگی کا منظر نامہ ہیں، ملاحظہ کیجئے

بہت ہی تیز تھی دوڑ
میں تھا.....اور دنیا تھی
ہوا سا وقت اڑا جارہا تھا اور منظر
دھنی کپاس کی مانند ٹوٹ کر بکھرا
کہ ایک موڑ آیا
میں اپنے پاؤں کا کانٹا نکالنے کے لیے
بس ایک پل کو جھکا تھا
کہ اتنی دیر میں آگے نکل گئی دنیا
وہ ایک پل

جو کسی حکم کا نہیں تابع
جسے نہ روک سکے کوئی اور نہ ٹوک سکے
وہ ایک پل جو برے وقت میرے کام آیا
سمجھ رہا ہوں اکارت گیا
ہوا ضائع
میں آج دنیا سے سو سال ہو گیا پیچھے

ظفر گورکھپوری

انسانی آبادیوں سے
دور
جھیل کے کنارے
آم کے گھنے درختوں کے درمیان
دو نوجواں پرندے
خاموشی کے ساتھ
چار حرفوں کا
ورد کر رہے ہیں
س، ک، و، ن

فرخ شاہد

تیز گام لمحوں نے

کوششیں بہت کی تھیں
مجھکو ساتھ لینے کی
میں مگر نہ چل پایا
اس لیے بہت پیچھے
ان سے رہ گیا ہوں میں

ساجد حمید

کثیر جہتی کلچر نے فرد سے نہ صرف اس کا تشخص بلکہ اس کا سکون و چین بھی چھین لیا ہے۔ مسابقت کے ماحول میں اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لیے کوشاں ہے۔ تشکیک، عدم تحفظ اور خوف و دہشت کے مہیب سایوں میں جی رہا ہے۔ موجودہ صورتحال دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیوں سے بھی زیادہ سنگین ہے۔

بقول مجتبیٰ حسین

'' دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جب لندن اور یوروپ کے کئی شہروں پر لگاتار بمباری ہوا کرتی تھی، تب بھی لوگ فلمی اداکاروں چارلی چاپلن اور باب ہوپ کے مزاحیہ پروگراموں کو بصد شوق دیکھا کرتے تھے۔ مگر اب امریکہ کی عظمت اور دبدبے کی علامت کہلانے والے ورلڈ ٹریڈ ٹاورز پر ہوئے ناگہانی حملوں کے سبب امریکی اخباروں کے طنزیہ و مزاحیہ کالموں اور ٹیلی ویژن چینلوں کے مزاحیہ

پروگراموں کو چپ سی لگ گئی ہے۔فن کار عوام دونوں دم بخود
گویا ہنسی کو بھول چکے ہیں''۔

ان حالات میں فطری قہقہے ناپید ہوتے جارہے ہیں ۔ Laughter club اور Laughter challenge اور اسی نوع کے دیگر پروگراموں کے توسط سے ہنسی کے ہنگاموں کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔معاصر اردو شاعری اس یاسیت آمیز ماحول سے اپنے معاشرے کو نکالنے کی متمنی ہے۔یہ اشعار ملاحظہ کیجئے

کالا ابر، پیلی دھرتی یا اللہ
ہا ہا ، ہو ہو ، ہی ہی ہی یا اللہ
پیر پیمبر کو اب اور نہ زحمت دے
چوکا ، چکی ، آٹا ، سبزی یا اللہ
گڑ شکر بھی بھیج کبھی اخباروں میں
کئی دنوں سے چائے ہے کڑوی یا اللہ

ندا فاضلی

غزلیں اب تک شراب پیتی تھیں
نیم کا رس پلا رہے ہیں ہم

بشیر بدر

عہد حاضر Joint Family کا نہیں بلکہ Compartmental یا نیوکلیس فیملی کا دور ہے۔اس کے علاوہ Live in partner کا کلچر بھی عام ہورہا ہے،

جسے نئی تہذیب آشنا نسل معیوب نہیں سمجھتی ۔ جہاں اتنی زیادہ آسائشیں ہیں، وہیں اخلاقی انحطاط بھی جگہ پارہا ہے، بڑے چھوٹوں کا لحاظ ختم ہوگیا ہے۔

بقول زبیر رضوی

غالب کے خطوں جیسی تہذیب نہیں ملتی
آداب بڑوں کو اور چھوٹوں کو دعا لکھنا

ایسے مصنوعی کلچر میں رشتوں کا تشخص ختم ہوگیا ہے۔ جنریشن گیپ نے دونسلوں کے درمیان ذہنی ونفسیاتی کشیدگی پیدا کر کے ان کے درمیان خلیج پیدا کردی ہے مندرجہ ذیل اشعار ذہنی روش کا اشاریہ ہیں

کندھے اچکا کے بات کرنے میں
منفرد ہوتے جا رہے ہیں ہم
چست کپڑوں میں جسم جاگ پڑے
روح و دل کو سلا رہے ہیں ہم

بشیر بدر

رہن سہن کا تو وہ رنگ روپ بدلا ہے
نہ شہر شہر رہے نہ گاؤں گاؤں رہے

موہن تلخ

چھ دنوں تک شہر میں گھوما وہ بچوں کی طرح

ساتویں دن جب وہ گھر پہنچا تو بوڑھا ہوگیا

کمار پاشی

مجھ کو سورج نے یہ کہہ کر لوٹادیا
تیرے حصے میں شب کا سفر آیا

اعتماد صدیقی

نیا کلچر اپنے آبائی کلچر سے متصادم ہے پرانی اور نئی نسل دونوں اپنے اقدار وآدرشوں میں قید ہیں۔ پرانی نسل کو نئے اقدار فرسودہ اور اخلاق سوز نظر آرہے ہیں تو نئی نسل موروثی، ثقافتی وتہذیبی اقدار Out dated تصور کررہی ہے۔ دونوں نسلیں اپنے اپنے خول میں بند ذہنی کشمکش کا شکار اپنے آدرشوں سے چمٹے زندگی بسر کررہے ہیں ۔ بھیڑ میں رہ کر بھی تنہائی عہدِ حاضر کے فرد کا مقدر ہے۔ اس ذہنی خلیج اور کشمکش کی صورتحال پر معاصر شاعروں نے دل کھول کر لکھا ہے۔ یہ اشعار اس کی مثال ہیں۔

میں اپنی راہ کا تنہا مسافر
الجھ کر رہ گیا سب منظروں میں

بشر نواز

خواہشوں کی تیز رفتاری کے بیچ
میں کھڑا تھا بھاگتی کاروں کے بیچ

مصحف اقبال توصیفی

یہ کیسی رس بھری آواز ہے

جو اس گھنے ''وجود'' کے اندر
اندھیرے اور اجالے کے
لبوں کے نرم سنگم پر
زماں کی اور زمیں کی
ان سنی سرگوشیوں میں پھوٹ بہتی ہے
جسے بس میں ہی سنتا ہوں!
جسے بس میں ہی سنتا ہوں!

وزیر آغا

تنہائی.....سمجھا سمجھا کے تھک سی گئی ہے
باہر نکلو.....دنیا دیکھو
شور .....تماشے.....بھاگم بھاگ
میلہ ہے بازاروں میں
'' دھنوانوں کی روز دیوالی ہوتی ہے''
میں بے چارہ.....غم کا مارا
کب بولوں اور کیا بولوں!

باقر مہدی

میری بےخواب آنکھیں خواب منظر کو ترستی ہیں
اکیلے پن میں سارے درد لمحے گنگناتے ہیں

مظہرؔ محی الدین

سیانی ہوگئی تنہائی جب سے
کوئی جی دار ساتھی مانگتی ہے

خورشیدؔ اکبر

دیکھیں کیا کررہی ہے تنہائی
آج اپنے ہی گھر پہ دستک دیں

مصحفؔ اقبال توصیفی

دن میں جانے کب گھس آیا صحرا میرے کمرے میں
دفتر سے لوٹے تو دیکھا گھر کا نقشہ آج عجب

مصحفؔ اقبال توصیفی

جو ساتھ لے کے چلا تھا ہزار ہنگامے
وہ شخص آج اکیلا دکھائی دیتا ہے

خورشید احمد جامیؔ

معاصر شاعری نے جہاں شور شرابے، زندگی کی ہماہمی، بھیڑ بھاڑ میں فرد کے اندرونی خلا کو منعکس کیا ہے وہیں Urbanized culture کے سبب عہد حاضر کے فرد کی صارفانہ سوچ، انسانی اقدار کی زوال پذیری اور میکانکی زندگی کو بھی منعکس کیا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں

شہر کے یاروں کی یہ رسمی مبارکبادیں

پھول کاغذ کے لیے کانچ کے بازو آئے

بشیرؔ بدر

خلوص رہ گیا بس اک مکالمہ بن کر
حضور کیسے ہیں عالی جناب کیسے ہیں

بشر نوازؔ

وہ اب ہو شہر کہ بستی وہیں رہیں چل کر
کھڑے ہوں چھت پہ تو نظروں میں اپنا گاؤں رہے
بلند ہو تو رہی ہیں عمارتیں ہر سو
خدا کرے مرے آنگن میں دھوپ چھاؤں رہے

من موہن تلخؔ

گھر کو کھوجیں رات دن گھر سے نکلے پاؤں
وہ رستہ ہی کھوگیا ،جس رستے تھا گاؤں

ندا فاضلیؔ

مری بستی کا ہر سنسان آنگن
گلی کو چو ں سے بچپن ما نگتا ہے

مظہرؔ محی الدین

ان سماجی وثقافتی موضوعات کے علاوہ معاصر شاعری میں احساس عدم تحفظ، تلاش ذات، انسانی حقوق کی پامالی، نسلی وفرقہ وارانہ فسادات جیسے ہنگامی موضوعات کی عکاسی ملتی

ہے۔ان اشعار میں مرتعش آواز عہد حاضر کے افراد کے جذبات واحساسات کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

کہیں بھی شہر اماں نہیں ہے
ایودھیا اب کہیں نہیں ہے

ندا فاضلی

سودا لینے ہاٹ میں کیسے جائے نار
چاقو لے کے ہاتھ میں بیٹھا ہے بازار

ندا فاضلی

دور سمندر پار سے کوئی کرے بیوپار
پھیلے بھیجے سرحدیں ، پھر بیچے ہتھیار

ندا فاضلی

خوں خوار درندوں کے فقط نام الگ ہیں
ہر شہر بیابان یہاں بھی ہے وہاں بھی
ہندو بھی سکوں سے ہے مسلماں بھی سکوں سے
انسان پریشان یہاں بھی ہے وہاں بھی

ندا فاضلی

عجب سانحہ مجھ پر گذر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈرگیا یارو

شہریار

لو گ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

بشیر بدر

بے خبر کر سیاں آنکھ ملتی رہیں
بستیاں بے گناہوں کی جلتی رہیں

بشیر بدر

جلے مکانوں میں بھوت بیٹھے بڑی متانت سے سوچتے ہیں
کہ جنگلوں میں نکل کے آنے کی کیا ضرورت تھی آدمی کو

پرکاش فکری

پھر ان کے نیچے درندوں کے نام کس نے لکھے
ہمیں یقین ہے یہ سب ہمارے چہرے ہیں

بشیر بدر

میں اس کا نام کیا لوں انسپکٹر
اتنا واقف ہوں
مری طرح سے وہ بھی ماں کا ایک بیٹا ہے

وہی قاتل نہیں میرا
مرے قاتل تو وہ ہیں
جو مسیحا بن کے بیٹھے ہیں
تم اپنی ڈائری میں
قاتلوں کے نام کے آگے
خود اپنا نام بھی لکھو

میر ہاشم علی

میری ناقص رائے میں معاصر شاعری کلیت یا داخلیت کی بجائے عصری ادبی تقاضوں کی اساس پر عوامی شرکت کو یقینی بنانا چاہتی ہے۔ اس میں عصری حسیت اور سماجی وتہذیبی اقدار کو جذب کرنے کی قوت ہے۔ وجودیت داخلیت یا اندرون ذات کی تلاش وجستجو کی بجائے کارکردگی عمل اور وقوع پذیری کا احیاء آج کی شاعری کا اہم وطیرہ نظر آتا ہے۔ عہد حاضر کے شاعر کو اس بات کا بھی علم ہے کہ موجودہ سماجی نظام نے فرد کے ذہن کو الجھا دیا ہے۔ وہ آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں، وہ خوش ہو کر بھی خوش نہیں ہے۔ یہ مختصر سی نظم عہد حاضر کے فرد کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

مجھ کو دیکھو
نہ آزاد ہوں نہ مقید
نہ رنجور ہوں نہ تندرست
نہ خوش ہوں نہ ناخوش

مندرجہ بالا نظم میں عہد حاضر کی فکری روشنی کا اشاریہ بھی ہے اور ارتکازی عمل بھی۔ گویا معاصر شاعری میں انتخابی وجذباتی عمل سے زیادہ پرزور ملتا ہے۔ آج کا فنکار قدری فیصلے صادر کرنے کے بجائے حالات کی معنی خیز تفہیم کرنے کی سعی کر رہا ہے جو زندگی کی آنچ میں تپ کر زندگی کے سانچے میں ڈھل کر تخلیقی مرتبہ حاصل کر رہے ہیں۔ بقول سید عابد حسین:

''ادب، شاعر یا ادیب کے ذہن میں سوئے ہوئے
خیالات کا نام ہے، جو زندگی کی چھیڑ سے جاگتے ہیں،
زندگی کی آنچ میں تپتے ہیں اور زندگی کے سانچے میں
ڈھل کر خود زندگی بن جاتے ہیں''۔

ایسے سماج میں جہاں اب جرائم بھی آرٹ کی صورت اختیار کر رہے ہیں۔ نسبی رشتوں میں دراڑیں پڑ رہی ہیں۔ رہبر نما لٹیرے حاکم بنے بیٹھے ہیں۔ جو مدد و نصرت کے لیے قدم بڑھاتا ہے اسی کو کچلنے، پیچھے ڈھکیلنے اور نیست و نابود کرنے کی سازشیں رچی جا رہی ہیں۔ معاصر اردو شاعری ایسے سماجی و اخلاقی استحصال اور جذبوں کی پامالی پر نوحہ کناں ہے بلکہ باقی ماندہ انسانی اقدار کے تحفظ اور ان کی بقاء کے لیے کوشاں نظر آتی ہے۔ یہ چند متفرق شعر ملاحظہ کیجئے۔

آج کی طے شدہ حقیقت ہے
ڈوبتا ہے ابھارنے والا

مظفر حنفی

کھلے سے لان میں سب لوگ بیٹھیں چائے پیئیں
دعا کرو کہ خدا ہم کو آدمی کر دے

بشیر بدر

علاوہ ازیں نسائی تحریک ہو، انسانی حقوق کا سوال یا دلت مسائل، اردو شاعری عہدِ حاضر کے ہر سلگتے اور Valid موضوع کو اپنے دامن میں سمیٹ کر آگے بڑھ رہی ہے۔

غرض معاصر اردو شاعری کسی بھی صورت عصری فکری حسیت یا فکری تشکیل نو سے بے گانہ نہیں ہے۔ اس پر عصری حالات سے بیگانگی، یا موجودہ تقاضوں سے بے میل ہونے کا الزام بے بنیاد نظر آتا ہے۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں ہے کہ وہ انقلابی روح جو کبھی اردو ادب کو سرگرم عمل رکھے ہوئے تھی، وہ اب سکڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایسی بہت کم تخلیقات ہیں جن میں جاندار اور حسیت سے بھرپور خیالات کی عکاسی ملتی ہو۔

☆☆☆

کانفرنس کے موقع پر پروفیسر اے۔ ایم۔ پٹھان ڈاکٹر اوصاف سعید اور جناب زاہد علی خان حاضرین اجلاس کے ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں

کانفرنس کے چوتھے اجلاس میں شہ نشین پر مقالہ نگار اور مہمانان کانفرنس دیکھے جاسکتے ہیں

اردو ۔ اکیسویں صدی کی آواز

ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد
ڈپٹی ڈائرکٹر وانچارج مرکز برائے اردو زبان، ادب وثقافت
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

زبان صرف وسیلۂ اظہار ہی نہیں ہے بلکہ تہذیب کی شناخت کا ذریعہ بھی ہے۔ اور اسی کے ذریعہ سماجی روابط کو وسعت حاصل ہوتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے مسائل اور معاملات سے باخبر بھی ہوتے ہیں اور اسی باخبری کی بنیاد پر ایک دوسرے سے روابط بھی استوار ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک گونگا فرد دوسروں کے لیے عذاب بن جاتا ہے اسی طرح اگر کسی معاشرے کے پاس زبان نہیں ہے تو ایسا معاشرہ گہن میں آئے ہوئے چاند کی طرح ہے جو کبھی تاریکی سے روشنی میں آ ہی نہیں سکتا۔

زبان کی مختلف جہتیں ہوتی ہیں مہد سے لحد تک ہر مقام پر زبان کا رنگ و آہنگ بدلتا جاتا ہے کبھی بے معنی آوازیں تتلاہٹ کے ساتھ بہت کچھ سکھا دیتی ہیں اور پھر جیسے جیسے انسانی شعور سن وسال کی چھاؤں میں پختگی کی حد تک پہنچتا ہے وہ ہر شعبۂ حیات کی الگ الگ بول چال سے واقف اور باخبر ہوتا جاتا ہے۔ جب مذہبی تقریب ہوتی ہے تو کچھ اور ہی رنگ ہوتا ہے شادیانے بجتے ہیں تو الفاظ آتش بازی کی پھول جھڑی بن کر کچھ اور ہی رنگ پیدا کرتے ہیں اور پھر جب آخری لمحات آجاتے ہیں تو کچھ اور ہی

الفاظ ہوتے ہیں۔

غرض کہ زبان الفاظ کے سہارے ہی اپنا وجود رکھتی ہے۔جس طرح انسانی جسم کا کوئی تصور اعضاء کے بغیر ناممکن ہے اسی طرح الفاظ کے بغیر زبان کا وجود بھی ناممکن ہے۔اور جس طرح تمام اعضاء انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہیں مثلاً پیر نہ ہوں گے تو لنگڑا' ہاتھ نہ ہوں گے تو لولا' آنکھیں نہ ہوں گی تو اندھا ہوگا۔اسی طرح اگر کسی زبان کے پاس اپنا رسم الخط نہیں ہے تو وہ زبان اس انسان کی طرح ہے جس کا سر نہیں ہوتا۔ ہر زبان اپنے رسم الخط کے ساتھ اپنے وجود کا اعلان کرتی ہے۔اردو بھی ایک معیاری زبان ہے اسے بھی ایک تہذیب نے اپنا خون جگر دے کر پروان چڑھایا ہے۔اس کے پس منظر میں بھی تاریخی طور سے ایک سماج ایک معاشرہ اور ایک تہذیب ہے۔اور ان سب کے ساتھ اس زبان میں جسے اردو کہتے ہیں ہندوستان کی تقریباً چھ سو برس کی تاریخ بھی موجود ہے جو ہندوستانیوں کے مشترکہ دکھ سکھ کی تاریخ ہے اور اگر قومی وحدت کی کوئی اساس ہوسکتی ہے تو وہ مشترکہ دکھ سکھ' مشترکہ تجربات اور مشترکہ تاریخ ہوسکتی ہے۔ ہندوستانی قومیت کو اردو کی سب سے بڑی دین یہی ہے کہ اس نے تاریخ کو اس طرح اپنے دامن میں محفوظ رکھا جس طرح فانوس میں چراغ روشن رہتا ہے۔اور جس طرح صبح کے ستارے کی روشنی میں کارواں' بانگ جرس کے ساتھ مقامات طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اسی طرح اردو نے بھی ہمیشہ مستقبل کے لیے راہیں ہموار کیں۔

اس زبان کا ایک دلکش پہلو یہ رہا ہے کہ اس کا صحیح تشخص اور اس کے مقام کا تعین نہ ہوسکا۔ایک ایسا دور تھا جب اسے ایوان شاہی کا نقش کہا جاتا تھا جب کہ حقیقت یہ

تھی کہ بے شک ایوان شاہی میں اس کے نغمے گونجتے تھے مگر اس لیے نہیں کہ یہ بادشاہ کی پسندیدہ زبان تھی بلکہ اس لیے گونجتے تھے کہ بادشاہ یہ جانتے تھے کہ اگر انہیں عوام میں اپنی جگہ بنانی ہے تو اس زبان کو اپنانا ہوگا۔

طویل عرصہ تک اسے لشکر کی زبان کہا گیا۔اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لشکر میں باہمی ارتباط کا ذریعہ بھی یہی زبان تھی لیکن یہ لشکری زبان صرف لشکری زبان نہیں تھی اسے رنگ محل کی زبان سمجھا گیا جہاں رقص ونغمہ اور ساز وآواز کی حکمرانی تھی۔ بے شک وہاں یہ زبان تھی اس لیے کہ فنکار یہ جانتے تھے کہ سننے والے اسی زبان کو سمجھتے ہیں۔ بے شک خانقاہوں میں حقیقت اور معرفت کے الوہی پیغامات کے نشر واشاعت کا ذریعہ یہی زبان تھی' بے شک صوفیائے کرام نے اس کی سرپرستی کی اسے معرفت کی لوریاں سنائیں خون جگر سے اپنی نواؤں کی پرورش کی اس لیے کہ انھیں یہ احساس تھا کہ نوا میں انداز تربیت اگر پیدا ہوگا تو اسی زبان سے پیدا ہوگا۔

یہیں پہنچ کر یہ عرض کرنا ہے کہ یہ کسی طبقہ کی پابند نہ تھی' کسی فرقے کی جاگیر نہ تھی' کسی مسلک کا اثاثہ نہ تھی' کسی دھرم یا مذہب تک محدود نہ تھی اس میں اتنی قوت تھی کہ دیگر زبانوں کی طرح یہ جغرافیائی حد بندیوں کی اسیر نہ رہ سکی۔ یہ ہندوستانی زبان تھی اور اسی لیے ہندوستان کے شمال کو جنوب سے' مشرق کو مغرب سے ملانے کا کارنامہ اسی نے انجام دیا اور جیسا کہ عرض کیا گیا کہ یہ ہماری قومی وحدت کا سب سے بڑا نشان تھی ' کثرت میں وحدت کی علامت تھی اور مشترکہ تہذیبی اقدار کی امانت دار تھی۔کہا جاتا ہے کہ اس زبان پر برا وقت پڑا اور ۱۸۵۷ء کے بعد یہ اپنے ہی وطن میں اجنبی ہوگئی۔

مگر یہ درست نہیں ہے۔

کسی خوش فہمی کی بنا پر میں اس مایوسی کے منظر نامہ سے اختلاف نہیں کر رہا ہوں بلکہ حقائق کی بنیاد پر متوجہ کر رہا ہوں ۴۷ء سے پہلے موجودہ بنگلہ دیش میں اردو بولنے والے خال خال تھے اب ڈھاکہ' چٹاگاؤں' جیسور' میمن سنگھ اور پاربتی پور میں اردو کے چھوٹے چھوٹے زون ہیں۔ پورا پاکستان اس طرح اردو کا پابند نہ تھا بے شک لاہور اردو کا ایک مرکز تھا مگر کراچی میں اردو نہ تھی اب کراچی' پشاور' اسلام آباد ہو یا راولپنڈی۔ انھیں اردو کے مراکز کہا جا سکتا ہے لاہور تو خیر پہلے بھی تھا آج بھی ہے اسی شہر اردو کے لیے کسی ستم ظریف نے کہا تھا

لاہور میں مخلصان اردو کس جوش سے آگے بڑھ رہے ہیں
حد ہو گئی خدمت زباں کی اردو میں نماز پڑھ رہے ہیں

۴۷ء میں ہمارے بزرگوں نے یہ خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ لندن میں اردو کے مراکز اور تعلیم گاہیں قائم ہوں گی امریکہ میں نیویارک' کیلی فورنیا' لاس انجلس اور ایسے ہی نہ جانے کتنے مقامات ہیں جہاں اردو کا چرچا ہے۔ سعودی عرب سے اب اردو کا اخبار نکلتا ہے۔ خلیجی ممالک میں اردو ہی رابطہ کی زبان ہے دراصل اردو کو اس وقت لنگوا فرینکا یعنی بین الاقوامی رابطہ کی اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ بقول احسن مارہروی

''دنیا کی کوئی زبان خواہ مغرب میں بولی جاتی ہو یا مشرق میں' شمال میں جاری ہو یا جنوب میں۔ ایسی نہ ملے گی جو اپنی مخالف تمام زبانوں کے تمام لہجوں پر پوری طرح قادر ہو سکتی ہو۔ عجم (ایران) ٹ ڑ۔ ڈ۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ اور مخلوط ہائے ھوز کے بولنے میں

گونگا ہے۔ عرب' پ۔ چ۔ ژ۔ گ پر زبان نہیں ہلا سکتا۔ انگلستان بھی غ' ڑ اور ق' نہیں بول سکتا۔ اسی طرح ہندوستان میں اردو کے سوا تمام پراکرتیں اپنا شین' قاف درست نہیں رکھتیں۔ ہر بات اردو ہی کے لیے مخصوص ہے کہ اجنبی سے لہجہ کی نقل کا اصل اتار لیتی ہے۔''

یہی سبب ہے کہ عربی میں نہ گھر ملے گا نہ آگ۔ نہ چوٹ کھا سکتے ہیں نہ ٹوٹ سکتے ہیں نہ توڑ سکتے ہیں نہ گھمنڈ کر سکتے ہیں' آسمان سے ژالہ باری بھی نہیں ہوتی۔ فارسی میں بھی ڈٹ کر کھانے کو نہیں ملے گا اور تمام تر کوششوں کے باوجود کتنا ہی اچھا کھانا ہو دل نہیں بھرتا اچھی شکل بھی نہیں دکھائی دیتی۔ یہ تو اردو کی معجز نمائی ہے کہ ریڈیو بھی ہے ٹیلی فون بھی۔ آکاش پر تارے بھی جھلملاتے ہیں اور خلیل' خلیل ہی رہتا ہے اگر اردو سے نا واقف ہیں تو پھر وہ غریب کھلیل ہو کے نکلتا ہے۔

اردو کی اس دنیا میں بڑی وسعت ہے۔ حقیقی معنوں میں اب اردو کا ارتقائی سفر شروع ہوا ہے بدقسمتی سے اردو زبان پر اردو ادب کا اطلاق کیا جانے لگا ادب تو دنیا کی کسی بھی زبان میں فی الحال اس پایہ کا ادب تخلیق نہیں ہو رہا ہے جو درجہ مثلاً شکسپیر' گوئٹے' سعدی' زولایا روسو وغیرہ کو حاصل تھا۔ بڑا ادیب صدیوں میں جنم لیتا ہے برسوں مہر و ماہ کی نظریں لگی رہتی ہیں تب کہیں صاحب نظر پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر اقبالؔ' جوشؔ' غالبؔ' میرؔ' میر انیسؔ یا پریم چند جیسے قد آور ادبی شخصیتیں اب جنم نہیں لے رہی ہیں تو یہ اردو کے زوال کی علامت نہیں ہے بلکہ یہ عالمی سطح پر اسی طرح کی ایک حقیقت ہے جسے اشیا کی گرانی یا مہنگائی کہتے ہیں۔ ساری دنیا کے بازاروں میں دام بڑھ رہے ہیں تو

ہندوستان میں بھی بڑھ رہے ہیں۔اسی طرح دور حاضر تخلیق کے لیے ایک بحرانی دور ہے۔ساری دنیا میں ادبی تخلیق اس پایہ کی نہیں ہے تو اردو میں بھی نہیں ہے۔لیکن اردو کی اس رنگین تصویر سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میری نظر میں اردو کے مسائل نہیں ہیں یا میں احمقوں کی خوش فہم جنت ہی میں رہنا چاہتا ہوں۔ایک منٹ کے لیے رک جائیے۔ اظہار اثر کرتپوری اردو دنیا کے اپریل کے شمارے میں لکھتے ہیں

''اس وقت عوام میں خواندگی کا اوسط بھی کم تھا اس کے باوجود اردو کے رسالے اور کتابیں پڑھنے والے لاکھوں کی تعداد میں تھے۔آج صرف دہلی کی آبادی ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ ہے عوام میں خواندگی کا اوسط بھی کئی گنا بڑھ گیا ہے لیکن اردو کے قارئین ناپید ہوتے جارہے ہیں۔اس کی ایک وجہ تو اردو کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونا ہے۔ایک بات اور بھی توجہ طلب ہے کہ دنیا کی کوئی زبان صرف ادب کے سہارے زندہ نہیں رہتی۔ہر زمانے میں اپنی سماجیات' عمرانیات اور سوشل معاملات ہوتے ہیں۔فلسفہ' سائنس' جغرافیہ' جیومیٹری' ریاضی یہ تمام علم مل کر ہی کسی زبان کو مکمل بناتے ہیں۔صرف ادبی مباحثوں کے بل پر کوئی زبان زندہ نہیں رہ سکتی۔یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے جرائد کو صرف ادب تک محدود نہ رکھیں بلکہ ان تمام موضوعات کا احاطہ کریں جو ماضی سے مستقبل تک پھیلے ہوئے ہیں۔''

ان باتوں میں صداقت ہے۔اصل میں جہاں بہت سارے پہلو عالمی نوعیت

کے ہیں ویسے ہی پڑھنا بالخصوص' پیکر تصویر کا کاغذی پیرہن اب دھیرے دھیرے رخصت ہو رہا ہے۔

اب سارے لباس انٹرنیٹ' ڈی وی ڈی اور سی ڈی وغیرہ کی زینت بن رہے ہیں اور اس کا اثر ہر زبان پر پڑ رہا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو کی طرف سے ان دو باتوں پر عدم توجہی ہے۔پہلی بات یہ کہ اردو کا تمام تر فروغ اپنی جگہ پر لیکن اصل مسکن ہندوستان ہی ہے اور ہندوستان کا اپنا کوئی علاقہ نہیں ہے جیسے ملیالم کا علاقہ کیرالا کو چین ہے یا تلگو کا علاقہ آندھرا پردیش یا مراٹھی کا علاقہ مہاراشٹر ہے اردو کا اپنا کوئی علاقہ ایسا نہیں ہے کیوں کہ وہ پورے ملک کی زبان ہے اس لیے اس کی اپنی کوئی جگہ نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ اردو ایک مخصوص تہذیب کے ساتھ وابستہ تھی اس تہذیب کی اساس یا بنیاد محبت تھی' بھائی چارہ تھا' وسیع النظری اور رواداری تھی دور حاضر کی سیاست نے ان سارے الفاظ کو عملی زندگی سے نکال کر تاریخ کے ایوان میں سجا دیا۔سارے الفاظ سننے میں اچھے لگتے ہیں مگر انھیں برتا نہیں جاتا اب وہ تہذیبی قدریں پھر رخصت ہوگئی ہیں جن بنیادوں میں یہ عناصر تھے اور ان تہذیبی قدروں کو پیش کرنے والی اور فروغ دینے والی زبان بھی اب گھروں سے رخصت ہو رہی ہے اسی لیے اردو کا مسئلہ اب سماجی اور تہذیبی مسئلہ بھی ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ مادری زبان میں جو علم حاصل کیا جاتا ہے وہ دماغ میں تخلیقی توانائی پیدا کرتا ہے۔ہمارے یہاں اب مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا ایک سنہرا خواب ہے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا ذکر ابھی کروں گا مگر مادری زبان میں

تعلیم نہ ملنے کی وجہ سے طلبا اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لا پاتے اور جب ایسا نہیں ہو پاتا تو ایک عام آدمی جس طرح پولیو کی ایک خوراک سے ڈرتا ہے ویسے ہی اردو پڑھانے سے بھی ڈرتا ہے کہ فائدہ تو کچھ نہیں ہے پڑھ لکھ کے وقت کی صرف بربادی ہے اور فنڈامنٹلسٹ اور کمیونل کہلانے کا بھی خدشہ رہتا ہے۔اس طرح اردو کا دائرہ سمٹ بھی رہا ہے سکڑ بھی رہا ہے۔بالخصوص بہار، اتر پردیش اور آندھرا پردیش کے کچھ علاقوں میں جہاں کبھی سروں پر اردو کا تاج تھا اور علاقہ میں اردو کا راج تھا مگر اب تو اردو میں کام کاج بھی نہیں ہوتا۔لیکن ان تمام تر نامساعد حالات کے باوجود اردو کو کبھی سست روی اور کبھی تیز روی کے ساتھ ترقی حاصل ہوتی رہی۔ جہاں اردو کی عوامی مقبولیت کو کم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی گئی وہیں اعلیٰ سطح پر اس زبان کی ترقی وترویج کے لیے خاطر خواہ نہ سہی حوصلہ افزا مواقع بھی فراہم کیے گئے۔لیکن اہل اردو نے اس کی آبیاری کے فریضہ کو خلوص دل کے ساتھ انجام دینے میں تساہل برتا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دور حاضر میں اسٹار کلچر کی زبان کہلانے والی اردو اپنے ہی ملک کے ایک بڑے طبقہ کے لیے ایک اجنبی زبان بن کر رہ گئی ہے۔

چناں چہ آزاد ہندوستان کی چھ دہائیاں گزر جانے کے باوجود حصول آزادی کی جدو جہد میں نمایاں رول ادا کرنے والی اردو زبان کے حصہ میں بہاریں کم اور خزاں کے موسم زیادہ آئے ہیں۔لیکن تمام تر مخالفتوں کے باوجود آئین ہند کی آٹھویں فہرست میں اردو کو بھی قومی زبان کے طور پر درج کیا گیا ہے۔کیوں کہ کھڑی بولی یا ہندوستانی کی ترقی یافتہ شکل اردو جسے فارسی سے ماخوذ رسم الخط میں لکھا جاتا ہے تیرھویں صدی سے نشو ونما

پا رہی ہے۔انیسویں صدی تک اپنے شعری ذخیرہ سے مالا مال اس زبان نے انیسویں صدی کے بعد اپنے نثری سرمایہ کی وجہ سے بھی اپنا ایک منفرد مقام بنالیا ہے بلا تخصیص مذہب وعقیدہ اردو نے تمام علوم کو انسانیت تک پہنچانے میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔بیسویں صدی تک ہندومت، جین دھرم، سکھ مذہب، برہمو سماج، آریہ سماج، عیسائیت، یہودیت، پارسی مذہب اور اسلام وغیرہ کا بڑا ذخیرہ اس زبان میں جمع ہو گیا۔1956 میں ہندوستانی ریاستوں کی لسانی تقسیم کے بعد سے 1970 تک اردو کو بہت زیادہ نقصان پہنچا۔اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے حکومت نے اردو کو لازمی طور پر دی جانے والی سہولتوں پر عمل آوری کے لیے ہدایات جاری کیں جس کی روشنی میں پرائمری سطح تک کی تعلیم وامتحان کی سہولت ان تمام بچوں کو دیے جانے کی ہدایت دی گئی جن کے والدین یا سرپرستوں کی مادری زبان اردو ہے۔اردو میں اساتذہ کی تربیت اور نصابی کتابوں کی فراہمی کو یقینی بنانے کے ساتھ ساتھ ثانوی سطح تک لازمی طور سے اردو ذریعہ تعلیم کے لیے تمام درکار سہولتو ں کی فراہمی، نیز تمام عدالتوں اور دفاتر میں درخواستوں کی اردو زبان میں قبولیت، اردو کے تمام علاقوں میں اہم قوانین، قواعد وضوابط اور اعلانات اردو میں جاری کرنے کی ہدایات بھی جاری کی گئیں۔

انگریزی اور دیگر علاقائی زبانوں کے ساتھ مسابقت اور سرکاری سطح پر معاندانہ رویہ کے باعث کل تک روزگار کا ایک اہم اور موثر ذریعہ سمجھی جانے والی اردو زبان کو آج ایک بار پھر سے روزگار سے مربوط کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔کیوں کہ آزادی کے بعد سے یہ صورت حال اس قدر سنگین ہو گئی تھی کہ خود اردو والے روزگار کی

عدم فراہمی کے خدشات کے سبب اردو میں درس وتدریس سے دوری اختیار کرنے لگے تھے۔تاہم دینی مدارس بالواسطہ طور پر ہندوستان میں اردو کی ترقی وترویج کے لیے کوشاں رہے اور ہیں۔

لیکن آزادی کے بعد جامعہ عثمانیہ کے ذریعہ تعلیم' اردو کو ختم کر دینا ایک ایسا قدم تھا کہ بشمول انجینیر نگ اور طب جدید کے عصری علوم کے لیے شہرت رکھنے والی اردو انتہائی کم زور ہوگئی اور ہندوستانی فلموں کی طرح جس کی زبان اردو ہوتے ہوئے بھی انھیں ہندی کی سند عطا کر دی جاتی ہے اردو کے تعلیمی ادارے بھی آہستہ آہستہ اپنی عظمت واہمیت کھونے لگے۔چناں چہ 28 مارچ 1953 کو ایوان عام میں وزارت تعلیم کے موازنہ پر بحث کے دوران آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم امام الہند مولانا آزاد نے پرشوتم داس ٹنڈن کے ایک الزام کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا ''ہندی والوں کو ان کا لسانی تعصب لے ڈوبے گا افسوس جو زبان اسی ملک میں پیدا ہوئی آج اس کے لیے ہمارا دماغ تنگ ہوگیا ہے اردو کسی مذہب یا گروہ کی زبان نہیں بلکہ سب کی زبان ہے اگر اردو کو مسلمانوں کی زبان فرض بھی کرلیا جائے تو کیا اس کے ساڑھے چار کروڑ باشندوں کے ادارہ کو امداد دینا اعتراض کی بات ہے۔'' وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو کے ساتھ تعصب برتنے والوں نے بھی شائد اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے قومی اور ریاستی سطح پر اردو اکیڈیمیوں کے قیام کی خوشگوار روایت ڈالی جس کے باعث اردو والوں کی اشک شوئی کی راہ ہموار ہوئی۔بہر حال نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے بھی اردو ایک زندہ زبان کی طرح پھلی پھولی اور ترقی کی نت نئی منزلیں طے کر رہی ہے۔اکیسویں

صدی میں داخل ہوتے ہوئے جو بلاشبہ سائنس اور ٹکنالوجی کی صدی ہے اردو نے بھی دیگر زبانوں کے ساتھ مسابقت کی اور آج ایک زندہ زبان تسلیم کی جارہی ہے۔اس حقیقت کے باوجود کہ اردو کی عظمت واہمیت مسلمہ ہے اور بشمول ہمارے قومی رہنماؤں کے انگریزوں نے بھی اس زبان کی اہمیت وافادیت کو محسوس کرتے ہوئے فورٹ ولیم کالج کے قیام کی راہیں ہموار کی تھیں شائد اسی لیے بابائے قوم مہاتما گاندھی نے کہا تھا

''میں اردو کی ترقی چاہتا ہوں۔میرا خیال ہے کہ سب
ہندو جو ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اردو سیکھیں۔''

ڈاکٹر راجندر پرشاد کے خیال میں

''اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے حامی اس
بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان دونوں زبانوں کی ترقی
میں ہندو اور مسلمان دونوں کا حصہ ہے۔''

اور پنڈت نہرو نے کہا تھا۔

اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں زندگی کی
دھڑکنیں موجود ہیں۔میرا تو خیال ہے کہ مختلف اسباب
کی بنا پر اردو کی زیادہ سے زیادہ ہمت افزائی کی جانی
چاہیے۔یہ ان زبانوں میں سے ایک زبان ہے جس کا
ذکر دستور میں موجود ہے.....بے شک
اردو ایک ہندوستانی زبان ہے۔اردو پاکستان کی زبان

نہیں ہے پاکستان تو کیا ہندوستان کے علاوہ کوئی بھی
ملک اس زبان کے متعلق اپنا دعویٰ پیش نہیں کرسکتا۔

(صحافتی کانفرنس ۲۵/اکتوبر ۵۶ء نئی دہلی)

مولانا آزاد نے بھی اردو سے تعصب برتنے والوں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا تھا

اب یہ سوال اٹھتا ہی نہیں کہ پورے ملک کی زبان
کون سی ہوگی کیوں کہ ہندی کو جو جگہ ملنی تھی وہ اسے مل
گئی۔اب ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس کے ساتھ
اردو کی جو جگہ ہے وہ اسے ملنی ہی چاہیے۔

لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تدریس اور تعلیم ہی اردو کا سب سے اہم اور سنگین مسئلہ ہے۔کیوں کہ آزادی کا سورج طلوع ہونے کے بعد سب سے زیادہ نقصان اردو ذریعہ تعلیم ہی کو پہنچا۔اگر ہم اپنی کوششوں اور کاوشوں سے اس میدان میں کامیابی حاصل کرلیں تو رفتہ رفتہ اردو کے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں لیکن ایثار اور جدوجہد کے بغیر کامیابی کے خواب دیکھنا محض خوش خیالی ہوگی کیوں کہ تعلیمی اداروں میں اردو زبان کی تدریس کے لیے سخت جدوجہد کی ضرورت ہے۔پرائمری اور ثانوی سطح پر اردو بحیثیت ایک مضمون پڑھنے اور پڑھانے کی کوشش دور حاضر میں جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔کیوں کہ جس سطح پر اور جن شرائط کے ساتھ ہمیں اردو کے فروغ کے لیے سہولتیں دینے کا اعلان کیا جاتا ہے وہیں سے دشواریاں بھی حائل کی جاتی ہیں لہذا ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جہاں جہاں اور جس سطح پر حکومت نے اردو کو فروغ دینے کا

اعلان کیا ہے وہیں سے ان احکامات پر عمل آوری کو بھی یقینی بنائیں۔

ان تمام مسائل سے اردو کا ہر طالب علم واقف اور باخبر ہے کچھ ناصحان مشفق بڑے مدبرانہ انداز میں یہ کہہ دیتے ہیں اب ان گھروں سے اردو کا چلن اٹھ گیا ہے جہاں اردو چھم چھم کرتی ہوئی کمروں سے دالان اور آنگن تک نظر آتی تھی۔بجا طور کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ زبانیں حکومت کی سرپرستی میں نہیں پھلتی پھولتیں انہیں عوامی تائید چاہیے۔گھر میں اردو پڑھنے پر کس نے پابندی لگائی ہے؟ اب پیار بھری لوریاں ماں اردو میں کیوں نہیں سناتی؟

یہ سب درست۔مگر سب میں نیم صداقت ہے۔تعلیمی سطح پر اردو کا رواج گجرال اور سچر کمیٹی کی سفارشات پر مکمل طور سے عمل آوری کی صورت میں ممکن ہے۔پوری بحث کے بجائے صرف ایک فقرہ عرض کرتا ہوں۔سہ لسانی فارمولہ نافذ کیجیے' رویہ بدلیے' بورڈ اور تختیوں کو حقیر نہ سمجھیے جس دن نیوز چینلوں کی سرخیاں اردو میں آنے لگیں گی بورڈ اور تختیوں پر اردو آنے لگے گی تو کسی کو کوئی شکوہ نہ رہ جائے گا اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مذکورہ بالا کمیٹیوں کی سفارشات پر عمل ہو لہٰذا ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ جہاں جہاں اور جس سطح پر حکومت نے اردو کو فروغ دینے کا اعلان کیا ہے وہاں وہاں ان احکامات پر عمل آوری میں حائل رکاوٹوں کو دور کریں۔

راقم اردو کا طالب علم بھی ہے اور خادم بھی۔چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں خدمت گزار ہے اسی لیے جو کچھ ہو رہا ہے اسے حرف آخر نہیں سمجھتا۔ ۱۹۹۸ء میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام کے بعد سے اردو ذریعہ تعلیم کے

ساتھ اعلیٰ تعلیم بالخصوص پیشہ ورانہ اور عصری تعلیم کے جو نئے امکانات اور افق نظر آ رہے ہیں وہ انتہائی حوصلہ افزا ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی جو کل ہند دائرہ اختیار کی حامل مرکزی یونیورسٹی ہے اپنے منشور کے عین مطابق اردو ذریعہ تعلیم کے توسط سے اعلیٰ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی فراہمی اور تعلیم نسواں پر روایتی اور فاصلاتی دونوں طریقوں سے چلائے جانے والے اپنے منفرد تعلیمی پروگراموں کے ذریعہ اردو کے فروغ میں جٹی ہوئی ہے۔ آج بالخصوص اردو فاصلاتی تعلیم نے بڑی حد تک فضا بدلی ہے میرے اپنے اندازے کے مطابق پاکستان کو چھوڑ کر ہندوستان میں فاصلاتی نظام تعلیم کے لیے بارہ اوپن یونیورسیٹیاں ہیں ۔اسلام آباد میں صرف علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں تقریباً گیارہ سو کورسیس اردو میڈیم کے ذریعہ پڑھائے جا رہے ہیں۔

آخری سطور میں اس بات کا اعادہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس زبان کو ہندوستان کی سوندھی اور سانولی تہذیب سے وابستہ رکھنا ہے تو پھر اس بین الاقوامی زبان کو اس کی بین الاقوامیت کے ساتھ ہندوستانی بھی رہنے دیجیے۔ یہاں اس کے لیے وسیع تر افق کی تلاش ناگزیر ہے سہ لسانی فارمولہ' اردو میڈیم اسکول' کالجس اور یونیورسٹیاں اور ایک ایسے افق کی تعمیر جس پر تعصب اور نفرتوں کے بادل نہ ہوں' سیاسی مصلحت اندیشیوں سے اس محبت کی زبان کو گہن نہ لگ سکے۔ آیئے تعمیری اور مثبت انداز میں کوشش کریں کہ یہ زبان صحیح تلفظ اور درست قواعد کے اپنے حسن بیان کے ساتھ جگمگائے اور ہم فخر سے کہہ سکیں

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسمان ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

☆☆☆

عالمی اُردو کانفرنس جدّہ

ڈاکٹر سید تقی عابدی (ٹورنٹو کینڈا)

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدرآباد اور قونصل خانہ ہند جدّہ کے اشتراک سے منعقد کی گئی دوروزہ عالمی اُردو کانفرنس پر لکھی گئی رپورٹیں اور کیے گئے تبصروں کو پڑھ کر قلم اُٹھانے کی ضرورت اس لیے بھی محسوس ہوئی کہ اس عمدہ معیاری کانفرنس کے اہم نکات پر گفتگو بہت ہی سطحی ہوئی اور تشنگی باقی رہ گئی۔ پوری کانفرنس کی روئیداد اُس وقت مستند ہوگی جب لکھنے والا نہ صرف کانوں سے سُنا ہو بلکہ آنکھوں سے دیکھا بھی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ ذہن کی بیداری سے اہم نکات کے مثبت اور منفی زاویوں کو جذب کر کے بغیر کسی شخصی تعصب کے اُسی طرح پیش کرے جس طرح انھیں پیش کیا گیا ہو۔

اُردو کی نئی بستیوں میں ابھرتی ہوئی نئی اُردو بستی جو اُردو بولنے والے ملکوں میں پانچویں یا چھٹے نمبر پر ہے سعودی عرب ہے۔ اس ملک کے خوبصورت شہر جدّہ میں دوروزہ عالمی اُردو کانفرنس ۶/اور ۷/جون کو انٹرنیشنل انڈین اسکول کے آڈیٹوریم میں منعقد کی گئی

جس میں اُردو زبان کے عصری مسائل، فروغ تعلیم، رسم الخط، جدید انفارمیشن ٹکنالوجی، میڈیا اور تازہ رجحانات پر اظہار خیال کیا گیا۔ اس کانفرنس کی انعقاد کا سہرا مولانا آزاد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اے۔ ایم پٹھان ، پرو وائس چانسلر پروفیسر کے۔ آر۔ اقبال احمد کے ساتھ قونصل جنرل آف انڈیا۔ جدّہ ڈاکٹر اوصاف سعید کے سر ہے جنھوں نے دنیا بھر سے اُردو کے عظیم مشاہیر شخصیات کو کانفرنس کے اسٹیج پر جمع کیا جن میں نیویارک سے پدم شری پروفیسر گوپی چند نارنگ، بھارت سے وائس چیرمین قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان جناب چندر بھان خیالؔ، ایڈیٹر سیاست جناب زاہد علی خان، چیرمین نیشنل کمیٹی مائنارٹیز محترم ظفر علی نقوی، کینڈا سے ڈاکٹر سید تقی عابدی، انگلینڈ سے ڈاکٹر ضیا الدین شکیب، قطر سے جناب حسن عبدالکریم چوگلے، دمام سے جناب نعیم جاوید، ریاض سے محترمہ عذرا نقوی، کے علاوہ مولانا آزاد یونیورسٹی سے منسلکہ اساتذہ جن میں پروفیسر عبدالوہاب قیصر، پروفیسر ریحانہ سلطانہ، پروفیسر ظفر الدین، ڈاکٹر شجاعت علی راشد، ڈاکٹر نجم السحر ، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر احسن، ڈاکٹر ضیاء، ڈاکٹر نکہت جہاں اور دیگر مقالہ نگاران بھی شامل تھے۔

عالمی اُردو کانفرنس جدّہ میں افتتاحی اور اختتامی تقریب کے درمیان چار اجلاس برگزار ہوئے۔ ہر اجلاس میں کلیدی خطبہ، خطبۂ صدارت کے علاوہ تین یا چار مقالہ نگاروں نے پرمغز مقالات پیش کیے، اگرچہ وقت کی کمی کے باعث زیادہ تر مقالہ نگاران صرف مقالات کے اقتباسات پیش کر سکے چناں چہ ان اجلاسوں کے کنوینر ڈاکٹر شجاعت علی راشد اور پروفیسر ظفر الدین نے سامعین کو بتایا کہ تمام مقالات بہت جلد کتابی

شکل میں پیش کیے جائیں گے۔

کانفرنس کا افتتاحی جلسہ جمعہ ۶/ جون ۵ بجے شام شروع ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر پٹھان نے کی۔ تقریب کے مہمانِ خصوصی پروفیسر نارنگ تھے۔ افتتاحی جلسہ انڈین اسکول کی طالبات کے خیر مقدمی گیت سے ہوا جس کی ناظم ڈاکٹر قمر سلطانہ تھیں۔ سب سے پہلے پرووائس چانسلر پروفیسر اقبال احمد نے مولانا آزاد یونیورسٹی کی کارکردگی کا ذکر کرتے ہوئے بتلایا کہ اس یونیورسٹی میں جسے قائم ہوئے دس سال کا قلیل عرصہ ہوا ہے ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ طالبِ علم کئی کارآمد اور روزگار سے جڑے ہوئے کورسس میں مشغول تحصیل ہیں۔ یونیورسٹی پروفیسر پٹھان کی سرپرستی اور اعلیٰ عمل کاری کی وجہ سے بھارت کی عظیم یونیورسٹی میں شمار کی جارہی ہے جس میں حکومت ہند کا مکمل تعاون شامل ہے۔ پروفیسر ایس۔ اے وہاب نظامت فاصلاتی تعلیم مولانا آزاد یونیورسٹی نے یونیورسٹی کے پروگراموں، نصابی اور تعلیمی کاوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے عالمی کانفرنس جدّہ کی کارکردگی اور مختلف اجلاسوں کی نشست و برخاست کے متعلق تفصیل سے سامعین کو واقف کروایا۔ ڈاکٹر اوصاف سعید قونصل جنرل ہند جدّہ جن کی کوششوں سے پہلی کانفرنس سعودی عرب میں منعقد ہوئی اپنی اُردو دوستی اور پرستاری میں شہرت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اوصاف نہ صرف ہر سال جدّہ اور ریاض میں عالمی مشاعرے کرواتے رہے بلکہ مختلف ادبی سازمانوں اور انجمنوں سے بھی بھرپور تعاون کرتے رہے چناں چہ اسی لیے اُردو اکیڈیمی جدّہ کے سرپرست اور روحِ رواں جناب سید جمال قادری نے اس سال بھی ایک خوبصورت آزاد سوونیر 2008 عالمی اُردو کانفرنس کے نام سے شائع

کیا جس کی ڈاکٹر اوصاف سعید کے ہاتھوں رسمِ اجرائی عمل میں آئی۔ اس سوونیر میں اُردو اور انگریزی میں عمدہ مقالات، مہمانوں کے تعارف، کانفرنس کے پروگرامس کے علاوہ دیدہ زیب تصاویر شامل ہیں۔

ڈاکٹر اوصاف سعید نے اختتامی اجلاس سے اپنے خطاب میں اپنی خاندانی اور ذاتی اُردو وابستگی اور محبت کا ذکر کیا۔ آپ کے والد مرحوم کے افسانہ کے مجموعہ کی رونمائی بھی اس عالمی کانفرنس میں اس خاندان کی ادبی خدمت کا ثبوت تھا ڈاکٹر اوصاف سعید نے اُردو کے مستقبل اور اس کے فروغ کے سلسلہ میں شبانہ روز بے لوث کام کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے بتایا کہ جدّہ کی عالمی اُردو کانفرنس خود اُردو کے مستقبل کی ضمانت کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر اوصاف نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے پروفیسر پٹھان اور ان کے اراکین کی کوششوں کی ستائش کی۔ انھوں نے اُردو ادب کے عظیم ادیب و نقاد پروفیسر گوپی چند کی جدّہ میں موجودگی کو اُردو پرستاروں کے لیے خوش نصیبی بتایا۔ ڈاکٹر اوصاف سعید نے اُردو کی ترویج، تشہیر اور تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ٹکنالوجی کو ضروری اور لازم قرار دیا۔

مشہور شاعر جناب چندر بھان خیالؔ جو وائس چیرمین کونسل برائے فروغ اُردو زبان بھی ہیں۔ اپنے سحر انگیز خطاب میں اس بات کی تاکید کی کہ بھارت میں اُردو کے فروغ اور تحفظ کے لیے ہر ممکنہ قدم اُٹھایا جارہا ہے حکومت کی نیّت صاف ہے اور وہ اُردو کی ترقی کی خواہاں ہے۔ خیالؔ صاحب نے کہا اُردو زبان پر کسی فرقہ کا حق نہیں بلکہ ہر مذہب و ملّت کا باشندہ اس کے پرستاروں میں شامل ہے۔ یہاں یہ تذکرہ بھی ضروری

ہے کہ کونسلیٹ آف انڈیا کی جانب سے ترتیب دیے گئے دو عالمی مشاعرے جو جدّہ میں اور ریاض میں اس عالمی کانفرنس کے ساتھ ساتھ ہوئے جس میں بیس (20) سے زیادہ شعرا نے شرکت کی اس کے خصوصی مہمان بھی چندر بھان خیالؔ تھے جنھیں سامعین نے پسند کیا۔ چندر بھان خیالؔ نے اُردو رسم الخط کے کم ہونے پر تشویش کا اظہار کیا لیکن اس بات کا یقین دلوایا کہ اُردو پھیل رہی ہے اور جدّہ کانفرنس اس کا زندہ ثبوت ہے۔ خیالؔ صاحب نے اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے اپنا ہی شعر پڑھا۔

ہم ہند وہو ں کہ مسلم ہوں کہ عیسائی ہوں
ہم کوئی بھی ہوں مگر ایک زباں ہے اُردو
اس حقیقت سے بھلا کون مُکر سکتا ہے
رشتہ او ر اخوت کا نشاں ہے اُردو

محترم ظفر علی نقوی چیرمین مائناریٹیز ایجوکیشن کمیٹی نے جو اس عالمی اُردو کانفرنس میں شرکت کے لیے دہلی سے تشریف لائے تھے اُردو تعلیم کو روزگار سے جوڑنے کے مسائل پر گفتگو کی۔ موصوف نے موجودہ حالات میں اُردو کی ترقی کے لیے جدید ٹکنالوجی اور انفارمیشن کے ساتھ ساتھ روزگار کے مواقع فراہم کرنے کی مثبت کوششوں کا ذکر کیا اور حکومتِ ہند کے تعاون کا اطمینان دلوایا۔

افتتاحی اجلاس کے خصوصی خطاب میں ممتاز ادیب و نقاد اور ماہر لسانیات پدم بھوشن پروفیسر گوپی چند نارنگ شامل تھے۔ گزشتہ پانچ سال میں پروفیسر نارنگ کی صدارت اور سرپرستی میں عالمی اُردو کانفرنس نیویارک، نیوجرسی، ٹورانٹو، لندن اور شکاگو

میں منعقد کی گئی تھیں اس کے علاوہ موصوف مہمان خصوصی کی حیثیت سے روزنامہ سیاست کی عالمی اُردو کانفرنس خود مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کی پہلی عالمی کانفرنس، اور پاکستان کی کئی اُردو کانفرنسوں میں شرکت کر رہے ہیں اُردو زبان کی حمایت اور اس کی شبانہ روز ترقی کے لیے مسلسل جدوجہد میں مصروف ہیں۔ موصوف کی اُردو ادبیات، تنقید اور لسانیات و ساختیات پر ساٹھ سے زیادہ کتابیں اس دعویٰ کا زندہ ثبوت ہیں کہ اگرچہ ان کی مادری زبان اُردو نہیں سرائیکی ہے لیکن ان کو اُردو سے اپنی ماں کی طرح محبت ہے۔

پروفیسر نارنگ کی معجز بیانی اور قادرالکلامی کے سب معترف ہیں۔ زبان و ادب کے بڑے دقیق اور عظیم مسائل معمولی اور شگفتہ جملوں میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ہر چھوٹا بڑا محظوظ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نارنگ کی شریعت ادب میں مایوسی حرام ہے وہ اُردو کے مستقبل سے مایوس نہیں چناں چہ اس کانفرنس میں بھی انھوں نے بتایا اُردو زندہ زبان ہے اُردو پھیل رہی ہے اُردو نے ہر دور کی مشکلات کا سامنا کیا ہے اور آج اُردو نہ صرف بھارت اور پاکستان بلکہ مشرق وسطیٰ، یورپ اور شمالی امریکہ میں تیزی سے اپنا مقام بنا رہی ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اس کانفرنس میں تین مرتبہ خطاب کیا جن میں مقالات پر اظہار خیال، مقررین کی گفتگو پر تبصرہ، مولانا آزاد اور جدّہ کونسلیٹ کے عہدیداروں کی کوششوں اور زحمتوں کا اعتراف شامل تھا۔ پروفیسر نارنگ نے بہت صحیح کہا کہ عالمی کانفرنس میں مقررین کی گفتگو سے بڑھ کر نوجوان مقالہ نگاروں کی تجاویز اور تحقیقی مطالب موثر تھے۔ یہ بھی سچ ہے کہ مقررین کی طولانی گفتگو نے ان نوجوان مقالہ نگاروں

کے جائز وقت کو ہضم کر ڈالا چناں چہ وہ صرف اقتباسات پیش کر سکے۔ اُردو زبان کی تاریخ کا پس منظر اور اُردو کے سفر پر خسروؔ سے اقبالؔ تک کا اثر، صوفیا اور بھگتی کے شاعروں اور ادیبوں کا اُردو سے تعلق اور برصغیر کی محلّی زبانوں اور بولیوں سے اُردو کے میل جول کو اُردو ادب کا یہ عظیم خطیب اور ادیب اس طرح اپنی سحر انگیز گفتگو میں پرو رہا تھا کہ بقول میر انیسؔ

ع۔ جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

ڈاکٹر نارنگ نے بتایا کہ پروفیسر پٹھان اگر چہ سائنسداں ہیں لیکن عمدہ تجربہ کار ایڈمنسٹریٹر ہیں جن کی فکری بالیدگی نے مختصر سے عرصے میں آزاد یونیورسٹی کو چار چاند لگا دیئے۔ مدیر سیاست جناب زاہد علی خان کی اُردو خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اُردو کے سچّے خدمت گزاروں اور بے مثال صحافیوں میں شامل کیا۔

ڈاکٹر نارنگ نے قونصل جنرل اوصاف سعید کی ذاتی اور خاندانی اُردو پرستاری کا ذکر کرتے ہوئے ان کے وجود کو اُردو زبان کے لیے ایک نیک شگون بتایا۔ دلچسپ بات یہ بھی تھی کہ پروفیسر نارنگ کے ہر خطبہ میں مطالب بیان اور انداز بیان نے بیان کے لبادہ کو اتنا خوش رنگ کر دیا کہ تقریر کشت زعفران بن گئی تھی۔ ہاں سچ ہے یہ علم ہے جو بولتا ہے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارتی تقریر میں پروفیسر پٹھان نے یونیورسٹی کی عملی کار کردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ اُردو زبان کا اہم مسئلہ اس کو روزگار سے جوڑنا ہے۔ اُردو ذریعہ تعلیم میں مایوسی یا تشویش جو گزشتہ کئی دہائیوں کی سہل انگاری کا نتیجہ تھی اب دور ہوتی جارہی ہے۔ اب اُردو تعلیم یافتہ افراد کو روزگار کے مواقع نسبتاً بہتر میسّر ہیں

چناں چہ مولانا آزاد یونیورسٹی اردو میں بہت سے ایسے کورسس شامل کر رہی ہے جس سے ملازمت اور کام حاصل کرنے میں سہولت ہو۔

افتتاحی جلسہ کے بعد کانفرنس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت لندن سے تشریف لائے ہوئے مہمان اُردو فارسی ادب کے محقق اور ماہر آثارِ قدیمہ ومخطوطات ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے کی۔ کینیڈا کے شاعر ادیب ومحقق ڈاکٹر تقی عابدی نے کلیدی خطبہ دیا اور کہا آج سے سو سال قبل اُردو ترقی بورڈ بنایا گیا اور آج اُردو تحفظ بورڈ کی ضرورت لاحق ہے۔ اُردو کسی فرقہ یا قوم کی میراث نہیں یہ حُسنِ یوسف ہے جسے بازارِ مصر میں پیش ہونا ہے۔ وہ اُردو جو دکن میں پیدا ہوئی شمال مغربی ہند میں گھٹنوں چلی دلّی میں جوان ہوئی، لکھنو میں دلہن بنی جس کا میکہ اُردوئے معلّیٰ رہا جس کی نسل اُردوئے محلّہ میں پھیل گئی وہ اُردو جو پنجابی کی بہن کہلائی وہی اُردو جب جوان ہوئی تو فارسی نے اپنی سوکن جانا دربار میں آنے کی اجازت نہ دی بازار میں رہی عوام کی خدمت گزار بنی لیکن چوں کہ شگفتہ تھی چنچل تھی جوان تھی اپنے الفاظ کی دولت سے دُربار تھی آخر دربار پہنچ گئی شاہ عالم اس کے عاشق ہوئے شاہ ظفر اس کی زلفوں کے اسیر ہوئے اِسی اُردو کو گل کرسٹ نے مسیحیت سکھائی، چکبستؔ نے رامائن پڑھائی اور انیسؔ نے کلمہ پڑھایا۔ ڈاکٹر عابدی نے اس عالمی کانفرنس میں دو بار گفتگو کی اور دونوں بار اُردو رسم الخط کی حفاظت پر زور دیا۔ اُردو رسم الخط اُردو کا چہرہ ہے اُردو جسم پر اس کی چمڑی ہے اُردو کی آن بان اور پہچان ہے اس کی حفاظت اُردو کی زندگی کے لیے از حد ضروری ہے جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔ اُس کو دوسری اسکرپٹ میں لکھا جا سکتا ہے ترجمہ کیا جا سکتا ہے لیکن رسم ا

لخط کی حفاظت اور اس کی مقبولیت کے لیے جدید ٹکنالوجی کے وسائل فراہم کرنا بھی ضروری ہے۔ مقالہ نویسوں میں ڈاکٹر وسیم احمد صدیقی نے موجودہ اُردو تعلیم اور صورت حال پر عمدہ گفتگو کی اور عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مختلف طریقوں میں تبدیلی پر زور دیا۔ محترمہ سمیرہ عزیز نے اُردو طریقہء تعلیم کو بہتر اور جدید بنانے پر کئی کارآمد تجاویز اور کئی مشکلات اور مسائل کے حل کو بڑی عمدگی اور تحقیق سے پیش کیا جسے بہت سراہا گیا۔

دمام سے آئے ہوئے اُردو کے ادیب جناب نعیم جاوید نے عصری مسائل، اُردو طریقہء تعلیم اور جدید انفارمیشن ٹکنالوجی پر محققانہ مطالب پیش کیے۔ عصری تقاضوں کو تجربات اور جدید تحولات سے حل کرنے کا راستہ دکھایا۔ آپ نے مختصر سے وقت میں مفید مطالب پیش کیے۔ جناب علیم خان فلکی نے وقت کا لحاظ کرتے ہوئے صرف مقالے کے مفید اور اہم نکات پیش کیے۔ آپ نے تحقیقی عناصر سے مرصع ظرافت زبان سے مزین تعلیمی مسائل، جدید طریقہ کار اور تجربات سے مملو گفتگو کر کے محفل کو خوشگوار بنا دیا۔ آخری مقالہ نگار پروفیسر محمد ظفر الدین نے ایک سیر حاصل تحقیقی مقالہ ترجمہ اور اُردو عصری تقاضے پر پیش کیا۔ موصوف کا مقالہ وقت کی کمی کے باعث صرف عمدہ اقتباسات تک محدود رہا جس کو یونیورسٹی کتابی شکل دے گی تا کہ اس دقیق عرق ریزی سے لکھے گئے مقالہ جس میں ہر زاویہ اور جدید انفارمیشن ٹکنالوجی سے استفادہ کیا گیا ہے سے آگاہی ہو سکے۔ پروفیسر محمد ظفر الدین کا مقالہ ترجمہ پر سنگ تمام کی حیثیت رکھتا ہے۔ خطبۂ صدارت سے قبل ڈاکٹر عابدی نے مقالوں پر مختصر گفتگو کی اور پھر ڈاکٹر ضیا الدین شکیب نے خطبہء صدارت میں اجلاس کے پھیلے ہوئے موضوعات کو اپنی شیریں بصیرت افروز

اور معیاری مستند گفتگو سے سمیٹا۔ ڈاکٹر شکیب نے اُردو رسم الخط کی اہمیت اور تحفظ کی حمایت اور ضرورت کو لازم جانتے ہوئے عصری تقاضوں کے پورا کرنے پر بھی زور دیا۔ اُردو کی تشہیر اور تبلیغ میں مقامی رسم الخط ابتدائی مراحل میں کارآمد ہو سکتے ہیں جس سے منزل تک پہنچنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔ دیوناگری اور رومن اُردو رائج الوقت ہیں۔ یہ بھی وقت کی ضرورت ہے جنھیں روکا نہیں جا سکتا لیکن بنیادی طور پر اُردو رسم الخط کو عام کرنا بھی ضروری ہے۔ ڈاکٹر شکیب نے بچوں کی بنیادی تعلیم پر زور دیا۔ موجودہ دور میں بچوں کے ادب پر توجہ نہیں ہو رہی ہے۔ جب کہ اُردو کی ضمانت آئندہ نسل کے ہاتھوں ہی ہوگی۔ ڈاکٹر شکیب نے مقالوں پر اجمالی گفتگو کر کے ان کو اجلاس کے موضوع سے جوڑا اور زبان اور ماحول کے ارتباط کو مضبوط اور محکم بنانے پر زور دیا۔ ڈاکٹر شکیب نے اپنے ادبی اور لسانی تجربوں سے طریقہء تعلیم کو موثر بنانے کی تجاویز بھی پیش کیں۔ ڈاکٹر شکیب کے تجربات جو مشرق اور مغرب کے ماحول سے وابستہ ہیں اساتذہ اور ماہرین تعلیم کے لیے بہت موثر ثابت ہوئے جن سے استفادہ کر کے اُردو ادب کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر نارنگ نے خصوصی طور پر ڈاکٹر شکیب کے تعلیمی تجربات کو کانفرنس کا کامیاب تجربہ قرار دیا۔ اس پہلے اجلاس کی نظامت مولانا آزاد یونیورسٹی کے مرکز برائے اُردو زبان، ادب و ثقافت کے ڈپٹی ڈائریکٹر و انچارج ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے کی جو خود ایک عمدہ ادیب محقق اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ڈاکٹر شجاعت کی نظامت کا کمال یہ ہے کہ وہ دھیمے لہجے میں مختصر الفاظ کا سہارا لے کر عمدہ مطالب بیان کر دیتے ہیں۔

عالمی کانفرنس کا دوسرا اجلاس رات کے نو بجے پدم بھوشن گوپی چند نارنگ کی

صدارت میں شروع ہوا جس کی نظامت پروفیسر محمد ظفر الدین نے کی۔ اس اجلاس میں دو کلیدی خطبے جناب زاہد علی خان ایڈیٹر روز نامہ سیاست اور مائناریٹی کمیشن کے چیرمین جناب ظفر علی نقوی نے دیئے۔ محترم زاہد علی خان نے اُردو زبان کے عصری مسائل، اُردو تعلیم کے رجحانات، اُردو ذخائر کا تحفظ اُردو صحافت اور اُردو رسم الخط پر مفصل گفتگو کی اور اپنے گراں قدر مشوروں سے سامعین کو آگاہ کیا جو ان کی اُردو خدمت اور اُردو صحافت کے تجربوں کا نتیجہ تھا۔ جدید ٹکنالوجی اور اُردو صحافت پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ سو سے زیادہ ممالک میں روز نامہ سیاست ویب سائٹ پر روزانہ پڑھا جاتا ہے جس میں امریکہ کے بعد سعودی عرب کا نمبر ہے۔ اگر چہ اُردو کے ساتھ انصاف ابھی بھی پوری طرح سے نہیں کیا جارہا ہے لیکن پھر بھی اُردو پھیل رہی ہے۔

کیوں کہ اُردو ایک توانا زبان ہے جس کو ہر مذہب وملت کے شخص کی حمایت ہے چناں چہ اُردو ٹی وی چینل کے ڈائرکٹر راموجی راؤ اس اُردو چینل کو نقصان برداشت کرتے ہوئے بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ زاہد علی خان نے قطر اور کویت میں بھی عالمی اُردو کانفرنس منعقد کرنے کی ضرورت اور اس کانفرنس میں ان کے تعاون کا ذکر کیا تا کہ ہر ممکنہ طریقہ سے اُردو کی ترویج کی جاس کے اور اُردو تعلیم کا بول بالا ہو۔ جناب ظفر علی نقوی نے جدّہ میں منعقدہ کانفرنس کو سراہاتے ہوئے اُردو تعلیم کے لیے ہر ممکنہ اقدام اور روزگار کے مواقع فراہم کروانے کی کوششوں کا اعتراف کیا۔ انھوں نے بھارت سے باہر نئی اُردو کی بستیوں میں اُردو کی نشو ونما کو مثبت قدم بتایا جس سے ان ارتباطی مراکز کے اُردو والوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ راقم نے اُردو کی کئی عالمی اور مقامی کانفرنسوں میں شرکت

کرنے کے بعد ہی ان کانفرنسوں کی عملی کارکردگی کا اچھا خاصہ تجربہ حاصل کیا ہے۔

چناں چہ اس پس منظر میں راقم نے مقالہ نویسوں کے مقالات کے چیدہ چیدہ مطالب اور اقتباسات سُن کر یہ محسوس کیا کہ مولانا آزاد یونیورسٹی نے عمدہ انتخاب کیا اور مقالہ نویسوں نے عرق ریزی اور دقیق تحقیقی اور منطقی روش سے موضوعات پر اظہار خیال کیا۔ اگر چہ وقت کی کمی اور موضوعات کی بوقلمونی نے میدانِ فکر وخیال کو بیکراں کر دیا تھا لیکن پھر بھی ہر شخص اپنی اپنی فکری صلاحیت سے بہرہ مند ہو رہا تھا۔ ہمارے خیال میں مقررین کی تقریروں کو کم اور مقالہ نگاروں کو زیادہ وقت دیا جائے تو کانفرنس کا حاصل اور عمدہ ہوسکتا ہے بہر حال دوسرے اجلاس میں کلیدی خطبات کے بعد پانچ مقالے پیش کیے گئے جن پر تفصیلی گفتگو اس تحریر میں ممکن نہیں لیکن مولانا آزاد یونیورسٹی اِسے کتابی شکل میں پیش کر رہی ہے جس سے مطالب اور متن سے آگاہی ہوسکتی ہے۔ جناب سراج وہاب نے اُردو ادب اور صحافت کے رشتوں پر عالمانہ اظہار کیا، اُردو کی صحافت کی تاریخ اور صحافت کے مقاصد جس سے اُن کی اُردو محبت اور خدمت ظاہر تھی۔ مہتاب قدر نے جو ''آواز'' ویکلی کے ایڈیٹر بھی ہیں، اپنے خاص انداز میں اُردو کی ترویج اور تشہیر کے ساتھ ساتھ اُردو صحافت کی تاریخ، اس کے کامیاب سفر اور موجودہ اخبارات، ریڈیو سروس اور ویب سائیٹ کا ذکر کیا جو مقامی سامعین کے علاوہ مہمانوں کے لیے ضروری معلومات تھیں یقیناً مہتاب قدر کے مقالے سے جو معلومات اور حقائق منظرِ عام پر آئے اُس سے اُردو کی نئی بستیوں کو ایک دوسرے سے آشنائی اور ارتباطی مراحل میں مدد ملے گی۔ تیسرے مقالہ نگار جناب معصوم مرادآبادی جو کسی تعارف کے محتاج نہیں اس کانفرنس میں

شرکت کے لیے خاص طور پر دہلی سے آئے تھے۔ان کا عالمانہ اور سادہ شگفتہ لہجہ جو اُردو میڈیا کے تجربات کی چاشنی سے لبریز تھا ان کے مطالب اور مباحث سے عیاں تھا۔ موصوف اُردو دنیا میں پھیلی ہوئی کم احساسی کی لعنت کو دور کرنے کے لیے اُردو کو روزگار سے جوڑنے اور احساس خودی کو اجاگر کرنے میں جو کوشیش ہو رہی ہیں اُس کا ذکر مستند حوالوں سے پیش کر رہے تھے۔میڈیا سے وابستگی اور موجودہ ٹکنالوجی کے دور میں صحافت کا رول ان کے مقالے کا نچوڑ تھا جس میں وہ صحافت کو اُردو خدمت میں تنقید و تحقیق سے گراں قدر ثابت کر رہے تھے۔ ڈاکٹر امام اعظم جو دربھنگہ بہار سے نکلنے والے رسالہ ''تمثیل نو'' کے ایڈیٹر ہیں وہ آزاد یونیورسٹی کے مقامی چاپٹر کے ڈائرکٹر بھی ہیں صاف اور دوٹوک لہجہ میں اُردو کی حمایت کرتے ہوئے گھریلو، سماجی اور حکومتی ذمہ داریوں کو واضح کر رہے تھے۔موصوف نے سچ کہا کہ سب سے بڑی ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے کہ وہ بچوں کی اُردو تعلیم پر توجہ دیں۔اُردو مدارس میں تحریری تقریری مقابلے اور مناظرے ہوں۔اُردو ادب کو دنیا کے دوسرے ادبوں سے جوڑا جائے اور اس علٰحدگی کو دور کیا جائے۔حکومت کو چاہیے کہ ملک کے قوانین کا احترام کرتے ہوئے اُردو زبان کے ساتھ انصاف کرے اور اس کا حق اسے ملے تاکہ اُردو پھولے پھلے اور یہ فضاء ملک کے لیے سازگار بھی ہوگی۔ترجمے اور بچوں کا ادب اُردو میں عام کیا جائے۔مقالہ نگاروں کی فہرست کے آخری مقرر ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے جو پروفیسر ظفر الدین کے ساتھ کئی اجلاس کے کنوینر بھی رہے ہیں اپنے مدلل مطالب، موثر تحقیقی نکات کو مختصر سے وقت میں پیش کر کے ذہنوں میں کئی جدید سوالات اُبھارے جس میں ہندوستان اور نئی بستیوں میں

اُردو کی ترقی اور تعلیم کا محققانہ تجزیہ شامل تھا۔اُردو کے مسائل اس کے فروغ اور اشاعت میں میڈیا کا رول اور اُردو تہذیب کی قدریں موصوف کا محور گفتگو تھا۔ڈاکٹر شجاعت نے کہا کہ اُردو کسی فرقے یا قوم کی میراث نہیں اِس میں ہر رنگ و روپ ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل ہیں۔وہ اپنے خاص منفرد اور مفکرانہ طریقہ پر زبان اُردو، تہذیب اور لسانی اقدار کی معاشرے سے وابستگی اور اس کا مثبت نتیجہ پیش کر رہے تھے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس علم دوست جوان نے عالمی کانفرنس میں تازگی کے ساتھ ساتھ توانائی بخشی۔ اس سیشن کی نظامت پروفیسر ظفر الدین نے کی وقت کی کمی مطالب کی فراوانی اور اُردو احباب کی ناز برداری ان کی نظامت کو اور بھی مشکل بنا دیتی تھی کیوں کہ بقول انیسؔ ۔

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اس سیشن کے صدارتی خطبہ میں پروفیسر نارنگ نے وقت کی محدودیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اجمالی طور پر مقالوں پر تبصرہ کیا اور زاہد علی خاں کی ادبی، اور صحافی خدمات کا اعتراف کیا۔ہر زبان کے مسائل ہوتے ہیں اور جب دریا تیزی سے بہتا ہے تو خس و خاشاک بھی ساتھ لاتا ہے لیکن اس کی تہہ میں صدف اور موتی بھی رہتے ہیں اُردو ایک زندہ زبان ہے اور اس میں نئے نئے الفاظ کا اضافہ ضروری ہے جو اس کی زندگی کا ثبوت ہے۔

عالمی اُردو کانفرنس کا تیسرا اجلاس ۱۷/ جون پانچ بجے شام پروفیسر کے آر اقبال احمد کی صدارت میں شروع ہوا جس کا کلیدی خطبہ قطر سے آئے ہوئے مہمان جناب حسن

عبدالکریم چوگلے نے دیا۔اس اجلاس کے موضوعات ''کیا اُردو ایک موثر ذریعہء تعلیم بن سکتی ہے''؟ اور ''مڈل ایسٹ کے اسکولوں میں اُردو کی تعلیم'' تھے۔راقم اپنی مصروفیت کی بناء پر اس اجلاس کے بعض تقاریر اور مقالوں سے محروم رہا لیکن سامعین سے پوچھنے پر تقاریر کا نچوڑ حاصل ہوا بہر حال یہ تمام مقالات اور تقاریر شائع ہو کر پیش کی جائیں گی۔
محترم چوگلے نے اپنے تجربے اور اُردو وابستگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ تر اپنے تجربات اور ارشادات کو مڈل ایسٹ کے اسکولوں اور اُردو ذریعہء تعلیم پر پیش کیا جسے بہت پسند کیا گیا۔ پروفیسر عبدالوہاب قیصر جو خود ایک تجربہ کار کہنہ مشق استاد ہیں اُردو ذریعہء تعلیم کو موثر بنانے اور اس کو جدید عصری تقاضوں سے روشناس کرنے کے علاوہ روزگار سے جوڑنے کے مسائل پر مدلل گفتگو کر رہے تھے۔اگر چہ پروفیسر عبدالوہاب سائنس اور ادب کی مشترکہ اقدار پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں لیکن ان کے تعلیمی تجربات اُردو تعلیم کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔اساتذہ میں ڈاکٹر نجم السحر ، ڈاکٹر نکہت جہاں کا مقالہ اور شہر ریاض سے تشریف لائی ہوئی ادیبہ و شاعرہ محترمہ عذرا نقوی نے بھی مڈل ایسٹ میں خصوصی طور پر سعودی عرب، اُردو کی دوسری نئی بستیوں میں اُردو ذریعہء تعلیم اور اُردو کے تحفظ و ترقی پر گفتگو کی۔مقالہ نگاروں نے حوالوں اور تجربوں سے بھرپور خیالات بیان کر کے مفید تجاویز اور مشورے دیے جن پر عمل کر کے یقیناً اُردو کی نئی بستیوں خصوصاً مڈل ایسٹ میں اُردو کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ جناب حسام الاسلام محمد صدیقی جو ''جدید مرکز'' ہفت روزہ کے مشہور و معروف صحافی ہیں بتایا کہ موجودہ حکومت اُردو کی ترقی کی خواہاں ہے چناں چہ گذشتہ چند سالوں میں اُردو کو جو ترقی بھارت میں ہوئی ہے اس کا زندہ ثبوت

ہے۔ انھوں نے منسٹر ارجن سنگھ کے اس پیغام کو بھی سامعین تک پہنچایا کہ بہت جلد مولانا ابوالکلام آزاد کے یومِ پیدائش کو ''یوم تعلیم'' قرار دیا جائے گا۔اُردو رسم الخط کی ضرورت اور اس کی حفاظت پر اتفاق کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ان کے ہفتہ وار ہندی اسکرپٹ اُردو رسم الخط میں شائع ہوتے ہیں اور اس سے اُردو کے مطالب زیادہ تعداد میں عوام تک پہنچتے ہیں۔موصوف نے اُردو یونیورسٹی کے اشتراک سے ایک ایسی ہی کانفرنس کی پاکستان میں انعقاد کی ضرورت پر زور دیا۔

کانفرنس کا چوتھا اجلاس مشہور شاعر و ادیب پروفیسر شمیم حنفی اور پروفیسر بشیر احمد خان پرو وائس چانسلر اگنو کی صدرات میں ہوا جس میں جدید اُردو ادب کے ابھرتے ہوئے رجحانات اور معاشرے میں اُردو زبان کے رول کا جائزہ اور تجاویز پر غور و خوص کیا گیا اس اجلاس کی نظامت پروفیسر محمد ظفر الدین نے کی،اور اس میں ڈاکٹر قاضی ضیاء اللہ نے عمدگی کے ساتھ اُردو ادب کو زندگی سے جوڑا اور اُردو کی ترقی اور انحطاط کو اُردو ملت کی ترقی اور زوال سے مقابلہ کر کے جدید رجحانات اور معاشرے اور سماج کے رول کو پیش کیا۔انہوں نے کہا کہ ادب میں شعر کے حوالے کے بغیر کوئی بات مکمل نہیں ہوتی۔جدّہ اُردو اکیڈیمی کے چیرمین سید جمال قادری نے اپنے مقالے میں گراں قدر مطالب اور تجاویز پیش کیے۔موصوف نے بتایا کہ اُردو کی تعلیم گھر سے شروع ہونی چاہیے طالب علموں کو جدید ٹکنالوجی سے روشناس کرانا چاہیے۔جدید سافٹ ویر ''اردو سیکھیں'' جلد ہی دستیاب ہوگا جس سے اُردو کی بنیادی تعلیم کو تقویت حاصل ہوگی۔سعودی عرب میں اُردو پھیل رہی ہے اور عرب طلباء جو ہندوستان پاکستان سے پڑھ کر واپس ہوتے ہیں وہ

اُردو میں بات چیت کررہے ہیں اُردو زبان کی جدید نسل کو تعلیم دینا ہمارے لیے حیاتی مسئلہ ہے اگنو کے پرووائس چانسلر ڈاکٹر بشیر احمد خان نے اس کانفرنس کو سرزمین مقدس پر ایک نیک شگون بتایا۔ انہوں نے حرمین شرفین میں لکھے ہوئے اُردو سائن بورڈس کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ یہاں حاجیوں کے علاوہ بڑی تعداد اُردو سے واقف ہے جو اُردو کی ترقی کی ضامن ہے۔ اس اجلاس کا خطبہء صدارت پروفیسر شمیم حنفی نے دیا ان کا خطبہ موضوعات اجلاس پر حرف آخر تھا۔ ان کے ادبی عالمانہ لہجہ میں شعر و ادب کا شگفتہ امتزاج تھا۔ موصوف نے مثالوں سے یہ واضح کیا کہ آج کل ہندوستان میں اُردو ہندی بھی پڑھائی جارہی ہے۔ اُردو زبان کے تمام راستے اور دروازے دوسری زبانوں کے لیے کھلے ہیں۔ اُردو ایک توانا اور علمی زبان ہے جو عظیم شعری و ادبی اقدار لیے ہوئے ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی کی گفتگو پر اجلاس ختم ہوا اور آخری جلسہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر نارنگ نے کی اور اسٹیج پر پروفیسر کے۔ آر اقبال احمد، ڈاکٹر شکیب، ڈاکٹر سید تقی عابدی اور ڈاکٹر بشیر احمد خان موجود تھے۔ راقم کو اسی وقت ایرپورٹ پہنچنا تھا اس لیے اجلاس کے شروع میں گفتگو کر کے ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوا۔

☆☆☆

اختتامی اجلاس کے بعد پروفیسر اے۔ ایم۔ پٹھان کے ہاتھوں طالبات کو انعامات کی پیش کشی۔ ڈاکٹر اوصاف سعید جناب سلطان مظہر الدین اور دوسرے دیکھے جاسکتے ہیں

ڈاکٹر وسیم احمد صدیقی پروفیسر اے۔ ایم۔ پٹھان کے ہاتھوں اعزاز حاصل کرتے ہوئے

جدہ میں منعقدہ مشرق وسطیٰ کی پہلی ۲ روزہ ''عالمی کانفرنس''

سید جمال اللہ قادری

صدر اردو اکیڈیمی جدہ، جدہ سعودی عرب

اردو زبان اپنے پرَ اقطاع عالم میں تیزی سے پھیلا رہی ہے لیکن اردو داں لوگوں کے گھروں میں کمزور ہوتی جارہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار قونصل جنرل ہند عزت مآب ڈاکٹر اوصاف سعید نے جدہ میں منعقدہ دو روزہ عالمی کانفرنس کا افتتاح کرنے کے بعد اپنے افتتاحی خطاب میں کیا۔ انٹرنیشنل انڈین اسکول جدہ کے وسیع و عریض خوبصورت آڈیٹوریم میں منعقدہ اس عظیم الشان کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہوئے اردو کی عظیم اور نامور شخصیات کی موجودگی سے استفادہ کے لیے جدہ میں مقیم ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے علاوہ عرب ممالک کے کثیر تعداد میں لوگ دیکھے گئے ۔ ہندوستانی مدرسہ کی کمسن طالبات نے مہمانوں کا استقبال مدرسے کا ترانہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر پروفیسر کے۔ آر۔ اقبال احمد نے یونیورسٹی کی سرگرمیوں اور اردو زبان

کے فروغ واشاعت میں کیے جانے والے مختلف اشغال وکارہائے نمایاں کا تفصیلی جائزہ لیا۔ انھوں نے مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کی جانب سے قونصل جنرل ہند ڈاکٹر اوصاف سعید کی ستائش کی اور جدہ میں یونیورسٹی کا فاصلاتی امتحانی مرکز قائم کرنے پر داد تحسین پیش کی اور کہا کہ بیرون ملک یہ اپنی نوعیت کا پہلا امتحانی مرکز ہے۔ انہوں نے کہا کہ مقدس سرزمین حجاز پر عالمی اردو کانفرنس کے کامیاب انعقاد کا سہرا بھی ڈاکٹر اوصاف سعید کو جاتا ہے جن کی رہبری میں یہ کانفرنس ہورہی ہے۔ ڈائرکٹریٹ فاصلاتی تعلیم مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے ملحق پروفیسر ایس اے وہاب قیصر نے کانفرنس کے بارے میں حاضرین کو واقف کرواتے ہوئے بتایا کہ یہ کانفرنس اردو کی بقاء کے لیے، اور یہ تجزیہ کرنے کے لیے کہ ہم کہاں ٹھہرے ہیں اور اردو کی ملک میں اور باہر کیا صورت حال ہے جاننے کے لیے منعقد کی گئی ہے۔ کیوں کہ مولانا آزاد یونیورسٹی کا اولین مطمح نظر فروغِ اردو ہی ہے عزت مآب ڈاکٹر اوصاف سعید نے کہا کہ مجھے آج مملکت سعودی عرب کی ہی نہیں بلکہ کہ مشرق وسطیٰ کی پہلی عالمی اردو کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے بے حد مسرت ہورہی ہے۔ انہوں نے پروفیسر اے ایم پٹھان کو اور خلیج کے سارے اردو داں حضرات کو مبارک باد پیش کی کہ ایسی عظیم کانفرنس یہاں منعقد کی جارہی ہے جو اس سے پہلے کبھی بھی مڈل ایسٹ میں نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ اردو دنیا میں مقبولیت کی بلندیوں کو چھورہی ہے۔ لیکن جہاں یہ برصغیر سے باہر پھیل رہی ہے وہیں ہمارے گھروں اور اسکولوں میں کمزور پڑتی نظر آرہی ہے۔ انہوں نے اسے جدید ٹکنالوجی کے ذریعہ مربوط کرنے کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر اوصاف سعید نے تالیوں کی گونج میں کہا کہ اس کانفرنس

سے جو تجاویز آئیں گی اس سے اردو کے بارے میں جو معلومات ساری دنیا میں پھیلیں گی اس میں جدہ کو مرکزیت حاصل رہے گی۔ اور جدہ ایک ایسا اردو کا شہر بن کر ابھرے گا کہ یہاں سے جو ''آواز'' اردو کے لیے نکلے گی وہ ساری دنیا میں سنی جائے گی۔ انہوں نے اپنے خطاب کو اس شعر پر ختم کیا کہ

شاہین کی طرح سے پرواز دیکھنا
پہنچے گی دور دور تک آواز دیکھنا

اس کے بعد ظفر علی نقوی، چیرمین مینارٹیز ایجوکیشن کمیٹی نے مخاطب کیا۔ انہوں نے کہا کہ قونصل جنرل ہند اوصاف سعید نے اس کانفرنس کے انعقاد میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اور یہ کانفرنس پورے عالم اردو میں تہلکہ مچادے گی۔ چندر بھان خیال، وائس چیرمین قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کہا کہ آج اردو ہندوستان سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل رہی ہے مگر اس کے ساتھ ایک مشکل یہ ہے کہ اس کی اسکرپٹ سمیٹی جارہی ہے۔ انہوں نے ہندوستان میں اور باہر بھی اردو کے اسکرپٹ کے تحفظ کے لیے سرگرم ہونے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ حکومت ہند کی نیت اردو کے سلسلہ میں بالکل واضح ہے۔ وزیر فروغ برائے انسانی وسائل ارجن سنگھ کا پیغام ہے کہ اردو زبان کی تعمیر وترقی کے لیے، فروغ اور بقاء کے لیے اس کے تحفظ کے لیے کسی قسم کی روکاوٹ نہیں آنے دی جائے گی۔ انہوں نے اس شعر پر اپنی تقریر ختم کی کہ

ہم ہندو ہوں کہ مسلم ہوں کہ عیسائی ہوں
کوئی بھی ہوں مگر ایک زباں ہے اردو
اس حقیقت سے بھلا کون مکر سکتا ہے

رشتہ اور اخوت کا نشاں ہے اردو

پروفیسر محمد ظفر الدین جو تقریب کے ناظم بھی تھے نے نیویارک سے تشریف لائے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ ،ممتاز ادیب،نقاد ماہر لسانیات کو خطاب سے نوازنے کی دعوت دی۔انہوں نے کہا کہ میں تمام زبانوں کا احترام کرتا ہوں۔ ہر مادری زبان اپنی جگہ بہت اہم ہوتی ہے۔اور وہ ہمارے خون میں رچی بسی ہوتی ہے۔لیکن اردو زبان بادنسیم اور بادصبا کی طرح آر پار چلتی ہے اور سب کے دل و جاں کو معطر کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ زبان سب کو کچھ نہ کچھ دیتی ہے۔انہوں نے کہا کہ ہندی، ہندی کا لفظ نہیں ہے بلکہ یہ فارسی کا لفظ ہے۔اس کے بعد پروفیسر اے ایم پٹھان نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اکثر یہ پوچھا جاتا ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم سے کس طرح روزگار ملے گا۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ اب بہت سے طلبہ جو اردو سے ایم بی اے وغیرہ کر کے نکلے ہیں انہیں روزگار مل رہا ہے۔ خاص طور سے خواتین کو ٹیچر ایجوکیشن کے محکموں وغیرہ میں بہتر ملازمتیں مل رہی ہیں۔انہوں نے اپنے تمام ساتھیوں کے تعاون کی تعریف کی جن کی وجہ سے یونیورسٹی نے گذشتہ چار برسوں میں نمایاں ترقی کی۔ اجلاس کے اختتام پر ڈاکٹر سہیل اعجاز خان قونصل جج و پریس وانفارمیشن نے تمام مہمانوں،اسپانسرز اور شرکاء کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔اس موقع پر قونصل جنرل ہند عزت مآب ڈاکٹر اوصاف سعید نے اردو اکیڈمی جدہ کی جانب سے شائع شدہ ''عالمی اردو کانفرنس نمبر'' آزاد سوونیر کی رسم اجراء فرمائی۔

افتتاحی اجلاس کے بعد کانفرنس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔جس کی صدارت

ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب، ریسرچ اسکالر(اردو و فارسی) ماہر آثار قدیمہ (لندن) نے کی۔ جب کہ اردو کی ۳۲ معروف کتابوں کے مصنف ڈاکٹر سید تقی علی عابدی (کینڈا) نے کلیدی خطبہ دیا۔مقالہ نگاروں میں محترمہ سمیرہ عزیز، ایڈیٹر سعودی گزٹ ونگران ہفت روزہ ''آواز'' (سعودی عرب جدہ) ڈاکٹر وسیم احمد صدیقی، علیم خاں فلکی، نعیم جاوید اور پروفیسر محمد ظفر الدین نے مندرجہ ذیل موضوعات پر اپنے مقالات سامعین کے نذر کیے۔

☆اردو طریقۂ تعلیم کو بہتر اور جدید بنانے کے لیے تجاویز

☆اردو رسم الخط اور جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی ،اردو ڈاٹا بیس کی تشکیل اور اردو پروگراموں کو بہتر بنانے کے مسئلہ پر غور اور تجاویز۔

اس اجلاس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے انجام دیئے۔

عالمی اردو کانفرنس جدہ کے دوسرے اجلاس کا موضوع ہندوستان اور اس سے باہر اردو زبان کی ترقی اور تعلیم کا جائزہ/ ہندوستان اور اس سے باہر اردو کے فروغ اور اشاعت میں میڈیا کا رول تھا۔ابتداء ہندوستان سے تشریف لائے ہوئے سیاست کے ایڈیٹر جناب زاہد علی خان نے اپنے کلیدی خطبے سے کی۔انہوں نے کہا کہ اردو کا استعمال ہندو پاک کے علاوہ سارے جہاں میں ہو رہا ہے۔اردو پڑھنے والے 107 ممالک میں موجود ہیں۔سعودی عرب میں محبان اردو کی تعداد ۱۰ لاکھ سے کم نہیں ہے۔اردو کے ساتھ جو ظلم ہو رہا ہے اگر کوئی اور زبان ہوتی تو اس کا نام ونشان کب کا ختم ہو جاتا مگر اردو میں اتنا دم ہے کہ آج تک یہ زبان قائم ودائم ہے۔سب سے زیادہ اردو ویب سائٹ پڑھے جانے والے ممالک میں سب سے پہلا نام امریکہ اور دوسرا نام سعودی عرب کا

ہے۔میرے ایک دوست جوامریکی فوج میں جنرل ہیں نے مجھے بتایا کہ ہماری ٹریننگ کے دوران اردوسکھانے کے لیے اردوسافٹ ویئر کا استعمال کیا جاتا ہے کیوں کہ اکثر فوجیوں کو جہاں بھیجا جاتا ہے وہاں اردولکھی یا بولی جاتی ہے۔اگر ہندوستان میں اردو کے ساتھ ناانصافی ہورہی ہےتو ساری دنیا میں ہی اردو کے ساتھ ناانصافی ہورہی ہے۔اردو کسی بھی زبان کی اسکرپٹ میں لکھی جاسکتی ہے۔قونصل جنرل ڈاکٹر اوصاف سعیداگر آج اردو کی ترقی کے لیے سرگرم ہیں اور ایسی محفلیں سجارہے ہیں،اگرکل ان کا تبادلہ ہوجائے تو کیا پتہ پھرایسی محفلیں سجیں یا نہ سجیں۔اردو کی ترقی کے لیے زیادہ تر کام غیر مسلموں نے کیا ہے جس میں ETV کے چیئرمین راموجی راؤ کا بھی ہاتھ ہے۔میڈیا میں کئی چینل ایسے ہیں جواردو میں حروف اور گنتی سکھاتے ہیں۔یہ ضروری نہیں کہ بس ہم اردو پر ہی عبور حاصل کریں،ساتھ ہی ساتھ ہمیں دوسری زبانوں پر بھی عبور حاصل کرنا چاہیے۔صحافتی اداراہ اردو کی ترقی میں ایک خاص کردارادا کرتا ہے۔صحافت میں آسان اردواستعمال کی جاتی ہے جسے اخبار کے قارئین با آسانی سمجھ سکیں۔شمالی ہند کی اردواور جنوبی ہند کی اردو میں کافی الفاظ مختلف ہیں سیاست میں بھی روزانہ کا اردومواد جمع ہوتا ہے اسے دوبارہ سے آسان اردو میں ترجمہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔اردو کی ترقی کے لیے جب ہم سب مل کر کام کریں گےتو تاریخ بتائے گی کے اردو کب سے زندہ و پائندہ ہے۔

جناب سراج وہاب نے اپنے مقالہ میں کہا کہ انگریزی زبان میں خدمات ادا کرنے کے باوجود میرا اردو زبان سے تعلق محبت کا ہے۔صحافت ادب کا ایک حصہ ہے

اوراردوادب زندگی کا آئینہ دار ہے۔کسی زبان کی ترقی کے لیے ادب برابر کا رشتے دار ہے۔اردو کوئی پرانی زبان نہیں، یہ انگریزوں کے زمانے سے فارسی کے ساتھ ساتھ استعمال ہورہی ہے۔اردوتقریباً ۳۰۰ سال پرانی زبان ہے۔اردوصحافت کا وجوداس کے بعد ہوا۔سب سے پہلا اردواخبار کلکتہ سے جاری ہوا۔اسی طرح اردوصحافت کو جمعہ جمعہ آٹھ روز ہوئے۔اردو کے چند بڑے ادیب صحافیوں میں شمار ہوتے ہیں صحافت کو سلطنت کا چوتھا حصہ کہا جاتا ہے۔اخبار کا ایک مقصد عام آدمی کے جذبات اوراحساسات کو سمجھنااوران کوظاہر کرنا ہے۔ دوسرا مقصدعوام میں ایسے جذبات ابھارنا ہے جن کی قوم وملت کوضرورت ہو۔تیسرا مقصد زندگی کی کمزوریوں اورضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔اردوکو ایک مقام تک پہنچانے میں سب سے بڑا ہاتھ صحافت اور اخبارات کا ہے۔ جناب مہتاب قدر نے اپنے مقالے میں اردو زبان کی صحافت میں بڑھتی ہوئی مقبولیت کا تفصیل سے احاطہ کیا۔

معصوم مرادآبادی دوردرشن چینل کے ایڈوائزری بورڈ میں سکریٹری ہیں اور دہلی سے تشریف لائے۔انہوں نے اپنے مقالے میں کہا کہ یہ صحافت کا ہنر ہے کہ کم لفظوں میں زیادہ بات لکھ سکتے ہیں۔اردو زبان کوترقی دینے میں تعلیم کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔پچھلے ہی مہینے مدرسے کے ایک طالب علم نے اردو زبان میں IAS کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی ہے۔اردوصحافت نے اردو کے فروغ میں جتنا کردارادا کیا ہے اتنا اردوادب نے اردوتنقید نے یا اردوتحقیق نے ادانہیں کیا۔

ڈاکٹر امام اعظم نے اپنے مقالے میں کہا کہ زندگی کے بے شمار تقاضے ہیں اور

ہر تقاضے کے مطابق مسائل ہیں۔اردو بحیثیت زبان کتنا ساتھ دے سکتی ہے، کتنا ساتھ دے رہی ہے، کتنا ساتھ دے گی اور کب جا کر ہمارا ساتھ چھوڑ دے گی یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔حکومت زبان کی ترقی میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے مگر اردو کے ساتھ حکومت کا رویہ سوتیلے پن کا رہا ہے۔ دفتروں میں اردو مترجم سے دوسرے کام لیے جاتے ہیں کیوں کہ ان کے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں۔ والدین اور طلباء اردو میڈیم کو قابل نہیں سمجھتے۔ جرائد میں بچوں کے لیے اردو ادب کی شمولیت ہوتی ہے مگر بہت کم۔اگر اس زمانے میں بچے دوسری زبانوں کی طرف مائل ہوگئے تو اردو زبان کا مستقبل کیسا ہوگا۔میڈیا اور صحافت کی بدولت اردو زبان کا جادو پاک و ہند سے باہر بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ہمیں اردو کی ترقی کے لیے بچوں پر توجہ دینی ہوگی۔اسکولوں میں اردو زبان میں تحریری اور تقریری مقابلے ہونے چاہئیں۔ہمیں اردو زبان کی تعلیم پہلے اپنے گھر سے شروع کرنی ہوگی اور پھر اس طرح ایک تحریک چلے گی۔اگر ہم اپنی زبان کو ہی بھول جائیں گے تو ہماری زبان دم توڑ جائے گی۔

ڈاکٹر محمد احسن نے اپنے مقالے میں کہا کہ اردو تعلیم کی کمی کی وجہ حکومت ہے۔ کسی زبان کے مستقبل کا دارومدار اس کے بولنے والوں پر ہے۔پرائمری مڈل اور ہائی اسکول میں اردو تعلیم کو ضروری بنانے کے لیے پالیسی بنانا ضروری ہے۔ ہند کے نئے آئین کے مطابق حکومت پر فرض ہے کہ جب بچہ ۱۴ سال کا ہو جائے تو اسے مادری زبان پڑھائی جائے۔اس کے علاوہ ہر شہر ہر دیہات میں اردو میڈیم اسکول کھولے جائیں۔ اردو تعلیم کی لڑائی ایک قوم کی لڑائی نہیں بلکہ یہ اردو زبان کی بقاء کی لڑائی ہے۔

ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے اپنے مقالے میں کہا کہ جس طرح ایک گونگے انسان کی زبان عذاب بن جاتی ہے اسی طرح اگر ایک معاشرے کی زبان مر جائے تو وہ معاشرہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔لفظ ہی زبان کی بقاء کا حصہ ہیں۔اردو زبان کی اپنی ایک تہذیب ہے۔اردو نے ہمیشہ مستقبل کے لیے راہیں ہموار کی ہیں۔طویل عرصے تک اردو کو لشکری زبان بھی کہا گیا ہے۔اردو کسی فرقے کی جاگیر نہیں ہے۔اردو قومی وحدت کا نشان ہے۔تدریس اور تعلیم اردو زبان کا ایک اہم مسئلہ ہے اور اگر اس پر قابو پا لیا جائے تو اردو کی ترقی کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ایک دن آئے گا جب ہم پھر سے کہیں گے کہ

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

پروفیسر ریحانہ سلطانہ نامعلوم وجوہات کی بناء پر تشریف نہیں لائیں مگر انہوں نے اپنا مقالہ منتظمین کو پہنچا دیا تھا۔

اس اجلاس کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی اور انہوں نے اختتامی کلمات میں کہا کہ وقت کی کمی کے باعث ہر مقالے کو مختصر کر دیا گیا تھا مگر مکمل مقالے کتاب میں شائع کیے جائیں گے۔اگر ان مقالوں پر غور کیا جائے تو اس کانفرنس سے بہت بڑا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔اس اجلاس میں نوجوانوں کے مقالوں کا پلڑا بھاری رہا ہے۔ہمیں اپنی زبان پر ایمان لانے کی ضرورت ہے۔ اردو زندہ زبان ہے اور زندہ زبان کے مسائل تو پیدا ہوں گے ہی۔اردو زبان ایک بہتے دریا کی طرح ہے، جب دریا کا پانی بہتا ہے تو اس میں مٹی اور کنکر بھی شامل ہو جاتے ہیں۔آکسفورڈ ڈکشنری کا نیا ایڈیشن ہر پانچ سال بعد شائع ہوتا ہے جس میں ہمیشہ انگریزی کے نئے لفظوں کا اضافہ کیا جاتا ہے یہی

وجہ ہے کہ یہ زبان زندہ ہے۔ پاکستان میں تقریباً ۸ کروڑ لوگ اردو لکھتے بولتے ہیں۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ آپ ایک زبان کے سہارے زندگی گزاریں، کامیابی حاصل کرنے کے لیے دوسری زبانوں پر بھی عبور حاصل کرنا چاہیے۔

اس طرح ۶ جون کا یہ دوسرا اجلاس اپنے اختتام کو پہنچا اور حاضرین کو دعوت دی گئی کہ وہ معزز مہمانوں کے ساتھ کھانے میں شریک ہوں۔

اس کے بعد کا اجلاس ہفتہ کے دن شام پانچ بجے پروفیسر کے۔ آر اقبال احمد، پرووائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (ہند) اور پروفیسر بشیر احمد خان پرووائس چانسلر (اگنو) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ چیرمین انجمن محبان اردو ہند (قطر) حسن عبدالکریم چوگلے نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ جب کہ مقالہ پیش کرنے والوں نے ''کیا اردو ایک موثر ذریعہ تعلیم بن سکتی ہے'' اور ''مڈل ایسٹ کے اسکولوں میں اردو کی تعلیم'' کے موضوع پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں ڈاکٹر قمر سلطانہ ،ڈاکٹر نکہت جہاں، محترمہ عذرا نقوی، ڈاکٹر نجم السحر اور پروفیسر سید عبدالوہاب شامل تھے ۔نظامت کے فرائض ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے انجام دیئے۔

چوتھے اجلاس کا موضوع جدید اردو ادب کے ابھرتے ہوئے رجحانات اور کسی بھی معاشرے میں اردو زبان کے رول کا جائزہ اور تجاویز تھا۔ اجلاس کی ابتداء ڈاکٹر قاضی ضیاء اللہ نے اپنے مقالے سے کی۔ انہوں نے کہا کہ شعر کے حوالے کے بغیر کوئی بات مکمل نہیں ہوتی۔ انہوں نے اپنے خیالات اشعار کے ذریعے پیش کیے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ادب کو زندگی کا ترجمان کہا گیا ہے۔ کسی قوم پر زوال اس قوم کی زبان کا

انحطاط ہوگا۔ اردو زبان اور اردو ادب نے ہر دور میں اپنا تشخص برقرار رکھا ہے۔ ایک خیال سے اردو زبان و اردو ادب اسلامی اقتدار کا ترجمان بن گیا ہے۔ یہ اردو زبان و ادب پر ایک طرح کی تہمت ہے۔

سید جمال قادری جدہ اردو اکیڈمی کے صدر ہیں۔ انہوں نے اپنے مقالے میں کہا کہ اس کانفرنس کے ذریعہ اردو کے فروغ کا یہ سفر اب اس پاک سرزمین سعودی عرب سے بھی شروع ہونے جارہا ہے۔ یہاں سے جو بھی تحریکیں شروع ہوئیں وہ ہمیشہ کامیاب ہوئی ہیں۔ اردو زبان قومی وحدت کا ایک نمونہ ہے۔ اس کے خمیر میں ہندوستانی اور غیر ہندوستانی عناصر کا اثر ہے۔ موجودہ دور میں ایک معاشرہ انٹرنیٹ کا ہے۔ انٹرنیٹ کے اس معاشرے میں اردو نے ابھی کافی ترقی کرنی ہے۔ اردو کی کئی ویب سائٹس موجود ہیں مگر وہ انفرادی طور پر بنائی گئی ہیں۔ حکومت نے آج تک اس طرف غور نہیں کیا۔ اردو کوئی معمولی یا حقیر زبان نہیں ہے۔ نوجوان معاشرے سے ہماری امیدیں جڑی ہیں کہ وہ اپنی مادری زبان اردو کے فروغ کے لیے صحیح رول ادا کریں گے۔ عوام اگر چاہے تو اردو عام ہوسکتی ہے اور جب اردو عام ہوجائے گی اور جگہ جگہ نظر آنے لگے گی تو حکومت بھی اردو استعمال کرنے پر مجبور ہوجائے گی۔ ایک بڑا طبقہ اپنے بچوں سے انگریزی میں بات کرتا ہے اور اسی وجہ سے بچوں کا رجحان اردو سے ہٹتا جارہا ہے عرب ممالک میں گزشتہ ۵۰ سالوں سے اردو غیر معمولی طور پر مقبول ہوتی جارہی ہے۔ آج کل عرب طالب علم پڑھنے کی غرض سے پاک و ہند کا بھی رخ کرتے ہیں اور جب وہ تعلیم حاصل کرکے واپس آتے ہیں تو اردو زبان میں ماہر ہوتے ہیں۔ اکثر انگلش میڈیم میں پڑھنے والے بچے اپنی ہی

زبان بھول جاتے ہیں۔ کمپنیاں اردو زبان میں تعلیمی مواد بناتی تو ہیں مگر صرف سنجیدگی سے اردو کو چاہنے والے انہیں خریدتے یا حاصل کرتے ہیں۔ ہندوستان کی ملٹی میڈیا سافٹ ویئر کمپنی بہت جلد ''آؤ اردو سیکھیں'' کے نام سے ایک ملٹی میڈیا پروگرام بھی بنا رہی ہے جو بہت جلد مارکٹ میں دستیاب ہوگا۔ اس پروگرام کے ذریعہ آسانی سے اردو سیکھی جا سکے گی۔ آخر میں کہنا چاہوں گا کہ اگر قونصلیٹ ادبی تنظیوں کا ساتھ دیتی رہے تو یہاں اردو بہت مقبول زبان بن سکتی ہے۔

مجلس کے پہلے صدر جناب حسام الاسلام محمد صدیقی جدید مرکز ہفت روزہ کے ایڈیٹر ہیں۔ انہوں نے اپنا خطاب شروع کرنے سے پہلے بتایا کہ تین سال پہلے سعودی عرب میں جب ارجن سنگھ آئے تھے تو اُن سے مولانا کے یوم میلاد کا دن بطور یوم تعلیم منانے کی جو درخواست کی گئی تھی، میرے سعودی عرب آنے سے پہلے مجھے پیغام دیا گیا ہے کہ یہ درخواست عمل پیرا ہے اور عنقریب لاگو کر دی جائے گی۔ خطاب شروع کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میں اس بات سے بالکل اتفاق نہیں کرتا کہ مدرسے نہ ہوتے تو اردو نہ بچتی۔ جنوبی ہند ہو یا شمالی ہند ہر جگہ دین کی کتابوں کا کئی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ قرآن کی تفسیر بھی کئی ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کر کے مدرسوں میں پڑھائی جا رہی ہے۔ پچھلے دس سالوں سے ہندوستان میں اردو زبان کو فروغ مل رہا ہے جس کی ایک کڑی الیکٹرونک میڈیا ہے۔ چینلز اور اخبارات اردو کی ترقی کا ایک حصہ ہیں۔ یہ بات غلط ہے کہ اردو ختم ہو رہی ہے۔ یہ بس ایک افواہ ہے۔ اردو کے ادب نگاروں کو گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کسی زبان کا رسم الخط ہونا ضروری ہے۔ اردو

زبان کا نقصان کہیں نہیں ہو رہا ہے۔ پچھلے زمانے میں ماں باپ کہتے تھے کہ بیٹا اچھا اچھا پڑھ کر آنا، تمہیں پڑھ لکھ کر اچھا انسان بننا ہے۔ آج کی ماں کہتی ہے کہ بیٹا جاؤ پڑھنے جاؤ تمہیں MBA کر کے پیسے کمانے ہیں، شاید یہ بھی ایک وجہ ہے کہ زبانوں کی قدر نہیں رہی۔ میں آخر میں پٹھان صاحب کو کہنا چاہوں گا کہ ایسی ایک کانفرنس پاکستان میں بھی ہونی چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ اردو کتابوں کا ایک میلہ بھی منعقد کرنا چاہیے۔

مجلس صدارت کے دوسرے صدر پروفیسر شمیم حنفی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ اردو زبان ہمیشہ ہمارے لیے ایک دریچہ رہی ہے۔ میرے لیے اردو کا مسئلہ سیاسی مسئلہ نہیں تہذیبی مسئلہ ہے۔ اردو ہمارا ماضی، حال اور مستقبل ہے۔ ہندوستان میں آج کل ہندی بھی اردو کے ذریعہ پڑھائی جاتی ہے۔ اردو ایک عجب زبان ہے۔ اردو زبان نے اپنے دروازے کسی بھی دوسری زبان کے لیے کبھی بھی بند نہیں کیے۔ اردو کے کئی لفظ دوسری زبان کے لفظوں سے بنے ہیں۔ اردو ایک علمی زبان ہے اور اپنے معاشرے کا حق ادا کر رہی ہے۔

پروفیسر شمیم حنفی کے خطاب کے بعد انٹرنیشنل اردو کانفرنس کا چوتھا اجلاس اپنے اختتام کو پہنچا۔ آخری اجلاس میں اردو داں حضرات کے علاوہ طلباء کی کثیر تعداد کی موجودگی سے آڈیٹوریم پورا بھر چکا تھا۔

دوروزہ عالمی اردو کانفرنس کے اختتامی اجلاس کی ابتداء اردو ادب کے معروف مصنف اور ماہر امراض قلب ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اس کانفرنس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میں صحت کا طبیب اور ادب کا مریض ہوں۔ سچائی یہ

ہے کہ اردو زبان کو مسائل دو چار ہیں۔ اردو اس وقت ترقی کی منزل پر نہیں تشہیر کی منزل پر ہے۔ اردو زندہ ہے زندہ رہے گی اور ہر زندہ چیز کے مسائل بھی ہوں گے۔ ہمیں ابھی سے سوچنا پڑے گا کہ ہماری زبان کو کیا مسائل ہو سکتے ہیں یا ہونے والے ہیں اور ان کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ یہ کانفرنس اسی کی ایک کڑی ہے۔ اردو لفظوں کا ایک دربار ہے۔ اردو ہماری مادری زبان ہے اس لیے اس کا تحفظ ہمارا فرض ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ لوگ اردو زبان کا من اور دھن سے تحفظ کر رہے ہیں۔ میں آخر میں یہی کہنا چاہوں گا کہ اردو کی ترقی میں جوانوں کی ضرورت ہے اور ان کا کردار بہت اہمیت رکھتا ہے۔

چندر بھان خیال نے اپنے خطاب میں کہا کہ اس کانفرنس میں دو روز سے لگاتار اردو کے مسائل پر بات ہو رہی ہے۔ یہ ایک فرقے کے زبان نہیں یہ پوری دنیا کی زبان ہے کیوں کہ اس کا ہر زبان میں بول بالا ہے۔ اگر اردو زبان کسی دوسری زبان کی اسکرپٹ میں لکھی جا رہی ہے تو ہمیں اس کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے، اس سے اردو کو ہی فیض پہنچے گا اور اردو بڑھے گی۔ ان دو دنوں میں اردو کے جو مسائل ہمارے سامنے آئے ہیں ہمیں ان پر غور کر کے انہیں سنجیدگی سے لینا پڑے گا۔

اردو فارسی کے ریسرچ اسکالر اور ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب نے اپنے خطاب میں کہا کہ جب دلوں میں اردو کے لیے لگن اور محبت ہوگی تو اردو بڑھے گی۔ ۲۰ مقررین نے اپنے مقالے پیش کیے جن میں اکثریت نوجوانوں کی تھی۔ کئی مقالوں میں اردو کے مسائل ایک ہی تھے۔ کئی مسئلوں پر متضاد خیالات بھی آئے۔ کانفرنس کا موضوع زبان تھا مگر زیادہ گفتگو ادب پر ہوئی۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جس

کی سرزمین قوم کے دل ہیں دنیا میں جہاں جہاں محبّ اردو گئے وہاں اردو کی ترقی ہوئی۔ اس زبان میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ کسی ایک مقام کی محتاج نہیں، یہ ہمیشہ سے سفر کر رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ زمانے کی ضروریات کو بھی پورا کر رہی ہے۔

اگنو یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب بشیر احمد خان نے اپنے خطاب میں کہا کہ یہاں پر اردو زبان کے لیے اتنے لوگوں کا جمع ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ زبان فروغ پائے گی۔ اس عظیم مقدس سرزمین کا تعلق اردو سے بہت گہرا ہے۔ میں نے حرمین شریفین میں دیکھا کہ جگہ جگہ سائن بورڈ پر انگریزی، عربی اور اردو میں تحریر درج تھی۔ یہ سعودی عرب میں اردو کی ترقی کی نشانی ہے۔ اردو ہمارے لیے ایک ورثہ ہے۔ میری ایک تجویز ہے کہ اردو کو سائنس اور ٹکنالوجی میں بھی شامل ہونا چاہیے اور اردو زبان میں سافٹ ویر کا اضافہ ہونا چاہیے۔ یہ سرزمین برکت کی سرزمین ہے اور یہاں سے جو بھی کام شروع کیا جائے اس میں برکت ہی ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اس کانفرنس کے ذریعے کئی لوگوں کو عمرہ کی سعادت حاصل ہوگئی۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے خطاب میں کہا کہ زبان و ادب کے کام ایثار کے کام ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی نفع نقصان نہیں ہوتا۔ اس کانفرنس میں اردو کی ترقی و فروغ کے لیے بہت سی اچھی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ اردو کی ترقی کے لیے سب سے اچھا کردار میڈیا یا اخبارات ہی ادا کر سکتے ہے۔ اس کانفرنس میں مقالہ نگاروں نے اردو تعلیم کے مسائل پر بھی روشنی ڈالی۔ محترمہ عذرا نقوی نے جو تجاویز پیش کیں ان پر غور و عمل کیا جانا چاہیے۔ اردو زبان میں سافٹ ویر کی تیاری پر کام شروع کرنا چاہیے۔

میرے مطابق اردو کا مسئلہ سیاسی بھی ہے، ہندوستان میں اردو زبان کے مسئلے کو سیاسی مسئلہ بنالیا گیا ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اس وقت ۱۱۴ اردو اکیڈمیاں کام کررہی ہیں۔ پچھلے سیشن میں ایک تجویز تھی کہ پاکستان میں اردو کتابوں کا میلہ منعقد کیا جانا چاہیے۔ اس حوالے سے میں بتانا چاہتا ہوں گا کہ ہم نے کچھ ہی سال پہلے پاکستان میں جاکر لاہور میں واقع الحمراء ہال میں کتابوں کی نمائش منعقد کروائی تھی جس میں مختلف اکیڈمیوں سمیت ترقی اردو بورڈ کی اردو زبان میں شائع کتابیں بھی شامل تھیں۔ آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اردو روشن خیالی کی زبان ہے اور یہ زبان فرقہ واریت کا مقابلہ کرتی ہے۔

سیاست اخبار کے ایڈیٹر جناب زاہد علی خان نے اپنے خطاب میں کہا کہ اگر اردو والے اردو رسم الخط میں لکھیں اور ہندی والے اردو کو ہندی رسم الخط میں لکھیں تو یہ زبان مقبول ترین زبان بن سکتی ہے۔ اردو زبان کو انٹرنیشنل زبان کا درجہ ملنا چاہیے۔ ہم زندہ قوم ہیں اور اپنی زبان کی حفاظت کرسکتے ہیں۔ مگر آج بھی یہ حال ہے کہ ہمیں اردو کو آسان بنانے کی ضرورت ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق 107 ممالک میں انگریزی کے بعد اردو پڑھی لکھی اور بولی جاتی ہے۔

اختتامی اجلاس کے صدر پرووائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی پروفیسر کے آر۔ اقبال احمد نے اپنے خطاب میں کہا کہ جن حضرات نے مقالے پیش کیے ہیں انہوں نے اردو زبان کے مسائل کو بھی بخوبی پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے جدہ کو اردو کی بستی قرار دیا ہے۔ جو مقالے پیش کیے گئے ان میں کئی مقالے بہت جلدی

میں لکھے گئے تھے ورنہ کئی اور مسائل بھی سامنے ابھرتے۔ اردو میں انگریزی الفاظ کا استعمال کوئی غلط بات نہیں ہے کیوں کہ اکثر الفاظ کا اردو میں ترجمہ کرنا آسان نہیں ناممکن بھی ہوجاتا ہے۔

ڈائرکٹریٹ فاصلاتی تعلیم مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی پروفیسر ایس اے وہاب قیصر اور وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی پروفیسر اے۔ ایم پٹھان نے معزز مہمانوں، قونصل جنرل ڈاکٹر اوصاف سعید، اجلاس کے صدر، مقالہ نگاروں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اختتام میں انڈین اسکول کے ٹاپر طلباء و طالبات اور اردو کے اساتذہ کو جدہ اردو اکیڈیمی کی جانب سے خوبصورت ایوارڈس سے نوازا گیا جسے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے عطا فرمائے۔

☆☆☆

THE URDU LANGUAGE : NEW HORIZONS

(Urdu Language : Problems and Prospectives)

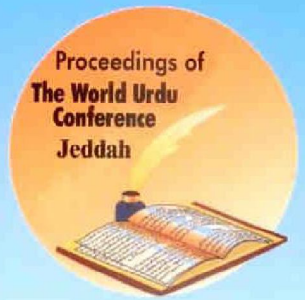

Organised by :

Maulana Azad National Urdu University (MANUU)

Hyderabad, India.

In association with

THE CONSULATE GENERAL OF INDIA, JEDDAH

Published by

Centre For Urdu Language, Literature & Culture, MANUU

Edited by

Dr. Mohd. Shujath Ali Rashed

Dy. Director & I/c, CULLC